بہار آنے تک



فاخرہ جبیں

چاند میرے آنگن میں

تیسری بیل پر بھی وہ سیاہ گیٹ جوں کا توں بند رہا تو چوتھی مرتبہ وہ دانستہ بیل پر سے ہاتھ اٹھانا بھول گیا تھا۔ ڈیڑھ دن کے خوار کر دینے والے سفر کے بعد اگر ایک بندہ اپنی ٹوٹی پھوٹی حالت سمیت گھر کے دروازے پر کھڑا ہو، اور گھر والے اس کی آمد کی اطلاع دیتی گھنٹی پر کان دھرنے کو تیار نہ ہوں تو پھر وہی حربہ اختیار کیا جا سکتا تھا، جو اس نے کیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بیل پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر اپنی دراز قامت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قدرے اچک کر گیٹ کے اس پار دیکھا تھا، جہاں سے ایک محترمہ بھاگتی کم اور لڑھکتی ہوئی زیادہ چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر باآسانی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ گیٹ اب تک کیوں نہیں کھلا۔

''معلوم نہیں محترمہ کب تک یہاں پہنچیں گی۔'' وہ قدرے جھنجھلا کر سیدھا ہوا، تب ہی گیٹ کھلا اور فوراً ہی بارہ من وزنی دھمکی برآمد ہوئی۔

''اگر تم نے فوراً سے پیشتر بیل پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا تو میں گملا اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔''

اور اس نے واقعی فوراً سے پیشتر اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا، کیونکہ ان محترمہ کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر انہیں زیادہ غصہ آ گیا تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے ہی اٹھا کر گملے پر دے ماریں۔

''جی...... مجھے ظہیر نعمان کہتے ہیں۔''

''میری بلا سے تیر کمان کہتے ہوں۔ یہ بتایئے یہاں کس خوشی میں نازل ہوئے ہیں؟''

اس کی بھرپور شائستگی کے جواب میں ایسا سنسناتا تیر پھینکا گیا تھا کہ وہ بس آنکھیں جھپکتا رہ گیا تھا۔

''دیکھئے جی۔ میں کمال صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرے تایا......''

''کیا......؟'' وہ لڑکی ایک دم چیخ پڑی تھی۔ ''آپ ظہیر نعمان ہیں۔ وہی والے نا جو ہمارے

خاندان کے پہلے اور شاید آخری چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے ہیں؟"

"جی...... یہ نادانی مجھ ہی سے سرزد ہوئی ہے۔" اس نے بڑی انکساری سے اپنا جرم تسلیم کر لیا تھا کہ اب کھڑے رہنے کی تاب ختم ہو چلی تھی۔ مگر آفرین ان محترمہ پر، جو اسے اندر بلانے کے بجائے خود اندر کی جانب لڑھک گئی تھیں۔ صد شکر کہ گیٹ کھلا تھا سو وہ طویل سانس لے کر سر جھٹکتا ہوا بیگ اٹھا کر گیٹ پار کر گیا تھا۔

جس طویل روش کے ایک سرے پر وہ کھڑا تھا اس کا اختتام برآمدے کی سیڑھیوں پر ہو رہا تھا۔ جن کے دائیں طرف بنے سنگی ستون کو سبز پتوں سے بھری بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بائیں ستون کے گرد ترتیب سے رکھے گئے گملوں میں سے دو گملے وہ محترمہ یقیناً چند لمحے قبل زمین برد کر کے گئی تھیں۔ وہ ابھی اپنی سمت کا تعین نہیں کر پایا تھا جب برآمدے میں کھلنے والے تین دروازوں میں سے ایک دروازہ کھلا اور قدرے لمبے قد کی لڑکی بھاگتی ہوئی برآمد ہوئی یا پھر برآمد ہونے کے بعد بھاگنا شروع ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ تاہم پریشانی کی بات تو یہ تھی کہ اس کا رخ سیدھا اسی کی جانب تھا۔

"یا اللہ!" وہ ایک دم گڑبڑا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا یہی دل چاہا تھا کہ وہ بھی پلٹے اور اسی رفتار سے بھاگتا ہوا گیٹ سے باہر نکلے اور سیدھا گھر جا کر دم لے، لیکن چونکہ اسے اندازہ تھا کہ دادی اور امی نے اسے واپس اسی رفتار سے بھگا کر یہاں پہنچا دینا ہے اس لیے وہ اپنی جگہ چپکا رہا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی اس سے چند قدم دور آ کر رک گئی تھی۔ دوسرے معنوں میں اسے روکا ہوا سانس بحال کرنے کا موقع دیا تھا۔

"آپ...... آپ ظہیر نعمان ہیں؟" سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد لڑکی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

"جب میں اپنے گھر سے چلا تھا تب تو ظہیر نعمان ہی تھا۔ آپ کے گھر تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے کیا ہو جاؤں گا۔" وہ قدرے چڑ کر بولا تھا۔

"اوہ...... اوہ...... تو پھر آئیے نا۔" آنے والی نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کو اس طرح دبوچا تھا گویا اس کے بھاگ جانے کا خدشہ ہو۔

"وہ میرا بیگ!"

"وہ بھی آ جائے گا۔" لڑکی نے اسے گھسیٹا۔

"لیکن اس کے پاؤں نہیں ہیں۔" اس نے اطلاع دینی چاہی، مگر وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔ سو وہ بھی کسی بے بس بچھڑے کی طرح اس کے پیچھے گھسٹتا چلا گیا۔

"امی! دیکھیے تو کون آیا ہے؟" برآمدہ عبور کر کے وسطی دروازے سے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ چلائی تھی۔ حالانکہ جس انداز سے اس نے ظہیر کو پکڑ رکھا تھا کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ۔

"دیکھیے...... میں کیا لائی ہوں......!"

کمرے میں ایک سے زیادہ افراد کو دیکھ کر ظہیر نے پہلی مرتبہ مزاحمت کرتے ہوئے اپنا بازو اس شیرنی کے نوکیلے پنجوں سے آزاد کرایا اور فوراً ہی تائی اماں کی طرف متوجہ ہو گیا، جو سنگھاڑوں کی پلیٹ سامنے رکھے حیران پریشان سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اور خاتون بیٹھی تھیں، جو چہرے مہرے سے تائی اماں کی بہن ہی لگ رہی تھیں۔ وہ اس اچانک افتاد پر ایسی گھبرائی تھیں کہ ہاتھ میں پکڑا سنگھاڑا منہ میں رکھنا بھول گئی تھیں۔ (منہ البتہ ابھی تک کھلا ہوا تھا)

"امی! یہ ظہیر ہیں۔ چچا سلیمان کے بیٹے۔" اسی لڑکی نے تعارف کا فریضہ بھی نبھایا۔

"ارے...... لو بھئی۔ میں تو پہچان ہی نہیں پائی تھی۔" وہ خوش دلی سے کہتی ہوئے صوفے سے اتر آئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس لڑکی کو آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا اور جب اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ پلٹیں تو لڑکی سنگھاڑوں کی پلیٹ سمیت غائب ہو چکی تھی۔ چھلکے البتہ سینٹرل ٹیبل پر جوں کے توں پڑے تھے (ظاہر ہے ان کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا)

"ماشاء اللہ قد کاٹھ تو بہت اچھا نکالا ہے۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تائی اماں نے ستائشی نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ جبکہ دوسری خاتون بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھیں۔

"سنا ہے بڑی اچھی جگہ ملازم ہو گئے ہو۔ خیر سے کتنی تنخواہ ہو گی۔" وہ ابھی ڈھنگ سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا، جب تائی اماں نے سوال داغ دیا۔

"کچھ زیادہ نہیں تائی اماں! بس یہی بیس، بائیس ہزار۔"

"ہائیں!" تائی کا منہ حیرت سے کھلتا دیکھ کر اسے اپنا منہ بند کرنا پڑا تھا۔ دوسری خاتون بھی چونک گئی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔" تائی اماں نے قدرے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"اے لڑکیو...... کہاں رہ گئیں سب کی سب۔ ارے کوئی چائے پانی تو لے آؤ۔ بچہ کب سے آیا بیٹھا ہے۔" حسب توقع تائی اماں نے پینترا بدلا تھا اور لڑکیوں کو پکارنے لگی تھیں۔

"بینا سے تو تم مل ہی چکے ہو۔ وہی جس کے ساتھ تم ابھی یہاں آئے ہو۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہے وہ۔ اس سے چھوٹا توقیر ہے اور سب سے چھوٹی کامنی ہے۔ اس سے ابھی ملواتی ہوں تمہیں۔ خیر سے بڑا ہی یاد کرتی ہیں اپنی چاچی کو۔" انہوں نے جھٹ پٹ تعارف کروایا تو

دوسری خاتون پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"یہ کامنی تو ابھی کل ہی ذکر کر رہی تھی کہ کسی روز چاچی سے ملنے جائیں گے، لیکن تمہارے تایا مصروف ہی اتنے رہتے ہیں کہ بس۔ اے بیٹا! چائے بنا رہی ہو کہ پائے گلا رہی ہو۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر بینا کو پکارا۔ ظہیر نعمان اس دوران پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔

تائی اماں کی بار بار پکار کا یہ اثر ہوا تھا کہ جلد ہی چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرالی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔

"یہ کامنی ہے۔" تائی کے کہنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ وہی محترمہ تھیں، جنہوں نے گیٹ کھولا تھا۔

"ارے آپا...... یہ تمہاری بھانجیاں بے چاری مہمان سے ملنے کو کھڑی ہیں، ان کا بھی تو تعارف کروا دو۔" دوسری خاتون زیادہ برداشت نہ کر سکیں کہہ ڈالا۔ تائی اماں نے بظاہر مسکراتے ہوئے اور حقیقتاً مردودنیوں کو ہزار کوسنوں سے نوازتے ہوئے تعارف کروانا شروع کر دیا جو بینا کے ساتھ اس کمرے میں آدھمکی تھیں۔

بڑی کا نام مہرین تھا۔ چوڑی دار پائجامے اور کُرتے میں ملبوس، نفیس چشمہ، ستواں ناک پر ٹکائے وہ یوں حیران حیران سی کھڑی تھی گویا ابھی دنیا میں قدم رکھا ہو۔ اس سے چھوٹی کا نام نازنین تھا۔ معلوم ہوا اسپورٹس کی شوقین ہے۔ غالباً اسی لیے اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی ریکٹ نظر آ رہا تھا۔ بلیک جینز اور ڈھیلی ڈھالی لانگ شرٹ پہنے وہ خاصی بے نیاز اور لاپرواسی دکھائی دے رہی تھی۔ جب تک تعارف ہوتا رہا تب تک وہ خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے اپنے چیختے چلاتے معدے کو صبر کی تلقین سے نوازتا رہا جو بے چارہ صبح سے خالی تھا۔ خدا خدا کر کے وہ چاروں بلائیں اس کے سر سے ٹلیں تب کہیں جا کر اسے پیٹ پوجا کا موقع ملا۔

"اور سناؤ بیٹا! تمہاری امی اور دادی تو بالکل ٹھیک تھی ناں۔"

"جی ہاں۔ بالکل خیریت سے تھیں۔ امی نے سلام بھجوایا ہے آپ کو۔" اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے بھئی، ہمیں بھی تو پتا چلے کیا بھجوایا ہے ہماری دیورانی جی نے۔"

ایک تیز سی آواز عقب سے ابھری تھی۔ ظہیر نے پلٹ کر دیکھا۔ چھوٹی تائی اپنی اکلوتی صاحبزادی کے ساتھ خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔

"سلام بھجوایا ہے آپ کی دیورانی جی نے۔" بڑی تائی اماں نے لفظوں کو چبا کر جواب دیا۔

چھوٹی تائی کی آمد انہیں سخت ناگوار گزری تھی۔

"خالی خولی سلام۔ خیر یہاں کس چیز کی کمی ہے؟" چھوٹی تائی نے کندھے جھٹکے اور پھر اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ظہیر! پہچانا تم نے اسے...... فروا ہے ہماری اکلوتی بیٹی۔ ایک آدھ دفعہ گئی تھی تمہارے ہاں بچپن میں۔" وہ بڑے طنزیہ انداز میں مسکرائی تھیں۔ "بغیر کمبل اور ہیٹر کے ریشمی لحافوں میں سکڑ کر سونا پڑا تو اگلے ہی روز اپنے پاپا کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔" ان کے لہجے سے آتی امارت کی بو نے ظہیر کا دل متلا دیا تھا۔

"ہاں کافی سال پرانی بات ہے۔ آئندہ یہ آئیں گی تو فل بیڈ روم میں انہیں شاید کمبل اوڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔" اس نے بہت اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ جمائی تھی۔ تائی اماں کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی، جبکہ چھوٹی تائی جز بز ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اچھا بھئی! میں تو شاپنگ کے لیے نکل رہی تھی۔ دیر ہو جائے گی اس لیے چلتی ہوں۔" وہ لمحوں میں دہلیز پار کر گئی تھیں۔

"او کے۔ سی یو اگین۔" وہ اپنے ہی دھیان میں تھا جب فروا کا مومی ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر دیکھا۔ فیروزی رنگ کے قیمتی سوٹ میں اس کا دودھیا رنگ دمک رہا تھا۔ دھان پان سا وجود تھا، صراحی دار گردن نے نیکلس کا بوجھ بھی جانے کیسے اٹھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پُرخلوص سی مسکراہٹ دیکھ کر اس کا ہاتھ بے اختیار ہی حرکت میں آ کر اس نازک ہاتھ کو ذرا سا چھو گیا تھا۔ تائی اماں معنی خیز انداز میں کھنکھارنے لگی تھیں۔ مگر وہ بے نیاز سا بن کر وہاں سے اٹھ گیا تھا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔



آج تک اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کی دادی اور ماں آخر کس دنیا کی مخلوق ہیں۔ (معلوم ہو جاتا تو انہیں ان کی دنیا میں پہنچا کر ہی دم لیتا) چلیں مان لیا کہ وہ یعنی ظہیر نعمان اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا اور دادی کی آنکھ کا چاند تارا (بلکہ پورا نظام شمسی) شادی کے قابل ہو چکا ہے۔ مگر کیا یہ ضروری تھا کہ شادی بھی اسی خاندان کی لڑکی سے کی جاتی، جس نے ابا کی وفات کے بعد انہیں پوچھا تک نہیں تھا اور جس کے ہر فرد نے ان کے گھر پہ چھائے غربت کے سائے دیکھ کر اپنی آنکھیں ماتھے پر ٹانگ لی تھیں (بلکہ اس سے بھی کچھ اوپر) اور ناک اتنی اونچی کر لی تھی کہ اس سے آگے بھی کچھ دیکھ ہی نہ سکے تھے اور آج جب وہ ایک ایک سیڑھی طے کر کے ان کے برابر آ

کھڑا ہوا تھا تو ان میں سے اکثریت نے نہ صرف اسے دیکھ لیا تھا، بلکہ چوم چاٹ کر سینے سے بھی لگا لیا تھا، مگر اس کے باوجود ظہیر نعمان کی رائے ان کے بارے میں آج بھی وہی تھی جو کئی برس پہلے۔ یعنی یہ کہ اس خاندان میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں تھا، جسے قدرے ''معقول'' کہا جا سکے۔ مگر اس کے باوجود دادی اور امی کی ضد تھی کہ شادی ہوگی تو اسی خاندان میں۔

''ارے اتنا اچھا گھر بار۔ اتنا نیک اور فرماں بردار بچہ، اتنی اچھی تنخواہ۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ باہر کی لڑکیوں کو لا کر عیش کرواؤں جبکہ میرا اپنا خاندان بھرا ہوا ہے جوان بچیوں سے۔''

یہ رائے خالصتاً دادی کی تھی اور امی کی رائے کچھ اور کیونکر ہو سکتی تھی۔ جھٹ تمیز دار بہو کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔ ساس کی ہاں میں ہاں ملائی اور لے کے کڑوا گھونٹ پلا دیا ظہیر نعمان کو۔ کبھی جو اس بے چارے نے اس خود غرض خاندان کی ہسٹری پر روشنی ڈالنی چاہی تو دونوں خواتین نے مل کر اپنے بڑھاپے کا ایسا واسطہ دیا کہ اسے خاموش ہوتے ہی بنی۔

''خدا جانے باہر کی لڑکیاں کیسی ہوں۔ ذرا کوئی اونچ نیچ ہو گئی اور تمہیں لے کر اس گھر سے چلتی بنی تو؟ اور اگر ہمیں ہی چونڈا پکڑ کر گھر سے نکال باہر کیا تو؟ نہ میاں صاحبزادے شادی تو تمہیں خاندانی لڑکی سے ہی کرنی پڑے گی اور آخر کو دیکھی بھالی تو ہوں گی نا۔ پھر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔''

دادی طویل دلائل دیتیں اور تمیز دار بہو جھٹ سے ''اور کیا'' کہہ کر اپنے نمبر بڑھوا لیتیں۔

''کبھی ناخن بھی گوشت سے جدا ہوتا ہے۔''

''ہاں تو اور کیا۔ اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا۔''

''یعنی مار کھانے کا ارادہ پکا ہے آپ لوگوں کا۔'' وہ کلس کر رہ گیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنی قصیدہ خوانی میں محاوروں کی ایسی مار ماری کہ وہ اگلے ہی روز بیگ اٹھا کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ ''خاندانی دلہن'' کی تلاش میں۔

اور یہاں آ کر وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ کوئی لڑکی بھی تو ایسی نہ تھی، جسے دیکھ کر اس کے دل کا تار محبت کے انوکھے سر بجانے لگے۔ چلو یہ نہ سہی کم از کم وہ عادات و اطوار ہی دکھ جاتے جن کی بنا پر وہ دادی اور امی کو فون کھڑکا دیتا کہ لیجئے آپ کی ''خاندانی بہو'' ڈھونڈ لی گئی ہے۔

یہاں تو بڑے تایا کی بینا تھی، جو اس عمر میں بھی اودھم مچانے اور کڈکڑے لگانے کو تیار تھی۔ دادی تو اسے دوسرے دن ہی چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتیں اور پھر کامنی۔ اسے تو دنیا میں بھیجا ہی کھانے کے لیے گیا تھا، مگر اب امی میں اتنا دم خم کہاں تھا کہ دیگیں پکا پکا کر بہو کے سامنے رکھتیں اور کامنی کی تو چوٹی بھی نہ تھی گھر سے باہر نکالنے کو دادی کو یقیناً کرین کا استعمال کرنا پڑتا۔

اور بڑے ناز نخرے والی محترمہ فروا بیگم چھوٹے تایا کی اکلوتی صاحبزادی۔ وہ تو اس کے میک اپ، جیولری اور شاپنگ کا بوجھ اٹھا کر اگلے ہی روز کنگال ہو کر سسرال والوں کے سامنے ناک رگڑ رہا ہوتا۔

تو اب باقی کون رہ گیا تھا؟ صرف ایک چچا جن کی زوجہ محترمہ ایک زمانے میں پھوہڑ اور بدسلیقہ کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ اگر ان کی بیٹی کا انتخاب کرتا تو چار جوتوں کی مار سہتا۔ دو امی کے اور دو دادی کے۔ کہ خیر دونوں خواتین سلیقہ مندی اور سگھڑپن میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھیں۔

تو پھر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے ظہیر نعمان کو زچ کر دیا تھا۔

''تو پھر اب یہی کیا جا سکتا ہے کہ علی الصبح جاگوں اور پہلی ٹرین سے واپس جا پہنچوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ ''مجھے شادی نہیں کرنی۔''

اس نے اکتا کر فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اردگرد کے کمروں میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ لاؤنج سے ہوتا ہوا برآمدے میں آ گیا جہاں بائیں ستون کے ساتھ گملے ابھی بھی اوندھے پڑے تھے۔ وہ طویل سانس لے کر سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑے تایا اور چھوٹے تایا دونوں اسی کوٹھی کے علیحدہ علیحدہ پورشنز میں رہتے تھے۔ گیٹ کے اطراف میں دونوں لان تھے اور دونوں ہی اس وقت آباد تھے۔

ایک طرف چھوٹے تایا اور تائی خوش گپیوں میں مگن تھے تو دوسری طرف بینا اور کامنی شام کی چائے سمیت موجود تھیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کس طرف قدم بڑھانے چاہئیں کہ کامنی کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''ظہیر بھائی جان!'' اس نے پوری قوت سے پکارا تھا۔ پھر وہ تو خاموش ہو گئی، مگر ''جان'' کی بازگشت کافی دیر تک سنائی دیتی رہی۔ وہ خوامخواہ خجالت محسوس کرتا ہوا ان کے سامنے جا بیٹھا۔ تب ہی ہارن کی تیز آواز نے انہیں چونکا دیا۔ یہ فروا تھی جو بڑی تمکنت سے سفید گاڑی میں بیٹھی اسے ساتھ چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے معذرت کی تو فروا کے چہرے پہ یکلخت ہی ناراضی کے آثار نمودار ہو گئے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ زن سے گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

''ہونہہ، مزاج دیکھو محترمہ کے۔ نہ شکل نہ عقل...... مولی نہ ہو تو......'' بینا نے چڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''مولی نہیں...... پھیکا شلجم...... کھی...... کھی۔'' دونوں بہنیں ایک دوسرے سے سر ٹکرا کر زور زور سے ہنسنے لگی تھیں۔ وہ ہونق سا بنا ان کو دیکھتا رہا۔

چند لمحوں کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے......ارے......آپ کہاں چل دیئے؟"

"صبح میں واپس جا رہا ہوں۔ سوچا ابھی چچا جان سے مل آؤں۔" بینا کے استفسار پر اس نے سرسری انداز میں بتایا جواباً وہ پھر قہقہے لگانے لگی تھی۔

"تو یوں کہیے ناں غریب آباد جا رہے ہیں جہاں غریب قومیں بستی ہیں۔" اس کے لہجے میں تضحیک کا عنصر نمایاں تھا۔

"جی ہاں اور جہاں بچے اسکول سے واپس آنے کے بعد یہ نہیں پوچھتے کہ آج کیا پکا ہے بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ آج کون سی دال پکی ہے؟" یہ ٹکڑا کامنی نے لگایا تھا۔

اور اس کے بعد قہقہوں کا ایک طوفان ابل پڑا تھا، جس کے درمیان ظہیر نعمان نے خود کو غصے سے بڑبڑاتے ہوئے سنا تھا۔ اور یہاں اس کی ساری ہمدردیاں چچا جان کے ساتھ اس لیے بھی تھیں کہ بڑے اور چھوٹے تایا ابا کے سوتیلے بھائی تھے اور چچا ابا کے سگے بھائی تھے۔ برے حالات میں اگر کسی نے دادی یا امی کی تھوڑی بہت معاونت کی بھی تھی تو وہ چچا فیضان ہی تھے۔



جس وقت وہ چچا فیضان کے گھر پہنچا سورج غروب ہو رہا تھا۔ ننھی چڑیوں کے غول آسمان پر اُڑے جا رہے تھے اور گھروں کی دیواروں اور چھتوں پر سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی تو کچھ دیر انتظار کے بعد جو چہرہ دروازے پر نمودار ہوا وہ چچی جان کا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پہچان گئی تھیں کیونکہ دو سال قبل دادی کی کولہے کی ہڈی چٹخ گئی تھی تب وہ گاؤں گئی تھیں اور ظہیر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کرتے ہوئے انہوں نے اسے اندر بلا لیا۔ ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اس نے صحن میں قدم رکھا ہی تھا جب ٹھک سے اسٹیل کا گلاس اس کے پاؤں سے ٹکرایا اور پھر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ اس نے ٹپٹا کر چچی جان کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں وہ جان بوجھ کر متوجہ نہیں ہوئیں کہ ان کے ہاں یہ روز کا معمول تھا بہرحال وہ جی ہی جی میں خوب شرمندہ ہوا اور اسی شرمندگی سے بچنے کے لیے نگاہیں زمین پر گاڑ دی تھیں تاکہ آئندہ سامنے آنے والی ہر چیز کو پھلانگا جا سکے۔ تب ہی اس کی آنکھوں کے سامنے زنانہ چپل میں مقید دو پاؤں آ گئے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ انہیں پھلانگنے کی تدبیر کرتا دو ہاتھ آگے بڑھے تھے اور اسے دھکا دے کر کئی فٹ پیچھے

دھکیل دیا گیا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر نگاہ اٹھائی تب تک وہ آندھی وطوفان کی مانند اپنا رخ دوسری سمت میں بدل گئی۔ ایک نظر میں وہ بس ماتھے پر پڑی سلوٹیں ہی دیکھ سکا تھا۔

"یا اللہ!" وہ سر جھٹکتا ہوا فوراً چچی جان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ چچی اسے بٹھا کر خود باہر نکل گئیں۔

"کیا اونٹوں کی طرح منہ اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ اور ہزار بار تمہیں کہا ہے کہ دوپٹہ ہر وقت اوڑھا کرو۔" وہ بیٹھ کر سانس بحال کر رہا تھا جب چچی کی غصیلی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"وہ بھی تو شتر بے مہار کی طرح چلا آ رہا تھا۔ کم از کم آپ ہی آواز دے کر اطلاع دے دیتیں۔ اب میں کام کیا کروں یا اس تنبو کو سنبھالا کروں۔" جواباً جھنجلا کر کہا گیا تھا اور ظہیر کو چونکہ "شتر بے مہار" کا خطاب پسند نہیں آیا تھا اس لیے اس نے ارادتاً اپنی توجہ ادھر ادھر کر لی تھی۔

جس کمرے میں وہ بیٹھا تھا اسے یقیناً ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ چھ کرسیاں تھیں، جو کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ لگی تھیں، ان کے سامنے ایک لکڑی کی میز تھی جس پر بچھے سفید کور پر چائے کا داغ خاصا نمایاں تھا۔ دائیں دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر البتہ دھلی دھلائی چادر موجود تھی۔ چارپائی کی پائنتی کی طرف اسٹینڈ والا پنکھا کھڑا تھا جو غالباً استعمال میں نہ ہونے کے باعث گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار کے اوپر ایک آئینہ لگا ہوا تھا اس آئینے کے عین نیچے چھوٹی سی میز پر چھوٹا سا ٹیپ رکھا ہوا تھا۔ آئینے کے برابر میں کھونٹی تھی جس پر دو ایک سوٹ لٹک رہے تھے۔ اس کے برابر کمرے کا دروازہ تھا جہاں سے باہر صحن کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صحن کے وسط میں جو چارپائی بچھی ہوئی تھی اس پر ایک اسکول بیگ اور ڈھیروں ڈھیر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ چارپائی کے پاس ہی جوگرز اور ان سے ابلتی ہوئی جرابیں تھیں۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ غالباً کسی زمانے میں بیل لٹکائی گئی تھی اب وہاں صرف ایک خشک گملا اور ستون سے لپٹا ہوا دھاگا موجود تھا۔ عجیب بے ترتیبی سی پورے گھر میں نظر آ رہی تھی۔

"بدسلیقہ ماں کی پھوہڑ بیٹی۔" اس کے ذہن میں گونجا اور وہ بس تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

تب ہی چچی جان چلی آئیں۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد چچی جان پہلو بدلنے لگیں۔ کبھی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتیں۔ ادھر ان کی صاحبزادی دوپٹہ سر پر تانے، سٹر پٹر کرتی کبھی ڈیوڑھی کی طرف جاتی، کبھی واپس کچن میں آتی اور کبھی دروازے کی اوٹ سے ماں کو "شی......شی" کر کے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔

اب معلوم نہیں چچی کی سماعتوں میں نقص تھا یا وہ باتوں میں اس قدر مگن تھیں کہ وہ بے چاری ہر بار ہی ناکام و نامراد پلٹ جاتی۔ تھوڑی دیر بعد جب "شی......شی" کا سلسلہ مفقود ہو گیا اور کچن سے

ڈیوڑھی تک کی آمدورفت بھی مفقود ہوگئی، تب چچی جان اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

''میں پوچھتی ہوں، آج کی تاریخ میں چائے بنے گی کہ نہیں۔'' کچن اس کمرے کے بالکل برابر میں تھا۔لہٰذا آواز خود بخود سنائی دے گئی تھی۔

''چائے گھنٹے سے بنا رکھی ہے، لے جایئے۔''

''ارے خالی چائے لے جا کر اس کے سر پر انڈیلوں گی کیا؟''

''سر پر انڈیلیے یا اس میں ڈبکی لگوایئے، میری بلا سے۔ میں کیک پیسٹریاں کہاں سے لا کر سجا دوں۔'' عجیب جلا کٹا سا انداز تھا۔ظہیر پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''گھنٹے بھر سے کسی بچے کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ خدا خدا کر کے بلّو ملا تو دکاندار نے کہہ دیا کہ ''ادھار اگلے چوک پر۔'' اب بے چارہ اگلے چوک پر جا کر تو ادھار بسکٹ لانے سے رہا۔اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا۔''

''ظاہر ہے اپنا منہ لے کر ہی واپس آنا تھا، کسی اور کا تو لانے سے رہا۔''

چچی جان دانت پیستے ہوئے کچن سے باہر نکلیں۔ظہیر نے مسکراہٹ چھپانے کو سر جھکا لیا۔اور جب وہ وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہا تھا تب چچی ٹرے میں چائے اور بسکٹ کی پلیٹ سجا کر چلی آئیں۔

''ارے چچی جان! آپ نے خوامخواہ تکلف کیا۔ مجھے ضرورت محسوس ہوتی تو میں خود آپ سے کہہ دیتا۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ جواباً چچی جان نے بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔چائے کے بعد وہ بے چینی سے چچا جان کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ صبح جانے کا ارادہ اب پختہ ہو چکا تھا لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ وہ ان سے مل کر ہی جاتا۔ایسی مصروف زندگی میں پھر جانے کب ملاقات ہو۔ چچا فیضان آئے تو ہلکا ہلکا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا۔انہوں نے پہلے خوب پیار کیا پھر خوب لتاڑا۔

''ارے تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ اپنے چچا کو دو حرف خیریت کے لکھ کر خط ہی ڈال دیا کرو۔ چلو اور کچھ نہیں تو ہماری بھاوج اور ماں کی خیریت تو پہنچا دیا کرو۔''

''ارے تو۔ بچے کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔ کبھی آپ سے تو ہوا نہیں کہ دو حرف لکھ کر اپنی بھاوج اور ماں کی خیریت معلوم کر لیا کریں۔'' چچی جان لحاظ کرنے والوں میں سے نہیں تھیں، سو چچا کو بھی کھری کھری سنا دیں۔

''ارے بھئی! میں تو ٹھہرا بال بچے دار۔ ہزار بکھیڑے ہیں، سینکڑوں ذمہ داریاں ہیں اور یہ تو ابھی چھڑا چھانٹ ہے۔کل کو بیوی بچے ہوں گے تو شاید ملنے پر کہنے لگے کہ کون سے چچا، کہاں کے چچا...... کیوں میاں ظہیر؟''

چچا جان بوجھ کر اسے چھیڑنے لگے۔ وہ حقیقتاً بہت خوش ہوئے تھے اس کی آمد پر۔ مرحوم بھائی کو گویا اس کی صورت چلتے پھرتے دیکھ رہے تھے۔ پھر برسوں بعد کوئی ایسا ملا تھا جس سے جی بھر کے اپنے گاؤں کی، وہاں کے لوگوں کی اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کی باتیں کی تھیں۔ بڑے دونوں بھائی اسی شہر میں تھے، مگر سوتیلے پن اور امارت کی چکاچوند نے فاصلے اس قدر بڑھا دیئے تھے کہ کبھی اتفاقاً بھی سامنا ہوا تو نظریں چرا کر ادھر ادھر ہو گئے۔اور پھر کتنا دل چاہتا تھا کہ ماں کے پاس جائیں اسے اپنے پاس بلائیں، مگر جب بھی ارادہ کیا کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آ گئی۔ سو اب ظہیر کو سامنے پا کر خلاف عادت خوب چہک رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے اجازت لینی چاہی مگر انہوں نے زبردستی روک لیا۔

''میاں! کھانا تم ادھر ہی کھاؤ گے اور صبح سے پہلے تمہیں ہرگز نہیں جانے دیں گے۔'' چچا کے بے حد اصرار پر اس نے رک جانا ہی مناسب سمجھا۔

''سعدیہ بیٹی! کھانا کب تک ملے گا بھئی۔ اب تو کافی بھوک لگ گئی ہے۔'' چچا نے باہر جاتی سعدیہ کو پکارا تو وہ بھی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''لا رہی ہوں ابا۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ معلوم نہیں وہ اب تک کن بکھیڑوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب جب بھی ظہیر نے اسے دیکھا وہ یوں ہی بوکھلائی، جھنجھلائی سی پھرتی نظر آئی۔ آخر احمد نے کھانا لا کر میز پر چن دیا اور خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس سے چھوٹے تینوں بھائی غالباً کچن میں ہی کھانے بیٹھ گئے تھے۔ چچی جان کسی ہمسائی کی عیادت کو چلی گئی تھیں۔ سو اس وقت وہ تینوں ہی کمرے میں موجود تھے۔

''بیٹا! یہ پانی کا جگ دینا ذرا۔'' چچا نے ظہیر سے کہا۔ احمد نے پھرتی دکھاتے ہوئے فوراً جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نجانے کیسے اس کی کہنی سالن کے ڈونگے سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے سالن سے بھرا ہوا ڈونگا زمین پر اوندھا پڑا تھا اور کمرے میں موجود تینوں نفوس قدرے صدمے کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ چوتھا منہ سعدیہ کا تھا، جو گرم گرم روٹیاں پہنچانے آئی تھی مگر یہاں کی صورت حال دیکھ کر کافی سے زیادہ پھول گیا تھا۔

''اب اس پر فاتحہ پڑھنا بند کرو۔ احمد! جا کر مزید سالن لے آؤ۔'' چچا کے ٹوکنے پر احمد منہ بناتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

''اب میں یہ لے کر جاؤں!'' چند لمحے بعد کچن سے احمد کی حیران اور پریشان آواز سنائی دی تھی۔

''نہیں......وہ جو دیگ پکا رکھی ہے بھنے مرغ کی، وہ لے جاؤ......'' خاصے اطمینان سے

جواب دیا گیا تھا، تھوڑی دیر بعد احمد سالن کا ڈونگا لایا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اسے میز پہ رکھ کر فوراً ہی پلٹ گیا، ڈونگا اب بھی بھرا ہوا تھا، مگر بھنے ہوئے مرغ سے نہیں بلکہ شوربے سے۔ ہو سکتا ہے چند ایک بوٹیاں بھی نچلی سطح پر موجود ہوں، جنہیں کھرچنے کی زحمت کیے بغیر اس نے اپنی رکابی میں شوربا ڈالا تھا اور کھانے لگا تھا۔ چچا نے البتہ ایک حسرت بھری نگاہ اس ڈونگے پر ڈالی تھی جو ابھی تک اوندھا پڑا تھا اور جس کے نیچے بھنا ہوا مرغ بھی تھا۔ پھر ایک ''آہ'' بھرتے ہوئے انہوں نے ڈونگا اپنی طرف کھسکایا اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے شوربے میں چمچ گھمانے لگے تھے۔

○ ○ ○

صبح اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں ایک ہنگامہ بپا تھا، احمد کالج جاتا تھا باقی تینوں بھائی اسکول جاتے تھے۔ سو اس وقت افراتفری اپنے عروج پر تھی۔ چچی کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔

''ارے سعدیہ......! تمہارے ابا کی واسکٹ کدھر ہے......؟ اور احمد کی جرابیں بھی تو نہیں مل رہیں۔ گھنٹہ بھر سے بچہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اے لو...... یہ ظفر سائیکل اٹھا کر کہاں چل دیا، ارے ناشتہ تو کرتے جاؤ۔ ہزار بار اس لڑکی سے کہا ہے ذرا جلدی اٹھ جایا کرے مگر اس پر کسی بات کا اثر ہو تب نا......؟''

چچی نے اپنا روئے سخن سعدیہ کی طرف کیا تو پھر اسے لتاڑتی چلی گئیں۔ اپنے بستر میں لیٹے ظہیر کو اس بے چاری پر بے تحاشا ترس آیا جو اپنی منمناتی آواز میں پکار پکار کر بتا رہی تھی کہ ظفر ناشتہ کر چکا ہے مگر چچی کی اپنی بولتی بند ہوتی تو ہی کچھ سنائی دیتا۔ نتیجتاً وہ تھک ہار کر خاموش ہو گئی تھی۔

اس نازک صورتحال میں اس کا اٹھنا ایک نئے ہنگامے کا سبب بن سکتا تھا۔ سو وہ چپ چاپ دبکا رہا یہاں تک کہ ایک ایک کر کے گھر کے سب افراد اپنے کام پر روانہ ہو گئے اور گھر کی فضا بھی قدرے پرسکون ہو گئی۔ تب وہ اٹھا اور سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو چچی جو کچھ دیر پہلے دیوار پر سے کسی ہمسائی سے گفتگو فرما رہی تھیں۔ اب وہاں سے غائب ہو چکی تھیں۔

وہ گیلا تولیہ صحن میں بندھی تار پر لٹکا کر کمرے کی طرف بڑھا تو کچن کے دروازے پر ٹھٹک کر رک گیا۔ سعدیہ کچن کے دروازے تک بکھرے جھوٹے برتن سمیٹ رہی تھی اس کے کھنکھارنے پر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر ایک دم سیدھی ہو گئی۔ کندھے پر بے نیازی سے رکھا ہوا دوپٹہ اس نے جھٹ سر پر ڈال لیا تھا۔

''چچی جان کہاں ہیں؟'' اس کے متوجہ ہونے پر اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''ابھی تو یہیں تھیں، شاید سبزی والے کو دیکھنے گئی ہیں۔''

''سبزی والے کو دیکھنے؟'' ظہیر کے حیرت سے کہنے پر سعدیہ نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اس کے مذاق کو سمجھتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔

''میرا مطلب سبزی خریدنے سے تھا۔ آپ کمرے میں چلیں میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔''

اس کے کہنے پر ظہیر نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اگر یہ لڑکی مسکراتی رہے خاصی معقول نظر آئے۔

وہ کمرے میں آیا تو بستر اور ان پر کمبل جوں کے توں بکھرے پڑے تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا، جو کل تک ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال ہو رہا تھا، مگر رات کو ساری کرسیاں سامنے دیوار کے ساتھ لگا کر ایک اور چارپائی بچھا کر اس کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوسری چارپائی پر چچا جان سوئے تھے۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور پھر کندھے جھٹک کر اپنے کمبل کو تہ کرنے لگا۔

سعدیہ ناشتے کی ٹرے لیے کمرے میں آئی تو اسے بستر کی چادر جھاڑتے دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

''سوری ظہیر بھائی......! میں کچن میں مصروف تھی اس لیے......''

''ارے کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے اس طرح......'' اس نے ایک نظر اس کے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی اور اس کی تسلی کے لیے بے اختیار ہی کہہ ڈالا۔

''لائیے...... میں ٹھیک کر دیتی ہوں۔'' سعدیہ نے ٹرے اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔ اور چادر لے کر اسے ایک دوبار جھٹک کر چارپائی پر بچھا دیا۔ میز اٹھا کر چارپائی کے نزدیک رکھی اور ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر میز پہ رکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی کا جگ لے کر آئی تو اس کی شرمندگی کو دفع کرنے کے لیے وہ اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگا۔

''اماں تو کہہ رہی تھیں کہ ایف اے کر لیا ہے، بہت ہے۔ مگر ابا کی خواہش تھی کہ میں بی اے کا ایگزام بھی دے دوں۔'' اس نے کرسی پر پڑے کپڑے اٹھا کر کھونٹی پہ لٹکاتے ہوئے بتایا۔

''پھر دیا کیوں نہیں؟''

''نہیں...... دیا تو تھا اسی سال مگر......'' اس کی ادھوری بات پر وہ استفہامیہ انداز سے اسے دیکھنے لگا۔

''مگر......؟''

''مگر میں دو مضامین میں فیل ہو گئی تھی۔'' کمبل اٹھاتے ہوئے اس نے اتنی سادگی سے بتایا تھا کہ چند لمحے اسے حیرت سے دیکھنے کے بعد وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں۔" وہ شاید برا مان گئی تھی۔

"ہاں......لیکن میں تو اس بات پر خوش ہو رہا ہوں کہ تم صرف دو مضامین میں فیل ہوئی ہو جب کہ میں تو تین مضامین میں ناکام ہوا تھا۔" اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سر اٹھایا تو وہ بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ یقیناً جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ بہت ذہین ہیں۔" چند لمحے بعد وہ طویل سانس لے کر بولی تھی۔ شاید اس کے چہرے پہ بکھری مستقل مسکراہٹ کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ظاہر ہے ذہین تھے جب ہی تو سی اے کرلیا۔" اس نے گویا اس کی ذہانت کا ثبوت پیش کیا اور پھر کمبل اٹھا کر کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

"سنو......" اس سے بے اختیار ہی اسے روکنے کی حرکت سرزد ہوئی تھی۔

"کل تمہیں میرا یہاں آنا ناگوار گزرا تھا۔" وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی تھی، تب فوراً ہی اس نے بات بنائی تو وہ جو گھڑی بھر کے لیے رکی تھی ایکدم سیدھی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں تو...... بھلا مجھے آپ کا یہاں آنا ناگوار کیوں لگے گا اور آپ نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

"بس ایسے ہی مجھے محسوس ہوا تھا اسی لیے پوچھ لیا۔" اس کے سادہ اور شفاف لہجے کو محسوس کرتے ہوئے ظہیر نے اسے ٹالنا چاہا۔ وہ چند لمحے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"کل میرا موڈ کسی اور وجہ سے خراب تھا شاید اس لیے آپ کو محسوس ہوا ہو، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" وہ عام سے انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔

ظہیر چند لمحے دروازے کو پرخیال نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد سیدھا ہو گیا تھا۔ کچھ تو تھا اس لڑکی میں ایسا، جو دل کو بھلا محسوس ہوا تھا۔ وہ کسی کو متاثر کرنے کی شعوری کوشش نہیں کرتی تھی، شاید اس لیے متاثر کن تھی۔ مگر بیوی اور بہو بننے کے لیے سادگی اور شخصیت کا ظاہری تاثر ہی کافی نہیں ہوتا، اس کے لیے اور بہت سی صلاحیتوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ان ہی صلاحیتوں کی کمی اس لڑکی میں ظہیر نے پوری محسوس کی تھی۔ گرد آلود چیزیں، بکھرا ہوا بے ترتیب گھر اور مہمان نوازی کے نام پر کل سے جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ کچھ ایسا خوشگوار نہیں تھا کہ وہ دل کی آواز پر لبیک کہہ اٹھتا۔ آج تک جس گھر میں وہ رہتا چلا آیا تھا وہاں چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی مقام متعین تھا۔ کسی مہمان کے آنے پر لمحوں کی دیر ہوتی اور انواع واقسام کھانوں سے میز بھر دی جاتی۔

دادی اگر سگھڑ خاتون کے نام سے مشہور تھیں تو امی نے بھی "سلیقہ مند بہو" کا خطاب پورے وقار سے حاصل کیا تھا۔ لہٰذا ایسی خواتین کو سعدیہ جیسی بہو تو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ خود وہ بھی ایک سلیقہ شعار، نفاست پسند بیوی کا خواہش مند تھا لہٰذا دل کی ہر خواہش کے ساتھ ساتھ چچا اور چچی کو بھی خدا حافظ کہہ کر وہ اسی شام گھر واپس چلا آیا تھا۔



"ظہیر میاں......! اتنی ساری لڑکیوں میں آخر کوئی تو ہو گی، جو نظر میں جچتی ہو۔ جو ذرا اچھے مزاج کی، ہم تم میں گھل مل جانے والی ہو، جس کے رنگ ڈھنگ نیک اور شریف لڑکیوں جیسے ہوں۔ یہ کیا کہ ایک بار "نہیں" میں سر ہلایا اور بات ختم۔"

یہ دادی اماں تھیں جو تیسرے روز بھی اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ امی نے تو اس کی "نہیں" کو حرف آخر سمجھ کر چپ سادھ لی تھی، مگر دادی اماں......، فائل بند کر کے دراز میں رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا دادی اس کے بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں اور قدرے خفا خفا سی لگ رہی تھیں۔

"دادی! آپ لوگوں نے خود ہی تو کہا تھا کہ لڑکی مجھے پسند آئی تو ٹھیک ورنہ نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب چلا آیا۔ "پھر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟"

"ارے اسی بات پر تو ناراض ہو رہی ہوں کہ لڑکیاں تو ساری کی ساری اچھی ہوتی ہیں لیکن تم جانے کسی حور پری کی تلاش میں ہو۔ ورنہ اتنی ساری لڑکیوں میں کوئی ایک تو ایسی ہو گی جو......"

دادی اماں کی تان پھر اسی جگہ جا کر ٹوٹی تھی۔

"کوئی ایک......" اس نے زیر لب دہرایا تو جہاں ایک سادہ سا چہرہ آنکھوں میں آکر ٹھہرا وہاں ایک نام بھی ہونٹوں پر آ گیا۔ دادی اماں چونک گئیں۔

"سعدیہ...... فیضان کی بیٹی...... ارے وہ پسند تھی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"دادی! وہ اچھی تو ہے مگر......؟"

"مگر کیا......؟" دادی اس کا چہرہ کھوجنے لگیں تو اس مگر کے جواب میں اس نے پوری روداد کہہ ڈالی۔ جسے سن کر دادی بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"بیٹیاں تو ماں کا پرتو ہوتی ہیں بیٹا! ماں کی تربیت کا عکس ہوتی ہیں اور مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے بیٹا کہ تمہاری چچی نے تربیت کے نام پر اپنی بچی کو سوئی پکڑنا بھی نہیں سکھایا ہو گا۔ بہر حال تم فکر مت کرو میں خود وہاں جاؤں گی۔ کچھ عرصہ وہاں رہوں گی اور خوب اچھی طرح دیکھ بھال لوں

گی۔ تم محض ایک آدھ دن وہاں رہے ہو۔ ہوسکتا ہے جو کچھ تم نے دیکھا وہ محض اتفاق ہو۔ پڑھی لکھی بچی ہے۔ آخر کتابوں سے بھی کچھ سبق تو سیکھا ہوگا اس نے۔''

دادی نے تسلی آمیز لہجے میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے دادی! اب ساری کی ساری ذمہ داری آپ کی ہے۔''

''میں جانتی ہوں اور تم بھی جان لو کہ تمہاری دادی کو ذمہ داری نبھانا بہت اچھی طرح آتا ہے۔'' دادی نے پُراعتماد لہجے میں کہا تو اس نے بے اختیار ان کی تائید کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔



گلی کے کچی پکے، اونچے نیچے راستے پر چلتے ہوئے دادی ہانپ سی گئی تھیں۔ کوئی تیسری مرتبہ سیدھی ہوکر انہوں نے ایک ہاتھ کمر پر رکھا، دوسرے سے آنکھوں پر چھجا بناتے ایک قطار میں بنے مکانوں کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا کر سیدھی ہوگئیں۔ ظہیر نے کتنا کہا تھا کہ اماں میں آپ کو چھوڑ آؤں گا مگر انہوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ دیکھا بھالا راستہ ہے آرام سے پہنچ جاؤں گی۔ اسے صاف منع کر دیا تھا مگر اب تو کوئی مکان بھی فیضان کا نہیں لگ رہا تھا یا پھر سب ہی مکان فیضان کے مکان جیسے لگ رہے تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے قریب سے گزرتے ایک نوعمر لڑکے کو پکارا، جو تھیلا کندھے پر رکھے، کچھ گنگناتا ہوا جا رہا تھا اس نے کھڑے ہوکر مؤدب انداز میں ان کی بات سنی اور پھر سیدھا ہوکر اشارتاً بتانے لگا۔

''دو گھر چھوڑ کر جو گلی آپ کو نظر آ رہی ہے اس میں داخل ہو جایئے وہاں ایک مکان گرا ہوا ہے، وہ ہمارا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا مکان جو گرنے والا ہے، وہ فیضان صاحب کا ہے۔''

''ارے......'' اس کی بے تکی بات پر دادی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ کو حیرت ہو رہی ہے نا؟ مجھے بھی ہوتی ہے کہ اس مکان کو تو بہت پہلے گر جانا چاہیے تھا، پھر اب تک گرا کیوں نہیں۔ بہرحال آپ پریشان مت ہوں۔ آیئے میں آپ کو وہاں تک پہنچا آتا ہوں۔''

لڑکا کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا، انہیں بولنے کا موقع دیئے بغیر ان کا ہاتھ پکڑا اور آگے آگے چل دیا۔ دادی بھی اسے گھورنے اور کوسنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل دی تھیں۔

فیضان کے گھر کے ساتھ والا مکان غالباً تعمیر نو کے لیے گرا دیا گیا تھا، اطراف میں بھی کافی اچھے اور جدید طرز کے مکانات بن چکے تھے۔ جن کے درمیان فیضان کا گھر واقعی بہت بوسیدہ لگ

رہا تھا۔ لڑکے نے دروازے کے سامنے بنی دو پختہ سیڑھیاں چڑھنے میں انہیں مدد دی۔ پھر کنڈی کھٹکھٹا کر دروازہ کھولا اور آدھے سے زیادہ اندر گھس گیا۔

''سعدیہ باجی...... آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' اس نے پکار کر کہا پھر دادی کو اندر دھکیلا اور خود وہیں سے پلٹ گیا۔ دادی نے نیم تاریک ڈیوڑھی میں اڑتی ہوئی گرد کے درمیان کھڑے اس سائے کو دیکھا جو ایک ہاتھ میں جھاڑو لیے حیران حیران سا کھڑا تھا۔

''سعدیہ بچی اپنی دادی کو پہچانا نہیں۔'' ان کے کہنے پر وہ دو قدم آگے بڑھی تھی بغور انہیں دیکھا تھا اور پھر جھاڑو پھینک کر ایک دم ان کے سینے سے لگ گئی تھی۔ محبت اور اپنائیت کا بہت بے ساختہ اظہار تھا۔ دادی مسرور سی ہوگئیں۔

''آیئے نا دادی اماں!'' اس نے سفری بیگ ان کے ہاتھ سے لیا۔ اماں اس وقت گھر پر نہیں تھیں۔ سعدیہ نے انہیں صحن میں بچھی چارپائی پر بٹھایا اور خود فوراً دیوار پر سے دوسری طرف جھانکنے لگی۔ پھر کسی کو پکار کر کچھ کہا اور واپس ان کے پاس آ گئی، دادی تب تک اپنی چادر اتار کر ململ کا بڑا سا دوپٹہ اوڑھ چکی تھیں۔

''میں نے بچے کو بھیجا ہے امی کو بلانے کے لیے۔'' سعدیہ انہیں بتا کر کچن میں چلی گئی، اور دادی بڑی فرصت سے گھر کا جائزہ لینے لگیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ظہیر انہیں پہلے بتا چکا تھا۔ تب ہی سعدیہ کی اماں چلی آئیں۔ انہوں نے آتے ہی شور مچا دیا۔

''ارے سعدیہ! اماں کو کب سے یونہی بٹھا رکھا ہے...... کمرے میں بٹھاؤ نا، ذرا چارپائی پر لیٹ کے کمر ہی سیدھی کرلیں۔ اتنا لمبا سفر کرنا اور وہ بھی اس عمر میں کوئی ایسی آسان بات تو نہیں۔''

''کوئی بات نہیں بہو!...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''اچھا چلو تکیہ ہی لا دو، ذرا آرام سے بیٹھ تو جائیں۔'' دادی کے کہنے پر انہوں نے دوبارہ کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ تب ہی سعدیہ نکلی اور صحن کے آخر میں بنے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد وہاں سے نکلی اور دوبارہ کچن میں۔

دادی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بہو کی طرف متوجہ ہوگئیں جو زور و شور سے انہیں اپنے جیٹھ اور جٹھانیوں کی بے اعتنائی کی داستان سنا رہی تھیں ذرا دیر بعد انہیں دوبارہ یاد آئی تو پھر تکیے کی آواز لگا دی۔ سعدیہ ایک مرتبہ پھر اسٹور میں گھس گئی اور جب نکلی تو خالی ہاتھ ہی تھی۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی اماں کو کچھ اشارے کیے۔ دادی جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔

''ارے غلاف نہیں چڑھایا تو ایسے ہی لا دو، یہ کوئی غیر تھوڑی ہیں تمہاری اپنی دادی ہیں۔'' بہو

نے خود ہی اس کے اشاروں کو زبان دے دی تھی۔

"رہنے دو زبیدہ خاتون! کمرے میں چلتے ہیں وہیں گھڑی بھر کو لیٹ جاتی ہوں۔" دادی نے انہیں زیادہ مشکل میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے فوراً اٹھ کر کمرے میں آ گئیں۔ سعدیہ نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔

انہیں باتیں کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی، جب سعدیہ چائے لے کر آئی چائے کا اکلوتا کپ اور ایک پلیٹ میں گنے چنے بسکٹ ان کے سامنے رکھ دیئے گئے تھے وہ چند لمحے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ بہو بھی پاس بیٹھی تھی اکیلے کھاتے پیتے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، سو بے اختیار ہی سعدیہ کو ایک کپ مزید لانے کا کہہ دیا۔ جواباً اس نے قدرے بوکھلا کر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی آخر سعدیہ کی ماں تھیں فوراً سمجھ گئیں۔

"نہیں...... نہیں اماں! میں تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی ناشتے سے فارغ ہوئی ہوں۔ چائے رہنے دو سعدیہ تم جا کر دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرو۔" انہوں نے ٹال دیا۔

دادی بھی جان گئیں کہ چائے کا صرف ایک ہی کپ بنایا گیا ہے سو چپ چاپ کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ اس کے بعد سعدیہ جتنی دفعہ ان کے سامنے آئی وہ بہ نظر غائر اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے زرد پھولوں والا بلو دوپٹہ تھا جو غالباً کسی دوسرے سوٹ کا تھا۔ قد و قامت بہت اچھا تھا، جسم نہ تو فربہی مائل تھا نہ ہی بہت دبلا پتلا، کھلتی ہوئی گندمی رنگت تھی نین نقش البتہ بہت خوبصورت تھے۔ اس کے ملگجے سے حلیے کے باوجود انہوں نے جانچ لیا کہ بن سنور کر، پہن اوڑھ کر ظہیر کے برابر کھڑی ہو گی تو یقیناً چاند سورج کی جوڑی کہلائے گی۔ سوچ ہی سوچ میں ان دونوں کو برابر کھڑے دیکھا تو بے اختیار ہی ایک نرم سی مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟" بہو کی نگاہ تیز تھی ساس کو بیٹی کا جائزہ لیتے دیکھا تو فوراً پوچھ لیا۔ وہ ذرا سا چونک گئیں۔

"ہاں...... دیکھ رہی ہوں کہ نین نقش تو بالکل تمہارے مگر رنگت اپنے باپ کی لی ہے سعدیہ نے......" دادی نے زبیدہ کی سرخ و سپید رنگت کو دیکھا جو آج بھی ماند پڑنے کے باوجود بہت سوں کو مات دیتی تھی۔

"رنگ تو اس کا بھی بہت اچھا تھا اماں! بس گھر کے کام کاج میں لگ کر ایسی ہو گئی ہے۔ ویسے اپنے ظہیر نے بھی قد کاٹھ خوب نکالا ہے ماشاء اللہ، بچپن میں تو ایسا دبلا پتلا سا ہوا کرتا تھا۔" زبیدہ خاتون نے چابک دستی سے بات ظہیر کی طرف موڑی اور پھر قدرے اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

"ظہیر کی شادی وادی کا کیا پروگرام بنایا ہے ثریا آپا نے، خیر سے اب تو نوکری بھی کر رہا ہے...... کوئی لڑکی ہے نظر میں۔"

ان کے لہجے میں ویسی ہی امید تھی، جیسی کسی جوان بیٹی کی ماں کے لہجے میں ہو سکتی ہے۔ مگر قبل از وقت انہوں نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے بے نیازی سے ٹال دیا۔

"اللہ جانے کیا پروگرام ہے دونوں ماں بیٹے کا۔ میں نے تو ثریا پر چھوڑ دیا ہے۔"

"پھر بھی اماں......! آخر آپ نے اور ثریا نے مل کر ہی اس کی پرورش کی ہے۔ آپ کی رائے بھی تو لی جائے گی ناں؟" انہوں نے کریدنا چاہا۔

"ہاں بھئی، اس میں تو کوئی شک نہیں، مگر میں نے ثریا سے کہہ رکھا ہے کہ جو تمہاری اور تمہارے بیٹے کی پسند وہی میری پسند، اب دیکھو نا زندگی تو ظہیر نے گزارنی ہے اس لیے لڑکی بھی اسی کی پسند سے لائی جائے تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں، خیر تم یہ بتاؤ......"

دادی نے زبیدہ کا بجھتا چہرہ دیکھا تو فوراً بات بدل دی اور پھر دونوں اسی وقت خاموش ہوئیں جب سعدیہ نے دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی۔



فجر کے وقت دادی وضو کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلیں تو سرد ہوا نے ان کے جسم میں کپکپی سی دوڑا دی تھی۔ انہیں بے اختیار ہی اپنی بہو ثریا کی یاد آ گئی۔ اکتوبر کے آخر میں ہی جب سردی کا آغاز ہوا تھا تو وہ ان کے اٹھنے سے پہلے ہی وضو کے لیے گرم پانی رکھ دیا کرتی تھیں۔ جب کہ یہاں ابھی تک سب ہی سو رہے تھے انہوں نے گرم اونی چادر کو خوب پھیلا لیا اور جب وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے کمرے میں واپس آئیں تو خوب کپکپا رہی تھیں سو نماز پڑھتے ہی دوبارہ اپنے بستر میں گھس گئیں اور ایک ایک کر کے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

"سعدیہ......! بھئی میری بنیان کہاں ہے؟" فیضان کی زوردار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔ چارپائی پر کمبل میں سمٹے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائے نجانے کب انہیں اونگھ آ گئی تھی۔ تسبیح جوں کی توں انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح بیدار ہوتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں۔ فیضان غالباً کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے انہیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائے۔

"اماں اٹھ گئیں آپ...... سعدیہ! بھئی جلدی سے اماں کے لیے ناشتہ لے آؤ۔"

وہ پہلے اماں سے مخاطب ہوئے پھر سعدیہ سے جو بہت عجلت میں کمرے میں داخل ہو کر کھونٹی پر سے ابا کی بنیان تلاش کرنے لگی تھی۔

”ارے کرلیں گے ناشتہ، جلدی کا ہے کو ہے۔کون سا اسکول، کالج جانا ہے۔ بچوں کو اطمینان سے ناشتہ کرنے دو پھر ہم بھی کرلیں گے۔“ انہوں نے رسان سے کہا۔

”سعیدہ باجی! پراٹھا جل گیا۔“ باورچی خانے سے کوئی چیخا تھا، سعدیہ الٹے پاؤں باہر کو بھاگی، فیضان چند لمحے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر تنگ آ کر دوبارہ اسے پکارنے لگے۔

”سعدیہ! مجھے دیر ہو رہی ہے بھئی، پہلے بنیان۔“

اب کے سعدیہ غالباً! چولہا بند کر کے آئی تھی۔ سخت جھنجھلائی ہوئی جلی بھنی، آتے ہی ایک الماری کے دونوں پٹ کھول کر اندر گھس گئی۔ کافی دیر تک بنیان برآمد نہ ہوئی تو ابا کی بڑبڑاہٹیں شروع ہوگئیں۔ ادھر باورچی خانے میں چھوٹے بھائی ناشتے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے پانچ دس منٹ کی مشقت کے بعد اس نے ڈھیروں ڈھیر کپڑے نکال کر چارپائی پر پھینکے اور الماری کے نہ جانے کس کونے سے مڑی تڑی بنیان نکال کر ابا کے ہاتھ میں تھمائی اور پھر باورچی خانے کی طرف لپکی۔ دادی نے دیکھا وہ اس قدر بوکھلائی ہوئی تھی کہ بس رونے کی کسر باقی تھی۔

”چھوٹی بہو! تم اٹھ کر بچوں کے لیے ناشتہ ہی بنا دو، وہ اکیلی بچی آخر کیا کیا کام کرے۔“ وہ بہو سے کہے بغیر نہ رہ سکیں جو کتنی ہی دیر سے ہل ہل کر قرآن پاک پڑھ رہی تھیں اور اب قرآن پاک رکھنے کے بعد آرام سے بستر میں آ بیٹھی تھیں۔

”ارے اماں! کرنے دیں اسے...... ہر روز یہ ہی کرتی ہے سب کچھ، آج آدھا کام میرے سر پہ ڈال دے گی تو کیا کل کو سسرال میں بھی مجھے ساتھ لے کر جائے گی۔ کام کاج کرے گی تو ہی گھر سنبھالنے کے قابل ہوگی ناں۔ اب ہم ملوں فیکٹریوں کے مالک تو ہیں نہیں کہ دو چار نوکر جہیز میں اس کے ساتھ کر دیں۔“ وہ اپنا ہی رونا لیے بیٹھ گئیں۔ دادی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھیں۔

’چھوٹی بہو! اس طرح تو یہ بیس سال بھی لگی رہے تو گھر سنبھالنے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ ارے یہ تو گر ہوتے ہیں ”گر“ جنہیں سکھانے پڑھانے والی ذات صرف ”ماں“ ہی کی ہوتی ہے۔ ماں نہیں بتائے گی تو بیٹی کو کیونکر معلوم ہوگا کہ پراٹھے میں سات بل کیسے ڈالے جاتے ہیں۔ زردے کے چاولوں کو ٹوٹنے سے کیسے بچایا جاتا ہے، پرانی چیزوں کو نیا کیسے بناتے ہیں۔ قلیل آمدنی کے باوجود خوشحالی کا تاثر کیسے دیا جاتا ہے۔ اور گھر بھر کے افراد کی ضروریات کو کیسے اور کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔ ارے یہ تو ماؤں کے سینے کے ”راز“ ہوتے ہیں جو بیٹیوں کے سینے میں منتقل ہوتے ہیں۔ اور گھر جنت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ماؤں کے سینے ہی اس ”راز“ سے خالی ہوں وہی گھر سنبھالنے اور تربیت کے ”گر“ سے ناواقف ہوں تو پھر بیٹیاں جان بھی مار لیں تب بھی گھر کا وہی حال رہے گا

جو آج تمہارے گھر کا ہے۔‘

دادی کی تلخ سوچ ان کے دل و دماغ تک ہی محدود رہی تھی۔ ایک تو بہو کی طبیعت سے واقف تھیں دوسرے خود بھی مہمان تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو اسی لیے خاموش رہ گئیں۔ وگرنہ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھیں کہ ان کی پوتی کاہل یا سست ہرگز نہیں تھی بس تربیت کی کمی تھی اسی لیے کام کرنے کے ہنر اور طریقے سے نابلد تھی۔

’خیر اب آئی ہوں تو یہ کام بھی کر کے ہی جاؤں گی۔‘ وہ مصمم ارادہ کرتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی آئیں جہاں ہلکی ہلکی دھوپ دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ وہ وہیں چارپائی بچھا کر بیٹھ گئیں۔

سعدیہ دھونے والے برتن اکٹھے کر رہی تھی۔ رات کے کھانے کے برتن بھی یونہی پڑے تھے اس کے ساتھ ناشتے کے برتن بھی دھونے بیٹھی تو گھنٹہ بھر وہیں لگ گیا۔ باہر سبزی والا آوازیں لگا رہا تھا، زبیدہ خاتون تھیلا لے کر باہر نکل گئیں۔ دادی چارپائی پر نیم دراز سعدیہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگیں۔ برتن دھو کر کچن میں رکھنے کے بعد اس نے کمروں سے بستر اکٹھے کیے اور جھاڑو لگانے لگی۔ صحن میں جھاڑو دینے کے بعد وہ ڈیوڑھی تک پہنچی تھی، جب زبیدہ خاتون سبزی لے کر آ گئیں۔

”اے سعدیہ! ٹوکری اور چھری لا کر دو، میں تمہیں سبزی بنا دوں۔“ دادی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہی انہوں نے آواز لگائی، سعدیہ جھاڑو ڈیوڑھی میں رکھ کچن میں گئی۔ ٹوکری اور چھری لا کر اماں کے سامنے رکھی اور پھر سے جھاڑو اٹھا لی ابھی دو منٹ گزرے ہوں گے جب زبیدہ خاتون نے پھر سے پکار لیا۔ اس دفعہ پیاز اور لہسن منگوایا تھا۔ اس کے بعد جو سبزی زبیدہ خاتون تیار کرتی گئیں اس کے چھلکے اور کچرا چارپائی سے نیچے صحن میں پھینکتی گئیں۔ دادی جتنی دیر وہاں بیٹھی رہیں انہیں اختلاج قلب ہوتا رہا۔

”سعدیہ! مرغیوں کو دانہ ڈالا کہ نہیں؟“

زبیدہ خاتون نے اچانک یاد دلایا تو وہ سر پہ ہاتھ مار کر رہ گئی۔ جلدی میں کوڑا اکٹھا کر کے ڈیوڑھی میں ہی دیوار کے ساتھ لگایا وہیں جھاڑو رکھی پھر پانی اور دانہ لے کر چھت پر چلی گئی۔ وہاں سے واپس آئی تو دودھ والا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس سے دودھ لے کر ابلنے کے لیے چولہے پر رکھا اور خود فرش پر کپڑا پھیرنے لگی۔ زبیدہ خاتون سبزی کچن میں رکھنے گئیں تو دودھ سارا ابل ابل کر دیگچی سے باہر آ رہا تھا، انہوں نے چولہا بند کیا اور خود شروع ہو گئیں۔ سعدیہ روہانسی ہو کر چپ چاپ سنتی رہی۔ ایک آدھ بار چپکے سے اسے آنسو صاف کرتے دیکھا تو دادی کو اس پر بے تحاشا ترس آیا، مگر چونکہ ابھی بولنے کا موقع نہیں تھا اس لیے خاموش رہیں۔ دودھ کا کام نبٹا کر وہ کپڑے

دھونے بیٹھ گئی تھی۔ واشنگ مشین کی سہولت نہیں تھی سو یہ کام بھی ہاتھ سے ہی کرنا تھا ابھی دو چار کپڑے ہی دھو پائی تھی، جب زبیدہ خاتون نے دہائی مچا دی۔

''بارہ بجنے کو آئے ہیں، بچے اسکول سے واپس آنے والے ہیں ان بے چاروں کو کچھ کھانے کو بھی ملے گا کہ نہیں۔'' بارہ بجنے کا سنتے ہی سعدیہ باقی کے سب کپڑے ویسے ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کھانا اب وقت پر بنا لیا کرو، اماں سے بھی اس عمر میں بھوک کہاں برداشت ہوتی ہوگی۔ صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے انہوں نے، اب تک تو دوپہر کا کھانا بن جانا چاہیے تھا۔'' زبیدہ خاتون نے اسے لتاڑا تو ان کے قریب سے گزرتے ہوئے سعدیہ کے قدم جیسے زمین نے روک لیے تھے۔

''صبح کا ناشتہ.....'' اس نے جیسے غائب دماغی سے دادی کو دیکھا جو بڑی نرم مسکراہٹ چہرے پہ سجائے کہہ رہی تھیں۔

''اب میں اتنی پیٹو بھی نہیں کہ بارہ بجے ہی دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھ جاؤں۔ ایک ڈیڑھ تو بج ہی جاتا ہے ہمیں بھی۔''

''اچھا اماں.....! یہاں جاننے والوں میں ایک خاتون بیمار ہیں، میں ذرا وہاں ہو آؤں کافی دنوں سے جا ہی نہیں سکی اب آپ یہاں ہیں تو مجھے گھر کی فکر نہیں رہے گی۔''

زبیدہ خاتون چپل پہن کر چلتی بنی تھیں، سعدیہ مرے مرے قدم اٹھاتی کچن میں آ گئی، صبح اماں نے ناشتہ کچن میں آ کر، کر لیا تھا خود وہ بھی کام میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ جلدی میں بس دہی کی پیالی اور دو چار لقمے پراٹھے کے لیے تھے۔ دادی سے ناشتے کا پوچھا تھا تو اس وقت انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ بچے اسکول چلے جائیں پھر اطمینان سے ناشتہ کریں گے۔ انہوں نے یقیناً اس پر کام کی زیادتی کے سبب منع کیا تھا مگر وہ ایسی بھولی کہ اب بارہ بجنے کو آئے تھے اور دادی اس وقت سے بھوکی بیٹھی تھیں۔ وہ اس قدر پشیمان ہوئی کہ وہیں گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔

باہر دادی نے ایک دو بار اسے آواز دی جب وہ باہر نہیں نکلی تو وہ خود ہی باورچی خانے میں چلی آئیں۔ اس کے قریب آ کر اسے ہلایا جلایا تو معلوم ہوا کہ زار و قطار رونے میں مصروف ہے۔

''ارے.....رے.....کیا ہو گیا.....تمہیں؟'' ان کا اتنا کہنا بھی غضب ہو گیا تھا کہ اگلے ہی لمحے وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''دادی اماں! قسم سے مجھے بالکل بھی خیال نہیں آیا، آپ صبح سے بھوکی بیٹھی ہیں اور.....''

''تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے بھئی، اگر میں نے ناشتہ نہیں کیا تو اس میں تمہارا کیا قصور؟'' انہوں نے بڑے پیار سے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔

''قصور تو ہے دادی اماں! اگر ایک مرتبہ آپ نے منع کر دیا تھا تو میرا فرض بنتا تھا کہ میں دوبارہ آپ سے ناشتہ کا پوچھتی۔'' وہ پوری طرح احساس جرم کا شکار ہو رہی تھی۔

''بے وقوف لڑکی! تمہارا کیا خیال ہے میں اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ کوئی مجھ سے ناشتے کا پوچھے تو تب ہی کچھ کھاؤں گی۔ بھئی یہ میرے بیٹے کا گھر ہے، میرا اپنا گھر اور تو میری بہت اچھی بیٹی ہے۔ جب ضرورت محسوس ہوگی جب دل چاہے گا تم سے کہہ دوں گی۔ ہم دادی پوتی میں کوئی تکلف تھوڑی ہے۔''

''تو پھر آپ نے صبح سے ناشتے کے لیے کہا کیوں نہیں۔'' سعدیہ کو ان کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔

''ارے بھئی جب میں کوئی لمبا سفر کر لیتی ہوں تو کئی روز تک ٹھیک طرح سے بھوک نہیں لگتی۔ آج بھی ناشتے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' انہوں نے بڑے آرام سے کہا۔

''پھر بھی دادی اماں! اور کچھ نہیں تو کم از کم چائے ہی لے لیتیں۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اٹھی پھر دودھ کا گلاس بھر کر دادی کے سامنے رکھا اور خود الماری میں گھس گئی کچھ دیر بعد واپس پلٹی تو ہاتھ میں بسکٹوں کا ڈبہ تھا جو غالباً کل کے بچا رکھے تھے۔

''جب تک میں کھانا تیار کرتی ہوں، آپ یہ کھائیے۔'' دادی دودھ نہیں پیتی تھیں، مگر اس کا دل رکھنے کو ایک دو بسکٹ اور دودھ کا گلاس پی لیا۔

''اب آپ لیٹ جائیں دادی! صبح سے یوں ہی بیٹھی ہیں۔'' سعدیہ نے اصرار کرتے ہوئے انہیں وہاں سے اٹھا دیا۔ وہ کمرے میں جا کر لیٹیں تو غنودگی سی چھانے لگی کچھ دیر بعد وہ پوری طرح غافل ہو چکی تھیں۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد ان کی آنکھ اس وقت کھلی تھی، جب کوئی ہولے ہولے ان کے پاؤں گدگدا رہا تھا۔

''کون ہے بھئی؟'' نیم تاریک کمرے میں انہیں بس ایک ہیولا سا نظر آیا تھا۔

''دادی اماں.....! اٹھ کر کھانا کھا لیجیے۔'' فاروق کی معصوم سی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''آ گیا میرا بچہ اسکول سے.....'' انہوں نے بڑے پیار سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ دوسرے بچے ابھی ان سے جھجکتے تھے مگر فاروق نے اپنائیت اور انسیت کے غیر معمولی مظاہرے کے باعث جلد ہی دادی سے بے تکلفی اختیار کر لی تھی۔ اب بھی کمرے سے باہر نکلتے ہوئے فوراً ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

صحن کی رونق اور چہل پہل بتا رہی تھی کہ سب بچے اسکول سے واپس آ چکے ہیں۔ فاروق سے چھوٹا حسن چارپائی پر کتابیں بکھرائے ہوم ورک کر رہا تھا، سعدیہ دوپہر کا کھانا بنانے کے بعد دوبارہ کپڑے دھونے میں مصروف ہو چکی تھی۔ انہیں دیکھ کر فوراً کھانا دینے کو اٹھی مگر انہوں نے منع کر دیا، پہلے وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باورچی خانے میں آ کر خود ہی کھانا نکال کر کھانے لگیں۔ فاروق پھر سے ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"دادی اماں آپ کو کہانی آتی ہے؟"

"ہاں بھئی، کہانی نہیں مجھے تو کہانیاں آتی ہیں۔" ان کے کہنے پر فاروق کی آنکھیں چمک سی گئی تھیں۔

"ہیں...... سچی...... آپ مجھے سنائیں گی نا" بہت معصوم سا پرجوش انداز تھا اس کا، دادی نے مسکراتے ہوئے بے اختیار ہی اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ خوشی سے اچھل ہی پڑا۔

پھر باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہانی کا آغاز کیا ہی تھا جب حسن بھی کتابیں چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس چلا آیا۔ کچھ دیر بعد تمام دھلے ہوئے کپڑے تار پر پھیلانے کے بعد سعدیہ بھی ہاتھ خشک کرتی ہوئی ان کے پاس چلی آئی اور ابھی اسے بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے جب احمد چلا آیا۔ اس کے کچھ دوست آئے تھے جن کے لیے چائے بنانی تھی۔ سعدیہ فوراً باورچی خانے میں گھس گئی۔ چائے بنا کر فاروق کے ہاتھ باہر بجھوائی، تب ہی زبیدہ خاتون چھت سے نیچے اتر آ گئیں۔ ہاتھ میں دو چار انڈے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ نیچے آنے پر معلوم ہوا سعدیہ کو کوسا جا رہا ہے۔

"کیا ہوا بہو......؟" دادی پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"ہونا کیا ہے اماں! مجھے تو اس لڑکی نے تنگ کر رکھا ہے۔ اللہ جانے اسے کب عقل آئے گی اور معلوم نہیں آئے گی بھی کہ نہیں ارے اس سے کم عمر لڑکیوں نے یوں گھر سنبھال رکھے ہیں کہ ماؤں کو فکر تک نہیں اور یہاں سارے عذاب میرے سر پر مسلط ہیں۔" وہ ایک بار پھر شروع ہو گئیں تو دادی جھنجھلا سی گئیں۔

"ارے کچھ پتا بھی تو چلے، آخر ہوا کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں...... ذرا اوپر جا کر مرغیوں کے ڈربے کی حالت دیکھیے، وہاں تو سانس لینا محال ہے۔ خدا معلوم مرغیاں اب تک زندہ کیسے ہیں۔ پھر بھی دیکھیے بے چاری انڈے دیئے جا رہی ہیں۔" انہوں نے چار انڈے دادی کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔

"احسان ہے مرغیوں کا، ورنہ انہیں تو چاہیے تھا کہ ہڑتال کے طور پر انڈے دینے بند کر

دیتیں۔" دادی جان نے سعدیہ کو پہلی بار چڑتے ہوئے دیکھا تھا مگر زبیدہ خاتون معاف کرنے والوں میں سے کہاں تھیں۔ اسے یوں گھورا کہ وہ بس جھاڑو اٹھائے دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

"بس ایک زبان ہی تو ہے جو قینچی کی طرح کتر کتر چلتی ہے۔ جتنی چاہے بکواس کروا لو نہ بڑوں کا لحاظ نہ چھوٹوں کی پروا۔" زبیدہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

دادی بس ایک لمبا سا سانس کھینچ کر رہ گئی تھیں، کہانی ختم ہو چکی تھی۔ بچے دونوں باہر بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے بڑی فرصت سے صحن کا جائزہ لیا تھا۔ ان کی چارپائی کے پاس صبح والے سبزیوں کے چھلکے اور کچرا یوں ہی پڑا تھا۔ ڈیوڑھی میں کوڑے کی ڈھیری بھی ابھی تک دیوار کے ساتھ موجود تھی۔ حسن اپنی کتابیں اور بیگ جوں کا توں چھوڑ گیا تھا۔

صحن کی دائیں دیوار کے ساتھ کونے میں بنے نل کے پاس کپڑے دھونے والا ڈنڈا، صابن نیل حتیٰ کہ ٹب میں صابن والا گدلا پانی بھی موجود تھا۔ وہیں پر ٹرے میں چار، چھ چائے کے کپ پڑے تھے جو غالباً احمد یہاں رکھ گیا تھا اور ان پر خوب مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دادی کو زیادہ ہی کوفت محسوس ہوئی تو وہ چپل پہن کر نل کی طرف آ گئیں۔ اپنی عمر رسیدگی کے باوجود انہوں نے کام کاج سے مکمل طور پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گھر میں بھی ثریا کے روکنے کے باوجود وہ اکثر کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتی تھیں۔ اس وقت بھی اٹھ کر انہوں نے ٹب سے گدلا پانی گرا کر ٹب کو ایک طرف اوندھا کر کے رکھ دیا۔ صابن، نیل اور دوسری چیزیں ایک کونے میں ترتیب سے رکھ دیں اور کپ دھو کر کچن میں لے آئیں۔ کچن کی حالت بھی قابل رحم لگ رہی تھی۔ برتنوں کے لیے بنائی گئی الماریاں خالی پڑی تھیں اور برتن سارے جھوٹے، ایک کونے میں ڈھیر تھے۔ ہنڈیا اور ڈوئی پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دودھ والی دیگچی کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ چولہے پر کہیں خشک آٹا گرا ہوا تھا تو کہیں گھی کے داغ دھبے موجود تھے۔ ایک جگہ ذرا سا پانی گرا ہوا تھا جس پر چلنے پھرنے کے باعث کیچڑ سا بن گیا تھا۔ ان کا دل وہاں ایک لمحہ ٹھہرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ حالانکہ یہی باورچی خانہ تھا جو صبح ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ تب ہی سعدیہ چلی آئی۔ ملگجا گرد آلود لباس، بکھرے ہوئے بال تھکن زدہ اترا ہوا چہرہ۔ معلوم نہیں دوپہر میں بھی اس نے ڈھنگ سے کھانا کھایا تھا کہ نہیں۔

'اور اگر ظہیر کی ماں ثریا ایک بار بھی سعدیہ کے حلیے اور اس گھر کو دیکھ لے تو زندگی بھر اسے بہو بنانے کو تیار نہ ہو' انہوں نے دل ہی دل میں سوچا مگر چونکہ وہ اس ناممکن کو ممکن بنانے کا تہیہ کیے بیٹھی تھیں، اس لیے سعدیہ کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دیں۔

"دادی اماں! کچھ چاہیے تھا آپ کو؟" انہیں باورچی خانے میں کھڑا دیکھ کر فوری طور پر اس

کے ذہن میں یہی بات آئی تھی۔

"ہاں بیٹی! ایک کپ چائے چاہیے مگر میں خود ہی بنا لیتی ہوں، تم ذرا مجھے چینی پتی وغیرہ پکڑا دو۔"

وہ چولہے کے پاس بیٹھنے لگیں، مگر سعدیہ نے بصد اصرار انہیں وہاں سے اٹھا دیا اور خود چائے بنانے لگی۔ مگر چائے کا پانی ابھی ابلنے بھی نہ پایا تھا کہ جب احمد عجلت میں چلا آیا۔

"اس کا بٹن ٹوٹ گیا ہے، ذرا جلدی سے لگا دو۔" اس نے شرٹ سعدیہ کے ہاتھ میں تھمائی اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔ سعدیہ شرٹ لے کر سیدھی اسٹور میں گھس گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے ہونق سا چہرہ لیے باہر نکلی۔

"سعدیہ! بیٹی کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" اسے بوکھلائے سے انداز میں ادھر ادھر بھاگتے دیکھا تو دادی پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"اماں......سوئی نہیں مل رہی۔" وہ ایک ڈونگا ہاتھ میں لیے سوئی کھوج رہی تھی اور ڈونگے میں نہ جانے کیا الم غلم ٹھونسا ہوا تھا۔

"سعدیہ! تولیہ کہاں گیا؟" باہر سے احمد چیخا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔ مجھے بتا کر گیا ہے؟" جواباً وہ بھی چلائی تھی۔ سوئی ڈھونڈنے کے عمل میں ذرا تیزی آ گئی تھی۔

"افوہ۔ تو پوچھ لیا کرو ناں اس سے کہ وہ کہاں گیا ہے؟" احمد اب آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"بٹن لگ گیا ہے تو جلدی سے شرٹ دے دو۔ باہر میرا دوست انتظار کر رہا ہے۔"

"لگا رہی ہوں۔ تھوڑا صبر تو کرو۔" احمد کو ٹال کر وہ کمرے میں گھسی تھی۔ اماں چادر لیے اونگھ رہی تھیں۔ جلدی سے انہیں جگایا۔

"اماں! کل آپ قمیص کی ترپائی کر رہی تھیں سوئی کہاں رکھی تھی؟" اس نے عجلت میں پوچھا۔

اماں بے چاری کچی نیند سے جاگی تھیں۔ جواباً ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتی رہیں۔

"افوہ اماں! جلدی بتائیں نا۔" اس نے ایک بار پھر انہیں جھنجھوڑا۔

"ارے بھئی۔ کھونٹی پہ پڑی ہے قمیص۔" ان کے کہنے پر وہ تیر کی طرح کھونٹی کی طرف لپکی اور پھر ان کی بات سمجھ کر اپنا سر پیٹتی ہوئی واپس پلٹی۔

"اماں! میں سوئی کا پوچھ رہی ہوں۔" مگر اماں دوبارہ چادر کے پیچھے گم ہو چکی تھیں۔

"سعدیہ! کیا کر رہی ہو تم؟ اب تک ایک بٹن نہیں لگا تم سے؟" احمد اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا

تھا۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔

"سوئی نہیں مل رہی احمد! میں ڈھونڈ رہی ہوں نا۔ تم تھوڑا سا انتظار کر لو۔" اس نے بڑی بے چارگی سے کہا تو احمد بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اگر وہ اس سے ایک سال بڑی نہ ہوتی تو اب تک وہ بری طرح برس چکا ہوتا۔

"اس گھر میں بندہ گم جائے تو وہ نہیں مل سکتا۔ سوئی کیا خاک ملے گی۔"

وہ دانت پیس کر کہتا ہوا الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر، عرق ریزی کے بعد جو شرٹ اسے ملی وہ اس قدر مڑی تڑی حالت میں تھی کہ پہننے کے قابل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کھونٹی کی طرف گیا۔ وہاں ایک شرٹ میلی حالت میں پڑی تھی باقی دو باہر تار پر بھیگی لٹک رہی تھیں اور جب تک سعدیہ نے سوئی دھاگا ڈھونڈ کر اس کی شرٹ پر بٹن ٹانکا تھا وہ اپنے موجودہ حلیے سمیت اپنے دوست کے ساتھ جا چکا تھا۔

"اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ مجھے عقل آ ہی نہیں سکتی۔"

آنسو خود بخود اس کی آنکھوں میں بھاگے چلے آ رہے تھے۔ احمد اپنی میلی سی مسلی ہوئی شرٹ میں اپنے دوستوں کے سامنے کس قدر شرمندہ ہو رہا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی اسے رونا آ رہا تھا۔ کتنی کوشش کرتی تھی وہ کہ ہر کام اپنے وقت پر ٹھیک ٹھاک طرح سے ہو جائے۔ کسی کو اس سے شکایت نہ ہو، مگر کتنی بار عہد کرنے کے باوجود وہ ہر بار یونہی ناکام ہو جاتی تھی۔

"کوئی ایک کام بھی تو ڈھنگ سے نہیں ہوتا مجھ سے۔ میں واقعی بہت پھوہڑ اور بدسلیقہ ہوں۔ وہ نازیہ اور مہوش بھی تو ہیں۔ انہیں میں نے کبھی پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ٹی وی، وی سی آر بھی دیکھتی ہیں۔ خود کو بھی مین ٹین رکھتی ہیں، گھر بھی ہر وقت چمکتا رہتا ہے اور میں کتنی کوشش کرتی ہوں مگر گھر کو صاف ستھرا نہیں کر سکتی۔ اس روز خالہ سکینہ بھی کتنی باتیں بنا کر گئی تھیں اور وہ مینا...... مجھ سے ملنے آئی تھی مگر کتنا مذاق اڑا کر گئی تھی میرا کہ "لگتا ہے محلے کے خاکروب چھٹی پر ہیں اور اپنی جگہ سعدیہ کے لیے خالی کر گئے ہیں۔" اب میں ہر وقت اس کی طرح رنگ برنگ چوڑیاں اور کیوٹکس کا خیال کیسے رکھا کروں۔ یہاں تو نہانے اور کپڑے بدلنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ......"

"سعدیہ!" وہ زور و شور سے رونے میں مصروف تھی جب باہر سے دادی نے پکار لیا۔ وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہو گئی۔

"کیا سوچیں گی دادی، اس لڑکی کو رونے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں آتا۔"

دل میں یہ خیال آتے ہی اس نے جھٹ اپنا چہرہ صاف کیا۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں

رگڑیں اور اٹھ کر باہر آ گئی۔ دادی کچن میں اس کے حصے کی چائے کپ میں ڈالے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اس کا بھیگا بھیگا چہرہ اور سرخ ہوتی آنکھیں بغور دیکھیں مگر پھر انجان بنتے ہوئے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ رات تک یوں ہی گھن چکر بنی رہی تھی۔ کبھی حسن کو حساب کے سوال سمجھا رہی تھی، کبھی فاروق کی کاپیوں پر اخبار چڑھا رہی تھی۔ دھلے ہوئے کپڑے اتار کر تہہ کر کے الماری میں رکھنے لگی تو ابا آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی کھانا مانگ لیا تو وہ عجلت میں کپڑوں کا ڈھیر یوں ہی چارپائی پر رکھ کر ابا کے لیے کھانا گرم کرنے لگی تھی۔ پھر رات کے کھانے کی تیاری شروع ہوگئی۔ کھانا کھلانے کے بعد کمرے کی ترتیب ایک مرتبہ پھر بدلی گئی۔ چارپائیاں جو دن کے وقت کمرے سے باہر نکالی جاتی تھیں، انہیں دوبارہ کمرے میں بچھا کر ان پر سب کے بستر لگائے۔ بستر لگاتے ہوئے دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر اس نے جیسے تیسے الماری میں ٹھونس کر الماری بند کر دی اور دادی کو سو فیصد یقین تھا کہ جس کسی نے بھی الماری کھولنے کی غلطی کی، اس کا استقبال کپڑوں کے اسی ڈھیر سے ہوگا۔ اور پھر یہ غلطی بھی سعدیہ ہی سے اس وقت سرزد ہوئی تھی جب ابا نے اس سے لوئی (گرم چادر) مانگ لی اور الماری کھولتے ہی سارے کپڑے اس کے قدموں میں آ گرے تھے۔ اس نے سٹپٹا کر ابا اور دادی کی طرف دیکھا اور ان دونوں کو باتوں میں مشغول دیکھ کر اس نے جلدی سے لوئی نکالی کپڑوں کو الماری میں ٹھونسا اور ابا کو لوئی دے کر خود باہر آ گئی۔ چھت پر جا کر مرغیوں کا ڈربہ بند کیا۔ صحن میں بکھری چیزیں سمیٹیں اور تھکن زدہ وجود لیے کمرے میں آ گئی۔

اماں تو شام پڑتے ہی اپنی چارپائی سنبھال لیتی تھیں، اس وقت بھی وہ ہلکے ہلکے خراٹے لیتے ہوئے اردگرد کے ماحول سے بے خبر لگ رہی تھیں۔ ابا ابھی تک دادی اماں کی پائنتی پر بیٹھے ان سے محوِ گفتگو تھے۔ وہ چپ چاپ اپنی چارپائی تک آ گئی اور ابھی اس نے اپنا لحاف کھولا ہی تھا جب ابا نے اسے پکار لیا۔

''اماں کی ٹانگیں دبا کر پھر سونا۔ ثریا آپا تو ہمیشہ ہی رات کو اماں کے پاؤں دبا کر سوتی ہیں۔''

فیضان کے کہنے پر دادی نے فوراً انکار کر دیا کہ انہیں سعدیہ کی تھکن کا پورا پورا احساس تھا۔ مگر سعدیہ ان کے انکار کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔ دادی اماں نے چند منٹ انتظار کیا اور جوں ہی فیضان وہاں سے اٹھے انہوں نے فوراً اٹھ کر اسے روک دیا۔

''ارے سارا دن بیٹھ بیٹھ کر مجھے کیا تھکن ہوگی بھلا۔''

''کوئی بات نہیں دادی اماں! میں صرف ابا کے کہنے پر تو ایسا نہیں کر رہی۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے آپ کی خدمت کرنا۔'' سعدیہ کے جواب پر وہ کھل کر مسکرائی تھیں۔

''جیتی رہو بیٹی! سدا خوش رہو۔ لیکن ابھی تو میں بہت سارے دن ہوں تمہارے پاس۔ جتنی چاہے خدمت کر لینا فی الحال تو یہاں میرے پاس آ کر لیٹو۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔ دن بھر تو تم بہت مصروف رہتی ہو نا۔'' دادی اسے بہت پیار سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی اور پھر چارپائی کے ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''میں یہیں ٹھیک ہوں دادی اماں! آپ باتیں کریں۔'' اس نے بڑے سبھاؤ سے انکار کیا تو دادی حیران سی ہوگئیں۔

''تو بیٹی! یہاں میرے پاس آنے میں کیا قباحت ہے؟''

''دادی اماں! وہ تین دن سے کپڑے نہیں بدلے۔ ہلدی، مسالوں کی بو سے آپ کا جی متلانے لگے گا۔'' وہ بہت شرمندگی سے جھجکتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''تو بیٹی! دن میں نہا دھو کر کپڑے بدل لیا کرو نا۔'' انہوں نے بہت سرسری انداز میں کہا تھا تاکہ وہ مزید شرمندگی محسوس نہ کرے۔

''دادی اماں! وقت ہی نہیں ملتا۔'' اس نے بے چارگی سے اپنی مجبوری بیان کی۔

''وقت نہیں ملتا۔ اچھا خیر تم یہ بتاؤ کہ یہاں آس پڑوس میں تمہاری کوئی سہیلی بھی ہے کہ نہیں۔'' ایک لمحے کو ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے وقت بچانے کا طریقہ سمجھائیں۔ چھوٹی سے بات بتائیں مگر پھر سوچا وعظ کا طریقہ اختیار کیا تو ہوسکتا ہے اگلے روز وہ ان کے پاس پھٹکے بھی نا لہٰذا اسے خود سے بے تکلف کرنے اور اس کی باقی ماندہ جھجک دور کرنے کے لیے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اس کی سہیلیوں کی باتیں، پڑھائی کی باتیں، اس کی پسند و ناپسند کی باتیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بے تکلف انداز میں انہیں اپنی ایک سہیلی کی ناراضی کا واقعہ سنا رہی تھی کہ کس طرح کام میں الجھے رہنے کے سبب وہ اس کی منگنی پر نہیں جا سکی تھی اور نتیجتاً وہ اب تک اس سے ناراض تھی۔ تب دادی کہے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

''دیکھو سعدیہ بیٹی! وقت تو سب کے پاس ایک جتنا ہی ہوتا ہے یعنی چوبیس گھنٹے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ وقت کی کمی کا شکار نظر آتے ہیں تو کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ صرف گھریلو ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھاتے ہیں، بلکہ اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے اپنے بہترین تعلقات بھی بحال رکھتے ہیں۔ وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ دن کو کھینچ کر لمبا کر لیتے ہیں یا ان کے پاس چوبیس کے بجائے چھتیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ وہ اپنی زیرک نگاہی، اپنے مشاہدے، اپنی سمجھ داری اور اپنی انتہائی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات جان لیتے ہیں کہ کون سا کام کیسے، کس طرح اور کس وقت پر کیا جانا چاہیے کہ نہ

صرف گھر کا انتظام بخوبی چلایا جا سکے، بلکہ دوست احباب کو بھی شکوے شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"لیکن دادی اماں! اتنا سب کچھ ایک ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟" سعدیہ نے فوراً پوچھا تو دادی اس کی بے صبری پر مسکرا دی تھیں۔

"یہ بھی بتاؤں گی بیٹی! لیکن پھر کسی وقت۔ اب کافی دیر ہو چکی ہے اس لیے تم سو جاؤ۔ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔"

انہوں نے جان بوجھ کر اسے ٹال دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ محض "باتوں" سے کوئی تبدیلی آئی بھی تو وہ ہرگز دیرپا ثابت نہیں ہوگی لہٰذا وہ کسی موقع کی تلاش میں تھیں جب یہ سب اسے عملاً کر کے دکھا سکیں اور خوش قسمتی سے یہ موقع انہیں بہت جلد مل گیا تھا۔

○ ○ ○

"سعدیہ! جلدی سے چائے بنا دو اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی۔ ابا کے کوئی دوست آئے ہیں سعودی عرب سے۔"

احمد نے آ کر سعدیہ سے کہا تو وہ چند لمحے کے لیے اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ سوچ کے گھوڑے دوڑانے پر معلوم ہوا کہ اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں جو چائے کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔

"اچھا۔ ایسا ہے کہ میں انڈے ابالتی ہوں۔ تم بھاگ کر بسکٹ لے آؤ۔"

"پیسے؟" احمد کی آواز پر وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے ٹھٹک گئی۔

"میرے پاس پیسے کہاں سے آئے؟"

"قارون کا خزانہ تو میرے پاس بھی دفن نہیں ہے۔" سعدیہ نے ہونق بن کر کہا تو جواباً وہ بھی طنز کر گیا۔

"اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جو کچھ اس وقت گھر میں ہے وہی پیش کر دو۔" اسے ساکت و صامت کھڑے دیکھ کر احمد جھنجھلا گیا تھا۔

"کباب پڑے ہیں فریج میں۔ وہ تل دوں، یا پھر پائن ایپل کیک رکھ دوں؟" کہو تو پیٹیز بھی اوون میں رکھ کر گرم کر دوں؟ ہونہہ...... جو کچھ گھر میں ہے وہی پیش کر دو۔" اس نے جل بھن کر کہا اور پھر اس کی نقل اتارتی کچن میں چلی گئی۔

"یہ...... یہ کچے آلو اور پالک پڑی ہے گھر میں۔ نوش فرما لیں گے ابا کے سعودی عرب سے آئے ہوئے دوست، یا پھر مسور اور چنے کی دال ہے گھر میں۔ اسے مکس کر دیتی ہوں تاکہ نمکو کی جگہ پھانک سکیں ابا کے سعودی عرب سے آئے ہوئے دوست۔" وہ غصے میں ایک ایک لفظ چبا کر کہتی گئی۔

تو اس صورت حال میں بھی احمد کی ہنسی نکل گئی۔

"بند کرو اپنا منہ۔ ورنہ تمہاری بتیسی پلیٹ میں رکھ کر چائے کے ساتھ پیش کر دوں گی محترم کو۔" وہ غصے میں بس ایسی کی تیسی کیا کرتی تھی۔

"اب تاؤ کھانے سے کیا فائدہ؟ پہلے نہیں پتا ہوتا کہ گھر میں کوئی مہمان بھی آ سکتا ہے۔ انسان کوئی تو بندوبست کر رکھے۔" احمد بھی آخر کہاں تک چپ رہتا۔

"ہاں لاٹری نکلی ہوئی ہے ناں اماں کی، ابا کی جو ٹوکریاں بھر بھر کے منگوایا کروں اور......"

"بھئی کیا ہو رہا ہے یہاں؟" دادی اماں اندر نماز پڑھ رہی تھیں، ان کی آوازوں نے ان کے خشوع و خضوع میں خلل ڈالا تو سلام پھیر کر چلی آئیں۔

احمد نے جھٹ پٹ ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ سعدیہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جو اس صورت حال سے سخت پریشان لگ رہی تھیں۔

"اس گھر میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے جب بھی مہمان آئے...... یہ تماشا شروع۔ اتنے عرصے بعد آئے ہیں ابا کے دوست کیا سوچیں گے کہ......" احمد جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا۔

"احمد! تم اگر بکواس کرنے کے بجائے اماں کو پڑوس سے بلا لاؤ تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"اماں کیا کریں گی؟" سعدیہ کے کہنے پر احمد نے استفسار کیا۔

"اور کچھ نہیں تو کہیں سے ادھار پیسے ہی پکڑ لیں گی۔" چائے کا پانی چولہے پر رکھتے ہوئے وہ خاصی بیزار اور نالاں سی لگ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا دادی نے اسے روک دیا تھا۔

"رہنے دو۔ گھر میں ہی تیار کر لیں گے کچھ نہ کچھ۔"

"گھر میں...... دادی اماں گھر میں اس وقت صرف کچے آلو اور......"

"احمد...... تم جاؤ یہاں سے اور آدھے گھنٹے بعد آ کر چائے لے جانا۔" دادی نے دیکھا کہ احمد کی باتیں سعدیہ کی پریشانی میں اضافے کا سبب ہی بن رہی ہیں سو اسے فوراً وہاں سے بھگا دیا۔

"سعدیہ بیٹی! تمہاری امی سبزی کون سی دے کر گئی ہیں۔" پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے دادی نے بہت اطمینان سے پوچھا تھا۔

"آلو پالک۔" سعدیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"بیسن گھر میں ہے کہ نہیں۔" ان کے پوچھنے پر وہ جیسے ایک پل میں سمجھ گئی۔

"ہاں...... بیسن تو ہوگا۔" وہ فوراً اٹھ کر الماری کی طرف بڑھی۔ یہاں بیسیوں ڈبے بند پڑے تھے۔ دادی کو ایک نظر میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ مہینوں سے اس الماری کی صفائی نہیں کی گئی۔ خوب

تلاش بسیار کے بعد وہ بیسن کا شاپر نکال کر پلٹی تو دادی اماں پالک کے چند بڑے بڑے پتے الگ کر کے بقیہ تھوڑے سے پتوں کو باریک باریک کتر چکی تھیں۔ سعدیہ نے بیسن مل جانے کا مژدہ سنایا تو اسے چھاننے کی ہدایت کرتے ہوئے دادی نے ایک دو آلو کاٹ لیے تھے اور جب تک سعدیہ نے بیسن گھولنے کے بعد تیل کی کڑاہی چولہے پر رکھی تھی دادی اماں نے چائے تیار کر لی تھی۔ اس نے خالی چولہے پر فوراً انڈے ابالنے چاہے مگر دادی نے روک دیا۔

''کل تم نے حلوہ بنایا تھا۔ تھوڑی سوجی جو باقی بچی تھی وہ کہاں ہے؟''

''اس کا کیا کریں گی اماں؟'' اس نے سبز دھنیا اور مرچیں بیسن میں ملاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''سوجی اور انڈوں کا حلوہ بنائیں گے اور کیا؟ اور یہ پکوڑوں میں خشک دھنیا باریک پیس کر ملاؤ اس سے خوشبو بہت اچھی آئے گی۔'' انہوں نے اس کی حیرت دور کرنے کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی جاری کی۔

''مگر مجھے تو یہ حلوہ بنانا نہیں آتا۔'' سعدیہ خوب گھبرا رہی تھی۔

''ارے تو میں کس لیے بیٹھی ہوں یہاں۔'' ان کے دلاسا دینے پر سعدیہ کو کچھ حوصلہ ہوا تو فوراً اٹھ گئی۔ شکر ہے سوجی ذرا جلدی مل گئی تھی۔ دادی اماں میں اس عمر میں وہ پھرتی اور دم خم تو نہیں رہا تھا مگر اس کے باوجود جب تک وہ واپس آئی انہوں نے تھوڑی سی ادرک اور چار، چھ جوئے لہسن کے پیس کر ان کا پیسٹ سا تیار کر لیا تھا۔

''اس سے ذائقہ میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا، مگر تاثیر غضب کی ہو گی۔ میری عمر کے لوگ بھی کھائیں گے تو انہیں قبض یا پکوڑے ہضم نہ ہونے کی شکایت نہیں ہو گی۔'' سعدیہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا۔

''لاؤ اب میں تمہیں پکوڑے تل دیتی ہوں، تم حلوے کی تیاری کرو۔'' انہوں نے بیسن والا برتن ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے بتانا شروع کیا۔

''پہلے آدھا کپ سوجی لو اور اسے گھی میں بھوننا شروع کرو۔ پھر ہم وزن چینی لے کر اس میں تین عدد انڈے ڈال کر انہیں خوب اچھی طرح مکس کر لو۔ یوں تو تین انڈے بھی ٹھیک ہیں، لیکن اگر زیادہ نرم حلوہ بنانا ہو تو ان کی تعداد چار یا پانچ بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ کام تو بلینڈر میں بہت اچھی طرح ہو جائے گا۔'' اس نے گھی گرم ہونے کے لیے چولہے پر رکھا اور پھر بلینڈر نکال کر اس میں انڈے اور چینی ڈال کر چند لمحوں بعد ہی اس مکسچر سمیت واپس آ گئی۔

''اگر مزید انڈے ہیں تو لاؤ ایک انڈا بیسن میں مکس کر لیتے ہیں اس سے پکوڑے نہایت خستہ اور مزیدار بنیں گے۔''

''دادی اماں! انڈے بہت ہیں۔ یہ لیجئے۔'' سعدیہ نے شاداں و فرحاں انداز میں انڈا توڑ کر بیسن میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی توجہ حلوے کی سوجی کی طرف بھی تھی۔ جب چند منٹ گزرنے کے بعد سوجی کا رنگ ہلکا براؤن ہو گیا اور خوشبو پھیلنے لگی تب اس نے دادی کی ہدایت کے مطابق انڈوں اور چینی کا مکسچر اس میں ڈالا اور پھر خوب بھون لیا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگے تھے اس حلوے کی تیاری میں۔ ادھر دادی اماں پلیٹ پکوڑوں سے بھر چکی تھیں۔ وہ بھاگ کر چائے کے لیے برتن نکالنے لگی۔ اور جب اس نے چھوٹی پلیٹوں میں حلوہ ڈالنا چاہا تو دادی نے اسے روک دیا۔

''بیٹی ایک بڑی پلیٹ میں حلوہ ڈالو اور ساتھ میں چھوٹی پلیٹیں رکھ دو۔''

سعدیہ نے ایسا ہی کیا تھا پھر ٹرے میں چائے کا تھرماس، کپ، حلوہ اور پکوڑے رکھنے کے بعد وہ پلٹی تو دادی ابھی تک مصروف تھیں۔

''دادی! اب کیا بنا رہی ہیں؟''

''ابھی پتا چل جائے گا۔ تم ذرا ایک خالی پلیٹ میری طرف کرو۔'' سعدیہ نے پلیٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بغور دیکھا۔ پکوڑوں کے لیے جو بیسن گھولا گیا تھا آخر میں اس کی تھوڑی سی مقدار برتن میں رہ گئی تھی۔ دادی نے جو بڑے بڑے پتے پالک کے شروع میں الگ کیے تھے انہیں اچھی طرح اس بیسن میں ڈبو کر تل لیا تھا۔ ساتھ میں ایک آدھ آلو کے باریک قتلے بھی تھے اور ان دونوں چیزوں کو ایک الگ پلیٹ میں سجا کر وہ احمد کو بلا لائی تو کچن میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ ازحد حیرت سے اس نے ایک نظر ٹرے پر ڈالی تھی۔ دوسری سعدیہ کے چہرے پر اور تیسری دادی اماں پر۔

''یہ من و سلویٰ آج سے پہلے تو ہمارے گھر میں نہیں اترا۔'' اس نے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے بغور ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔

''اچھا اب جلدی سے لے جاؤ۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔'' سعدیہ نے اسے ٹوکا تو وہ کندھے اچکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ویسے اطلاعاً ایک بات عرض کر دوں میڈم کہ آج سے پہلے کسی مہمان کو اتنی جلدی چائے پیش نہیں کی گئی۔'' باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے احمد نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ کھسیا کر اسے آنکھیں دکھانے لگی۔

"ویسے دادی اماں! آپ نے تو واقعی کمال کر دیا ہے۔ میں تو پہلے گھنٹہ بھر پریشان ہوتی اور پھر اگر وقت پر اماں نہ آتیں تو صرف انڈے ابال کر چائے کے ساتھ رکھ دیتی۔" دادی کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی آسانی سے اپنے پھوہڑ پن کا اعتراف کیا تھا۔

"ارے چندا! وہ زمانے اور تھے جب ہم کمال کیا کرتے تھے اور پھر کمال بھی کیا، اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کا ایک طریقہ ہے یہ بھی۔ گھر گھر میں غربت اور افلاس کا یہی عالم ہے انسان کس کس کے سامنے اپنا رونا روئے۔ اور میں تو کہتی ہوں سعدیہ! لباس چھوٹا بھی ہو تو سمٹ کر تن ڈھانپ لینا چاہیے۔ جسم ننگا ہوگا تو اپنی لیے ہی باعث شرمندگی ہوگا نا۔ تو کوشش کیا کرو کہ بہ وقت ضرورت جو بھی چیز میسر آئے اسے اس انداز سے استعمال کرو کہ لوگ تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ خیر اب تم ایسا کرو یہ تھوڑی بہت چیزیں جو بکھری ہیں انہیں سمیٹ لو۔"

دادی نے کہا تو وہ جو بہت غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی، ایک دم چونک گئی۔

"یہ کچرا اٹھا کر ابھی کوڑے دان میں ڈال دو۔" دادی نے اپنی بات کہنے کے بعد غور کیا تھا کہ کچن میں کوڑے دان سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

'خیر یہ کام پھر کسی وقت کے لیے سہی۔' وہ چونکہ کافی تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ اس باقی کام کو اگلے وقت پر ڈال کر خود کچن سے باہر آ گئیں۔

○ ○ ○

اگلا دن بہت مصروفیت میں گزرا تھا، کیونکہ جوں ہی سعدیہ صفائی ستھرائی سے فارغ ہوئی تھی دادی اسے ساتھ لے کر کچن میں گھس گئی تھیں اور سب سے پہلے الماری کا تمام سامان نکال کر فرش پر ڈھیر کیا تھا۔ گھی کے خالی ڈبے، اچار کی خالی شیشیاں اور بوتلیں سب الم غلم نکال کر الماری کو خالی کیا۔ دالیں لفافوں میں پڑی تھیں اور چند ایک ڈبے جو دالوں کے لیے استعمال ہوتے تھے وہ جوں کے توں خالی پڑے تھے۔ دادی اماں نے چوکی پہ بیٹھے بیٹھے ضرورت کی کچھ چیزیں الگ کیں اور فالتو سامان اکٹھا کر کے فاروق کے ہاتھ کباڑیے کو بھجوا دیا۔ اس کے بدلے جو روپے ملے ان سے محلے کی دکان سے ہی پلاسٹک کے چھوٹے بڑے ڈبے منگوا لیے گئے تھے۔

سعدیہ کا جوش و خروش تو دیدنی تھا۔ وہ گھر میں ایسی ہی تبدیلی چاہتی تھی۔ سو اب بھی دادی کی ہدایت کے مطابق الماری کی خوب جھاڑ پونچھ کر کے اس میں اخبار بچھا رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو دادی نے دالیں صاف کرنے پر لگا دیا۔ ساتھ میں فاروق اور ظفر کو بھی بٹھا لیا۔ خود دادی اماں کی نظر تو اس قابل نہیں تھی سو انہوں نے بچوں کو کہانی سنانی شروع کر دی تھی۔ تاکہ وہ بور ہو کر

بھاگ نہ نکلیں اور وہی ہوا کہ جب تک دادی اماں کہانی سناتی رہیں بچے بڑے اطمینان سے دالوں میں سے کنکر چننے میں مصروف رہے تھے اور جوں ہی دادی خاموش ہوئیں وہ فوراً وہاں سے کھسک گئے یہ اور بات ہے کہ وہ اسی وقت خاموش ہوئی تھیں جب دالیں ختم ہو گئی تھیں۔

دالوں کو ڈبوں میں ڈال کر انہیں ترتیب سے الماری میں رکھ دیا گیا تھا جو تھوڑی بہت دالیں مختلف لفافوں میں بڑی ضائع ہو رہی تھیں۔ انہیں سعدیہ نے ملا کر بھگو دیا تھا تاکہ رات کو پکا سکے۔

اس کے بعد برتنوں کی باری آئی تھی۔ تمام برتن دھو کر، خشک کرنے کے بعد الماری میں ترتیب سے لگائے جو برتن اضافی تھے انہیں ایک ٹوکری میں رکھ کر دادی نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ تینوں وقت کھانے پر صرف یہی برتن استعمال ہوں گے۔ اس کے بعد دادی اماں نے اچار کی خالی شیشیاں اور چٹنی کی شیشیاں خوب اچھی طرح دھو کر خشک ہونے کے لیے دھوپ میں رکھ دی تھیں اور گھی کا ایک بڑا سا ڈبہ لے کر اس کا ڈھکن کاٹ کر اسے کوڑے دان کے طور پر باورچی خانے کے کونے میں رکھوا دیا تھا۔ دوپہر سے شام تو ہو گئی تھی مگر باورچی خانے کی حالت سدھر گئی تھی۔ اس کے بعد سعدیہ نے رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی چنانچہ دادی اماں بھی اٹھ کر چھت پر چلی آئیں جہاں دھوپ ہلکی سی تپش کے ساتھ موجود تھی۔ وہاں جھلنگا سا چارپائی پر بیٹھ کر دادی اماں آئندہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دینے لگی تھیں۔

○ ○ ○

"دیکھو سعدیہ بیٹی! اگر غور کیا جائے تو گھر کے تمام افراد کی صحت کی زیادہ تر ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، اور اب ذرا سوچو کہ جہاں تم کھانا پکاتی ہو وہاں اگر میلے، جھوٹے برتنوں پر ہر وقت مکھیاں بھنبھناتی ہوں اور کوڑے دان سے کچرا باہر کو ابل رہا ہو تو ایسی صورت حال کا کھانے پر اور پھر کھانا کھانے والوں پر کیا اثر مرتب ہوتا ہوگا؟ لہٰذا میری ایک نصیحت پلے سے باندھ لو بیٹی کہ رات کو باورچی خانہ چھوڑنے سے پہلے جھوٹے برتن ضرور دھو لینے چاہئیں اور کوڑے دان سے کچرا پھینک کر اسے دھو کر اوندھے منہ رکھ دینا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے دن بھر کے کام کاج کے بعد اس وقت ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فوراً سے پیشتر اپنے بستر میں جا گھسے، لیکن صبح بیدار ہونے کے بعد گندا سندا کچن دیکھ کر جو کوفت ہوگی وہ یقیناً اس تکلیف سے بہت زیادہ ہوگی۔ اور پھر اگر تمہاری جگہ کوئی اور باورچی خانے میں کام کرنے کے لیے آئے تو جہاں دوسرا فرد تمہارے بارے میں بہت غلط انداز سے سوچے گا وہاں خود تمہیں بھی بہت شرمندگی ہوگی۔ اور جب گھر کے سب افراد ناشتے کے منتظر ہوں گے اور تمہیں ناشتے کے لیے دھلے دھلائے برتن نہیں ملیں گے تو ذرا

تصور کرو کہ افراتفری کا عالم کیا ہوگا؟''

''تصور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اماں! ہمیشہ سے یہی تو ہوتا چلا آیا ہے۔'' دادی اپنی بات کہہ کر خاموش ہوئیں تو وہ بہت مایوسی سے بولی تھی۔

''ہاں۔ لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر تم میری باتوں کو پلے سے باندھ لو تو یقین مانو چندا کہ تمہاری سہیلیاں، رشتے دار، گھر والے سب تمہاری عقل اور سلیقے کی داد دیں گے اور یہ ایسی باتیں نہیں کہ ایک دو دن کام آئیں پھر سب ختم۔ یہ تو وہ سبق ہے جو اگر خوب اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو گی تو ساری عمر کام آئے گا۔'' دادی نے کہا تو سعدیہ نے فوراً ان کی تائید کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے سعدیہ! تم سوچتی تو ہوگی کہ دادی خوانخواہ ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔''

انہوں نے بغور سعدیہ کو دیکھتے ہوئے وہ بات کہہ ڈالی تھی جو کافی دنوں سے ان کے دماغ میں آ کر کھلبلی مچا دیتی تھی۔

''ارے نہیں دادی اماں! ایسا تو سوچیے گا بھی مت۔ آپ تو مجھے وہ راستہ دکھا رہی ہیں، جس پر چلنے کی مجھے ایک عرصے سے خواہش تھی۔ میں تو ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی کہ مجھ جیسی لڑکیاں جو زندگی کے دوسرے میدانوں میں کوئی اعلا کارکردگی نہیں دکھا سکتیں انہیں کم از کم گھر گرہستی میں ضرور طاق ہونا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کیونکہ اگر ایک عورت اپنے گھر کے افراد کو پرسکون ماحول مہیا کرتی ہے۔ اپنی آئندہ نسل کی بہترین تربیت کرتی ہے تو میرے خیال میں اس سے بڑھ کر اعلا کارکردگی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور جو عورت یہ دونوں کام احسن طریقے سے انجام دیتی ہے وہ گویا اس معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔''

''یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں دادی، پوتی میں جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہیں۔''

رات کا وقت تھا۔ برابر چارپائی پر لیٹی زبیدہ خاتون ان کی مسلسل آتی آوازوں سے ڈسٹرب ہوئیں تو کروٹ بدلتے ہوئے کہے بغیر نہ رہ سکیں۔ سعدیہ اور دادی اماں نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر استادی، شاگردی کا کام ملتوی کرتے ہوئے سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

صبح وہ تھوڑا جلدی بیدار ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے حسب معمول نماز پڑھی اور پھر کچن میں آ گئی تھی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور چائے کے تیار ہونے تک آٹا بھی گوندھ لیا تھا۔ پھر کمرے میں آ کر ابا کے جوتے، کپڑے، جرابیں، رومال، بنیان ایک جگہ رکھے باقی سب بھائیوں کے

یونیفارم بھی تیار شدہ حالت میں تھے۔ تب اس نے پانی گرم ہونے کے لیے رکھا اور دوسرے چولہے پر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ پراٹھے بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھے پھر گرم پانی غسل خانے میں رکھا اور سب کو بیدار کرنے کے بعد باورچی خانے میں دسترخوان بچھا کر ناشتے کا سارا سامان اس پر رکھ دیا تھا۔

دادی کے ساتھ رہ رہ کر، ان کی باتیں سن سن کر خود اس کا اپنا دماغ بھی خوب کام کرنے لگا تھا۔ سو دادی، اماں اور ابا کو کمرے میں ناشتا دے کر وہ خود صفائی میں جت گئی تھی اور جب تک سب لوگ اپنے اپنے کاموں کو سدھارے، وہ دو کمروں کے سوا صفائی کا باقی کام نمٹا چکی تھی اور خلاف عادت وہ مرغیوں کو دانا ڈالنا بھی نہیں بھولی تھی۔ صحن میں ابھی دھوپ صرف دیواروں تک ہی آئی تھی، چنانچہ پہلے اس نے برتن دھونے کا کام کر لیا تھا اور جوں ہی دھوپ نکلنے پر دادی اماں کمرے سے باہر اور اماں سبزی لینے گھر سے نکلی تھیں۔ وہ کمروں میں گھس گئی تھی اور اماں کے سبزی لانے تک بالکل فارغ ہو چکی تھی۔ اپنے اس حیرت انگیز کارنامے پر وہ خاصی خوش نظر آ رہی تھی۔ دادی اماں بھی قدرے مطمئن تھیں۔

''سعدیہ! ٹوکری اور چھری لاؤ بھئی۔ میں سبزی تیار کر دوں۔'' اماں نے ایک مرتبہ پھر سعدیہ کی پریڈ کروائی تھی، مگر دادی نے بے اختیار ہی انہیں روک دیا تھا۔

''رہنے دو بہو! سبزی اسے دو، یہ خود ہی بنا لے گی۔'' دادی کے کہنے پر سعدیہ نے اماں کی آنکھوں سے جھلکتی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے سبزی ان سے لے لی تھی۔

''سبزی بنانے سے پہلے دھونے والے کپڑوں کو سرف میں بھگو دو۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے سعدیہ نے دادی کی آواز سنی تھی۔ کپڑے بھگونے کے بعد وہ پیاز کاٹ رہی تھی جب دادی نے کچن میں جھانکا۔ وہ پیاز کاٹنے کے بعد گوبھی کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

''اگر اپنی اماں کی طرح کام کرو گی تو ایک گھنٹہ سبزی بنانے میں لگے گا اور ایک گھنٹہ پکانے میں۔ پیاز براؤن ہونے کے لیے ہلکی آنچ پر رکھ لو اور باقی سبزی کاٹ لو۔''

دادی اتنا کہہ کر لوٹ گئی تھیں۔ سعدیہ نے کھسیا کر اپنے سر پہ ہاتھ مارا اور پھر پیاز چولہے پر رکھ دی اور پھر بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی وہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ اب کپڑوں کی باری تھی جنہیں پہلے سے بھگو دینے کی وجہ سے زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑی تھی۔ کپڑے پھیلانے کے بعد اس نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے تھے۔ بالوں کو سمیٹ کر چٹیا کی شکل دی تھی۔ اپنا صاف ستھرا حلیہ خود اسے تو بہتر لگا ہی تھا مگر بھائی بھی نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

''اوہو! دیکھنا ذرا بچے اپنی ماؤں سے عیدی مانگنا نہ شروع کر دیں۔'' احمد نے اسے دیکھتے ہی

کہا تھا۔
’’ہیں......آپی! آپ کو کیا ہوا ہے؟‘‘ ظفر نے حیرت سے کہا تھا۔ وہ ڈھیٹ بنی مسکراتی رہی۔
مگر جب فاروق نے گھر میں داخل ہوتے ہی بڑے تجسس سے پوچھا تھا کہ
’’آپ! کہیں جارہی ہیں؟‘‘ تو وہ روہانسی ہو کر رہ گئی تھی۔
’’لو......اب کیا میں نہا کر کپڑے بھی نہیں بدل سکتی۔‘‘ وہ پاؤں پٹخ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی اور سوکھے کپڑے اتارنے لگی تھی۔ کپڑے رکھنے کمرے میں گئی تو دادی اماں پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس الماری کو بھی پوسٹ مارٹم کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ اگلی صبح یہ مہم بھی سر کر لی گئی۔ تمام غیر ضروری کپڑے جو الماری میں خوامخواہ جگہ گھیرے رکھتے تھے انہیں الگ کر دیا گیا تھا۔ باقی کپڑے تہہ کر کے رکھ دیئے گئے۔ ایک خانے میں احمد اور ابا کے کپڑے تھے، دوسرا خانہ ظفر اور فاروق کے کپڑوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ تیسرے میں حسن، سعدیہ اور اماں کے کپڑے تھے۔ آخری خانے میں گھر بھر کے تکیوں کے غلاف، بستر کی چادریں اور دوسرے کورز وغیرہ ڈھونڈ کر رکھ دیئے تھے اس کے علاوہ ازار بند، رومال، جرابیں اور دیگر چھوٹی چیزیں جن کے گم ہونے کا خدشہ رہتا ہے وہ ایک شاپر میں باندھ کر رکھی گئی تھیں۔

سعدیہ اس بات پر خاصی پریشان تھی کہ غیر ضروری اور ناقابل استعمال کپڑوں کا جو ڈھیر پڑا ہے آخر اس کا کیا کیا جائے۔ مگر دادی اماں اس معاملے میں بھی بہت مطمئن تھیں اور مطمئن کیوں تھیں اس بارے میں سعدیہ کو بعد میں معلوم ہوا تھا، جب انہوں نے چھوٹے چھوٹے رومال بنا کر اسے دیئے کہ جب بھی ہنڈیا بنائی جائے یا دودھ ابالا جائے ان رومالوں سے ہنڈیا یا دیگچی کو ڈھانپ دیا جائے تاکہ وہ مکھیوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس کے علاوہ کچھ ٹرے کورز، ایک دو میز پوش بنائے گئے تھے جن پر دادی کا خیال تھا کہ اگر کڑھائی کر لی جائے تو نہایت خوب صورت لگیں گے۔ سعدیہ کے ذہن نے بروقت کام کیا تھا اور اس نے محلے کی ہی دکان سے فیبرک پینٹس منگوا لیے تھے جو نہ صرف بے حد سستے تھے بلکہ دیکھنے میں خوبصورت بھی لگتے تھے۔ چنانچہ کسی پر کوئی خوبصورت منظر پینٹ کیا گیا اور کسی پر مختلف رنگوں کے پھول بنائے گئے تھے۔ چونکہ یہ تمام مردانہ کپڑے یا اسکول یونیفارم سے کاٹ کر بنائے گئے تھے، اس لیے فیبرک پینٹس ان پر خوب جچ رہے تھے۔ جو رنگ دار یا پھول دار کپڑے تھے ان سے دو تین بڑے بڑے رومال بنا کر کچن میں رکھ دیئے تھے۔ ایک کپڑا کھانا وغیرہ بنانے کے بعد چولہا صاف کرنے کے لیے تھا، جو چولہے کے پاس رکھا گیا تھا اور جسے ہر روز دھونے کی تاکید بھی دادی نے کی تھی۔ دوسرا دھلے ہوئے برتن خشک کرنے کے لیے تھا۔ ایک

دو سوٹ ایسے بھی تھے جو خاصی اچھی حالت میں تھے، مگر سائز چھوٹا ہونے کی بنا پر یوں ہی پڑے رہتے تھے۔ انہیں اٹھا کر ٹرنک میں رکھا گیا تھا کہ یہ پھر کسی کام آجائیں گے۔
غرض اسی طرح محض دو ماہ میں گھر میں حیرت انگیز مگر نہایت خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ دادی اس بات پر بے حد خوش تھیں کہ سعدیہ گھر گرہستی کا ذوق وشوق رکھتی تھی۔ دادی اماں نے اس کو انگلی تھام کر چلنا سکھایا تھا مگر وہ بھاگنے لگی تھی۔ انہوں نے اپنے تجربے سے کام لیتے ہوئے اسے دس چیزیں سکھائی تھیں تو سعدیہ نے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر دس کو بیس بنا دیا تھا۔ دادی کروشیے کا کام اچھی طرح جانتی تھیں۔ سعدیہ نے ایک ہی دن میں یہ ہنر بھی حاصل کر لیا تھا اور پھر ایک ہفتے میں اس نے کروشیے سے اون کی نہایت خوبصورت ٹوکری تیار کر لی تھی۔ اسے مضبوط بنانے کے لیے اس نے اندر کی سائڈ پر موٹا سا گتہ لگا دیا تھا۔ دیکھنے میں یہ نہایت خوب صورت ڈیکوریشن پیس کا تاثر دیتی تھی۔ لیکن سعدیہ نے اس میں سلائی کا تمام سامان رکھنے کے ساتھ ساتھ نیل کٹر، انچی ٹیپ جیسی چیزیں بھی رکھ دی تھیں جن کو ڈھونڈنے کے لیے اس سے پہلے اسے پورا گھر چھاننا پڑتا تھا۔ ہاں البتہ ایک چیز سے وہ اب بھی سخت نالاں تھی وہ یہ کہ بچوں کی کتابیں، کاپیاں اور بستے یوں ہی چارپائیوں پر بکھرے رہتے تھے۔ دادی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔
’’اگر بچوں کے پاس کتابیں رکھنے کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوگا تو وہ ایسا ہی کریں گے۔‘‘
’’لیکن اب مستقل ٹھکانا کہاں سے لایا جائے؟‘‘ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔
دادی اماں چند لمحے کے لیے سوچتی رہیں، پھر پورے گھر کا جائزہ لیا جو دو کمرے زیر استعمال تھے، ان میں ہر ایک میں دو دو الماریاں بنی ہوئی تھیں۔
’’سعدیہ! یہ کمروں میں دیواروں کے بیچ جو الماریاں ہیں۔ ان میں کون سی چیزیں پڑی ہیں۔‘‘
’’کچھ بھی نہیں۔ پرانی کتابیں اور اخبار وغیرہ ہیں۔‘‘
’’بس پھر تو کام بن گیا۔‘‘ دادی کے معنی خیز لہجے پر سعدیہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر ان کی بات سمجھ کر ایک دم کھل اٹھی۔
اگلے روز فراغت پاتے ہی سعدیہ ردی جمع کرنے میں لگ گئی تھی۔ دادی دروازے کے آس پاس منڈلانے لگیں۔ زبیدہ خاتون حسب معمول محلے کی سیر کو نکلی ہوئی تھیں۔
ردی والا آیا تو دادی نے ساری ردی اس کے حوالے کر دی۔ اس سے جو پیسے ملے ان میں کچھ پیسے مزید شامل کیے اور ہمسائے کے لڑکے کو ساتھ لے کر باہر نکل گئیں۔ ارادہ تو بازار جانے کا

تھا مگر جب ہمسائے کے لڑکے کی زبانی معلوم ہوا کہ یہیں دو گلیاں چھوڑ کر ایک نرسری موجود ہے تو وہ سیدھی ادھر کو ہو لیں۔ واپس آئیں تو نرسری کا ایک آدمی سائیکل پر ادھر ادھر لٹکتے تھیلوں میں گملے رکھے ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ گھر میں گملوں سمیت داخل ہوئیں تو سعدیہ حیرت زدہ سی آگے بڑھی تھی۔

"دادی اماں۔ یہ کیا؟" چھوٹے بڑے کتنے ہی گملے تھے۔ کسی میں بیل لگی ہوئی تھی تو کسی میں پھولدار پودے۔

"بس بیٹی! اچانک ہی ارادہ بن گیا۔ سوچا گھر میں سبزہ ہو تو آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ گملے اٹھا لائی اور پھر سستے بھی تو مل رہے تھے۔ یہ جو چھوٹے چھوٹے ہیں، ان میں سے کوئی پندرہ روپے کا ہے تو کوئی بیس روپے کا۔ بس پھر میں تو اٹھا لائی۔"

"بہت اچھا کیا۔ مجھے تو خود بہت شوق ہے گھر میں گملے رکھنے کا۔" سعدیہ نے کہا اور گملے رکھنے کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے لگی۔

احمد اور فاروق وغیرہ اسکول سے واپس آئے تو وہ سیدھی انہیں کمرے میں لے گئی۔ صاف ستھری الماریاں اور ان پر لٹکتے جالی کے پردے۔ فاروق کی تو گویا عید ہو گئی۔ فوراً اپنے جمع شدہ اسٹکرز نکال کر الماری سجانے لگا۔ اپنے رنگین مارکرز، ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویریں، بچپن کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے۔ اس نے سب کے سب الماری میں رکھ لیے تھے۔ احمد بھی کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اپنی چیزیں رکھنے کے لیے کسی مستقل ٹھکانے کی تلاش میں رہتا تھا۔ ظفر اور حسن کا بھی یہی حال تھا۔ سعدیہ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر باہر نکلی تب ہی اماں چلی آئیں۔ ایک مٹھی میں مونگ پھلی دبا رکھی تھی کڑکڑ کرتی آ رہی تھیں۔ چند چھلکے ڈیوڑھی میں پھینکے، چند صحن میں، باقی سعدیہ سے گملوں کی بابت پوچھتے ہوئے برآمدے میں بکھیر دیئے۔ دادی نے دیکھا تو بے اختیار ٹوک دیا۔

"اے بہو......! بچی نے اتنی محنت سے صفائی کی تھی اور تم پھر سے گند ڈالنے لگی ہو۔"

جواباً زبیدہ خاتون نے لاپروائی سے انہیں دیکھا بے نیازی سے آخری چھلکا بھی ہوا میں اچھالا اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے ان کے برابر آ بیٹھیں۔

"کچھ نہیں ہوتا اماں تھوڑے چھلکے ہی تو ہیں۔ اٹھا لے گی۔ اور یہاں کون سا وزیر دورے پر آ رہے ہیں جو ہنگامی حالت نافذ ہو۔ ویسے اماں مونگ پھلی تھی بڑی میٹھی۔ سکینہ کا بیٹا بازار سے لایا تھا... نہ یہاں تو کسی کام کی نہیں ملتی۔"

زبیدہ خاتون کی اپنی ہی دلچسپیاں تھیں اور جب سے دادی یہاں آئی تھیں وہ گھر کی طرف

سے زیادہ ہی لاپرواہ ہو گئی تھیں۔ دادی نے بس ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر ان کی بے تکی باتیں سننے لگیں۔



رمضان کی آمد میں محض چند دن رہ گئے تھے، لیکن گھر میں اس کے استقبال کی کوئی خاص تیاریاں دیکھنے میں نہیں آ رہی تھیں۔ دادی نے سرسری سے انداز میں بہو سے ذکر کیا تو جواباً انہوں نے کہا تھا۔

"تیاری کیا کرنی ہے اماں! رمضان آئے گا اور روزے رکھ لیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"لیکن پھر بھی بہو! ماشاء اللہ بھرا پرا گھر ہے کچھ آنے جانے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ افطاری...... سحری...... آخر کچھ تو انتظام کرنا چاہیے نا؟" دادی نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ہاں وہ تو میں سعدیہ کے ابا سے کہہ دوں گی۔ سارا سودا سلف وہی لے آئیں گے۔"

"اے لو......ارے اسے کیا معلوم کیا کیا چیزیں خریدنی ہیں۔ کتنے داموں میں خریدنی ہیں۔ وہ تو سارے پیسے بھاڑ میں جھونک آئے گا۔ جتنے پیسے کسی نے مانگے اتنے دے دیئے۔" وہ بیٹے کی قلندرانہ صفت سے خوب واقف تھیں۔

"ایسی بھی بات نہیں اماں! پہلے بھی سارا راشن وہی لے کر آتے ہیں۔" زبیدہ خاتون نے انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔

"اسی لیے تو ساری تنخواہ دال، مرچ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

انہوں نے جل کر کہا تھا۔ بہو کی گھریلو معاملات میں عدم دلچسپی انہیں کبھی بھی پسند نہیں آئی تھی اور نہ ہی کبھی بہو نے یہ سننے سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ یہ بڑی اماں کہتی کیا ہیں۔ چنانچہ دادی بھی خاموش ہو رہی تھیں۔ لیکن دو روز بعد جب تنخواہ ملنے پر سعدیہ نے اماں کی بنوائی ہوئی سودا سلف کی لسٹ ابا کے ہاتھ میں دی تھی تو دادی نے بڑے آرام سے وہ لسٹ اور روپے فیضان سے لے لیے تھے۔

"یہ خریداری میں خود کروں گی۔" انہوں نے بڑے مان سے کہا تھا۔ فیضان کے سر سے تو بوجھ اتر گیا تھا بخوشی انہیں پیسے تھما دیئے۔ اگلے روز وہ احمد کے سر ہو گئیں کہ وہ انہیں بازار لے کر جائے۔ احمد نے شام تک کا کہہ کر ٹال دیا۔ شام ہوئی تو اگلی صبح کا کہہ کر دامن بچا گیا۔ دادی کو خوب علم ہو گیا تھا کہ وہ کنی کترا رہا ہے لہٰذا اگلی شام جب احمد گھر میں داخل ہوا تو وہ اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئیں۔ احمد بس گردن کھجاتا رہ گیا۔

"دادی! اب اس عمر میں آپ بازار میں کہاں خوار ہوں گی۔ لائیں میں چیزیں لا دیتا ہوں۔"

"اس عمر میں......! کیا مطلب ہے بھئی تمہارا......؟ کیا میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ ہیں؟ ارے بوڑھا تو وہ ہوتا ہے جس کے بدن میں دم خم نہ رہے، ارے میرے ہاتھ پاؤں تو آج بھی جوانوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ دماغ اور نظر اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ دانت بھی بتیس کے بتیس پورے ہیں۔ تمہاری اماں سے زیادہ بوڑھی نہیں ہوئی ہیں، ہاں۔"

دادی کہتے کہتے بیرونی دروازہ پار کر گئی تھیں۔ احمد نے بے چارگی سے پلٹ کر سعدیہ کو دیکھا اور پھر دعائے خیر کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ جبکہ سعدیہ اس کی عقب میں مسکراتی رہ گئی تھی پھر وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ رفتہ رفتہ شام کی سرخی سیاہی میں بدلنے لگی تھی۔ وہ رات کا کھانا پکا کر فارغ ہوئی تو احمد اور دادی اماں کے انتظار میں ڈیوڑھی کے چکر لگانے لگی۔ کافی دیر ہوگئی تھی انہیں گئے ہوئے۔ وہ فکر مند سی ہوگئی۔

کافی انتظار کے بعد خدا خدا کر کے بیرونی دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے احمد اندر داخل ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے تھیلوں میں لدا پھندا۔ ماتھے پہ تیوریاں، منہ غبارے کی طرح پھولا ہوا۔ سعدیہ نے فوراً آگے بڑھ کر سامان اس کے ہاتھوں سے لینا چاہا مگر وہ پاؤں پٹختا ہوا برآمدے میں گیا اور سارا سامان وہیں ڈھیر کر کے خود کمرے میں گھس گیا۔

"احمد......! دادی اماں کو بازار میں چھوڑ آئے ہو کیا؟" دادی کو اس کے پیچھے نہ آتے دیکھ کر وہ فوراً اس کی طرف لپکی۔

"اگر چھوڑ بھی آیا ہوں تو فکر نہ کرو، بازار انہیں خود یہاں چھوڑنے آ جائے گا۔ کیونکہ وہ بھی انہیں زیادہ برداشت نہیں کر سکے گا۔" احمد نے خاصے جلے بھنے انداز میں کہا تب ہی بیرونی دروازے میں دادی ایک "ہائے" کے ساتھ نمودار ہوئی تھیں۔ سعدیہ نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور تھام کر کمرے میں آ گئی۔

"اف سعدیہ بیٹی! تھکن سے میرا تو برا حال ہوگیا۔" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہی اپنے پاؤں جوتوں کی قید سے آزاد کیے اور انہیں انگوٹھوں کی مدد سے مسلنے لگیں۔

"آپ بھی تو خود کو جوان ثابت کرنے پر تل گئی تھیں دادی اماں۔" احمد نے جان بوجھ کر انہیں چھیڑا۔

"تم تو خاموش ہی رہو۔" انہوں نے پہلے احمد کو گھورا پھر سعدیہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"سارا وقت اس لڑکے نے تنگ کیے رکھا مجھے۔ اب دیکھو نا اشیاء کی جانچ پرکھ میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے نا۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ بندہ الم غلم چیزوں پر پیسے خرچ کر کے مطمئن ہو جائے اور

دکاندار......توبہ...... گاہک کو تو بے وقوف سمجھ لیتے ہیں۔"

وہ دکانداروں کو کوسنا شروع ہوگئیں تو سعدیہ ان کے لیے کھانا لینے کچن میں آ گئی۔ وہاں اماں بیٹھی سارے سامان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی منہ بنایا اور ہاتھ میں پکڑا تھیلا کئی فٹ دور کھسکا دیا۔

"اللہ جانے کیا الم غلم اٹھا لائی ہیں۔ یہ گاجر، مولیاں، آلو...... میں نے تو ایسا کچھ نہیں لکھوایا تھا۔ اپنی مرضی سے ہی اٹھا کر لے آئیں۔ سارے پیسے برباد کر کے رکھ دیے۔ اب اس عمر میں انہیں کچھ کہوں تو میں ہی بری بنوں گی نا؟"

اماں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ سعدیہ نے حیران ہوتے ہوئے سامان کا ازسرنو جائزہ لیا۔ اکثر چیزیں ان کی بنائی گئی لسٹ کے مطابق نہیں تھیں۔

"اگر دادی یہ سب چیزیں لائی ہیں تو یقیناً فائدہ مند ہی ہوں گی۔ دادی جیسی خاتون پیسے برباد کریں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" سعدیہ کسی صورت بھی دادی کے خلاف غلط نہیں سوچ سکتی تھی۔ اور اس کی یہی سوچ اگلے روز بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔



سعدیہ کی توقع کے برعکس اگلی صبح دادی اماں بالکل ہشاش بشاش تھیں۔ گزشتہ رات کی تھکن کے ان کے چہرے پر آثار تک نہ تھے۔ وہ روزمرہ کے کام کاج سے فارغ ہوئی تو دادی نے اسے آواز دے کر کچن میں بلا لیا۔ اماں خفا خفا سی دھوپ میں چادر لیے لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ کچن میں آئی تو دادی نے تھیلے میں سے گاجریں نکال کر اس کے حوالے کر دیں۔

"انہیں خوب اچھی طرح دھو کر ان کا چھلکا کھرچ دو۔"

"لیکن دادی اماں اس کا کرنا کیا ہے؟"

"تمہاری ماں نے بازار کا اچار لانے کو کہا تھا مگر وہ تو یونہی برتنوں میں کھلا پڑا تھا۔ میرا دل نہیں چاہا لینے کو۔ جو اچار شیشیوں میں بند ملتا ہے ایک تو مہنگا تھا پھر اتنا کم تھا کہ دس پندرہ روز میں ہی ختم ہو جاتا لہٰذا میں مولی، گاجریں لے آئی ہوں۔ گھر میں اچار بنا لیں گے۔ صاف ستھرا ہوگا اور مہینہ بھر آرام سے چل جائے گا۔"

دادی اماں نے مولیاں بھی ٹوکری میں رکھتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ان کی عقلمندی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی اور پھر ان کے ساتھ مل کر اچار بنانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ کافی وقت لگے گا اس کام میں لیکن دادی نے تو اس کام کو بھی چٹکی بجا کر تمام کر دیا تھا۔ گاجروں اور مولیوں کو دھو کر چھیلنے کے

بعد انہوں نے اسے مناسب سائز میں کاٹ کر سرسوں کے تیل سے نکال کر ٹھنڈا کرنے کے بعد ان پر اندازے سے ہی پسی ہوئی سرخ مرچ، نمک اور ٹاٹری چھڑک دی تھی۔ پھر اسے اچار کی شیشیوں میں ڈالنے کے بعد اس میں سرسوں کا وہی تیل ڈال دیا تھا جس میں وہ فرائی کی گئی تھیں۔

”لو بھئی، مجھے یقین ہے کہ اتنا مزیدار اور جھٹ پٹ تیار ہونے والا اچار تم نے کبھی نہیں کھایا ہوگا۔“ دادی نے کہا تو وہ ایک دم حیران ہوگئی۔

”ہیں۔ تو کیا یہ تیار ہو چکا ہے؟“

”ہاں بالکل۔ چاہو تو ابھی کھا کر دیکھ لو اور ہاں یہ بھی بتا دوں کہ اگر تمہیں پسند ہو تو مٹر کے دانے نکال کر انہیں تیل میں ہلکا سا فرائی کرنے کے بعد تم اس اچار میں شامل کر سکتی ہو، تمہیں یقیناً وہ بہت مزے کے لگیں گے۔“

دادی کے کہنے پر اس نے فوراً اچار چکھا تھا اور ہلکی سی کھٹاس لیے ہوئے یہ اچار واقعی بہت لذیذ تھا۔ سحری کے لیے دادی نے یہ اچار بنا دیا تھا اور افطاری کے لیے املی کی چٹنی بنا کر بوتلوں میں بھر دی تھی۔

سعدیہ نے دادی کے کہنے پر تمام مسالے پیس کر رکھ لیے تھے اور پہلے روزے میں رات کو ہی سحری کا زیادہ تر انتظام کر لیا تھا تاکہ صبح اگر دیر سے آنکھ کھلے تب بھی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شام کو افطاری کے وقت اس نے دادی کی مدد سے گھر میں سموسے تیار کیے تھے جو سعدیہ کی توقع کے برعکس بہت ہی اچھے بنے تھے۔ دادی کے لیے تو یہ عام سی بات تھی کہ وہ اور ثریا اکثر ہی سموسے گھر پر تیار کر لیا کرتی تھیں۔ سعدیہ البتہ اپنی کارکردگی پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ جتنے پیسوں میں بازار سے سموسے لا کر بانٹ بانٹ کر کھائے جاتے تھے اتنے ہی پیسوں میں سب گھر والوں نے جی بھر کے سموسے کھائے بھی بلکہ آس پڑوس میں بھی بھجوائے تھے۔ اس کی دیکھا دیکھی مینا نے بھی کوشش کی مگر بری طرح ناکام ہوئی نتیجتاً خوب ڈانٹ کھائی اپنی بے بے سے۔

”میں نے کہا تھا ناں کتابیں پڑھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ گُر تو ماؤں کے سکھانے سے ہی آتے ہیں۔“ سعدیہ کو دادی کی بات سے پورا اتفاق تھا مگر اماں کا منہ بن گیا تھا۔

تب ہی ایک روز محلے کی ایک خاتون چلی آئیں۔ باتوں ہی باتوں میں وہ بچوں کی پڑھائی اور ان کی نالائقی کا رونا رونے لگیں۔ سعدیہ نے انہیں بچوں کو ٹیوشن رکھوانے کا مشورہ دیا تو جواباً انہوں نے یہ ذمہ داری اسی کے سر ڈال دی اور ڈالی بھی اس لجاجت بھرے لہجے میں کہ اسے ”ہاں“ کرتے ہی بنی۔ ٹیوشن فیس کی بات ہوئی تو سعدیہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ اس عورت کی گھر میں تین چار بھینسیں تھیں اور محلے کے ہر گھر میں ان ہی کے گھر سے دودھ جاتا تھا۔ چنانچہ

سعدیہ نے کہہ دیا کہ پیسے کے بجائے وہ ہر روز دودھ ان کے گھر پہنچا دیا کریں۔ وہ عورت بہ خوشی راضی ہوگئی اور اگلی ہی صبح خالص اور تازہ دودھ گھر میں آنے لگا۔ گوالے کا حساب کتاب کر کے اسے فارغ کر دیا گیا اور اس پانی ملے دودھ سے جان چھوٹنے پر سب ہی نے شکر ادا کیا تھا۔

شروع میں وہ سارا دودھ ابال کر رکھنے لگی مگر ایک تو روزے اور دوسرے کوئی بھی دودھ اتنے شوق سے نہیں پیتا تھا چنانچہ وہ روز رات کو کچھ دودھ کی سویٹ ڈش بنا لیتی اور باقی کو جاگ لگا کر دہی بنا لیتی۔ جو دہی سحری میں استعمال ہونے سے بچ جاتا اس کی لسی بنا کر مکھن نکال لیا جاتا۔ اب اتنی سردی میں لسی تو کوئی پیتا نہیں تھا سو دادی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد سعدیہ اس سے اپنے بال دھونے لگ گئی اور دادی کی ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ اتنے خوب صورت بالوں کی شکل میں سامنے آیا کہ اس نے دونوں گھٹنے ٹیک کر باقاعدہ طور پر دادی کو ”گرو“ مان لیا تھا کہ ان ہی کی بدولت اس کی زندگی ایک پرسکون ندی کی مانند رواں دواں ہوگئی تھی۔ وہ تو مطمئن تھی ہی، گھر والوں کی باتوں نے اسے مزید پراعتماد بنا دیا تھا۔ ابا میٹھے کے بہت شوقین تھے۔ رات کو مزے سے سویٹ ڈش لیتے اور ساتھ ہی کہتے۔

”لگتا ہے اس دفعہ شروع کی تاریخوں میں ہی تنخواہ پار ہو جائے گی۔“

”سعدیہ! تمہاری لاٹری نکل آئی ہے کیا؟ یا پھر قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟“

احمد کو بھی دوستوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑتا تھا، اس لیے ہر وقت خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتا رہتا۔ ہر روز نیا صاف ستھرا لباس پہن کر باہر نکلتا تو واپسی پر اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے آتا۔ اماں جو پہلے ہر وقت اسے کوسنے میں لگی رہتی تھیں اب ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کی تعریف کرتے نہ تھکتیں۔ اور سعدیہ دل ہی دل میں سارا کریڈٹ دادی اماں کو دے دیتی۔



ظہیر نعمان کا خط آیا تھا جس میں ثریا نے سارے گھر والوں کو رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہونے پر مبارک باد دی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دادی اماں کو بے حد تاکید بھی کی تھی کہ وہ عید سے قبل اپنی آمد کے پروگرام سے آگاہ کر دیں تاکہ ظہیر انہیں لینے کے لیے آ سکے۔ احمد نے خط پڑھ کر سنایا تھا اور یہ بات سنتے ہی سب لوگ چیخ اٹھے تھے کہ

”نہیں۔ دادی اماں اس دفعہ ہمارے ہاں عید منائیں گی۔“

”ارے نہیں بھئی۔ ثریا نے اتنے دن بھی جانے کیسے کاٹ لیے میرے بغیر۔ وہ تو میکے بھی جائے تو ایک آدھ دن میں ہی لوٹ آیا کرتی ہے کہ اماں پیچھے اکیلی ہوں گی۔“ دادی نے بڑے

میٹھے لہجے میں انکار کیا تھا پھر بھی سب کے منہ بن گئے۔

"لیکن دادی اماں! ہمارا بھی تو آپ پر کچھ حق ہے نا؟" ظفر نے فوراً انہیں یاد دلایا۔

"اور پھر ظہیر بھائی ہیں نا ان کے پاس۔" احمد نے بھی لقمہ دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن یہ لڑکے بالے ایسے موقعوں پر گھروں میں کب رہتے ہیں۔ وہ بھی نکل جائے گا اپنے دوستوں میں۔ ثریا بے چاری ہولتی رہے گی خالی گھر میں۔" دوطرفہ پرخلوص محبتوں کے اس مظاہرے نے انہیں عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا مگر بہو کی تنہائی کا احساس بھی شدت سے تھا جو ان کی عدم موجودگی کے باعث عید کے پرمسرت موقع پر یقیناً مزید بڑھ جاتا۔

"تو دادی اماں...... ایسا کرتے ہیں کہ تائی ثریا اور ظہیر بھائی کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اس دفعہ ہم سب لوگ عید اکٹھے منائیں گے۔ سچ بہت مزا آئے گا۔" احمد نے دادی کو سوچ میں پڑتے دیکھا تو فوراً مشورہ دے دیا۔ باقی سب نے بھی اس کی پرزور تائید کی تھی۔

"ہاں ایسا ہو تو سکتا ہے مگر......؟"

"مگر......؟"

"بیٹا اٹھنے بیٹھنے کی بہت تنگی ہو جائے گی۔ دو ہی تو کمرے ہیں گھر میں۔ پھر خرچ بھی پہلے سے بہت بڑھ جائے گا خوامخواہ میں......" دادی اماں بات کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتی تھیں۔

"دلیں دادی اماں یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" سعدیہ برا مان گئی تھی۔

"دل میں جگہ ہو تو گھر میں جگہ خود بخود بن جاتی ہے۔ باقی رہی خرچ کی بات۔ آنے والے اپنا رزق ساتھ لے کر آئیں گے۔ ہم خود روکھی سوکھی کھا لیں گے، مگر ان کی مہمان نوازی میں فرق نہیں آنے دیں گے۔ بس اب آپ جلدی سے انہیں خط لکھوا کر یہاں آنے کی دعوت دے دیں۔" سعدیہ نے انہیں قائل کر کے ہی چھوڑا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے بھئی۔ میں آج شام ہی اس کو ٹیلی فون کر دوں گی۔"

"ٹیلی فون کیوں دادی؟ خط لکھوا لیں نا؟" سعدیہ نے ان سے کہا مگر وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی تھیں۔

"جو بات میں نے اسے بتانی ہے وہ خط میں نہیں لکھی جا سکتی وہ بھی اس صورت میں جب کہ خط تم سے لکھوانا ہو۔"

انہوں نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگاتے ہوئے مبہم سی بات کی تھی۔ سعدیہ کو ان کی بات سمجھ میں تو نہیں آئی تھی مگر کریدا اس لیے نہیں تھا کہ اس وقت اس کے ذہن پر اک نئی فکر سوار ہو چکی تھی۔ گرمیوں میں پھر بھی سہولت رہتی تھی، مگر سردیوں میں وہ سب بمشکل چارپائیاں کمروں میں

ٹھونس کر پورے آتے تھے۔ رات گئے تک وہ اس مسئلے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر ایک فیصلہ کر کے اطمینان سے سو گئی۔ اگلے روز جب دادی اماں، فاروق کے ساتھ پی سی او پر فون کرنے گئیں تو صحن کے آخری کونے میں بنے اسٹور کو خالی کرنے کے لیے وہ کمربستہ ہو چکی تھی۔ یہاں پہلے صرف اماں کی جہیز کی پیٹیاں، صندوق اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے بعد میں کاٹھ کباڑ بھی اسی کمرے میں بھرتا چلا گیا اور بعد میں اسٹور کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اسٹور خالی کرنا شروع کیا تو کئی چیزیں ایسی نکل آئیں جو دادی کی ٹریننگ کے بعد اب کارآمد بنائی جا سکتی تھیں۔ انہیں نکال کر سعدیہ نے الگ کر لیا تھا۔ باقی کچھ مرمت کے قابل کرسیاں تھیں، کوئی ایک ٹانگ کی میز تھی، کچھ پرانے بیگ، پرانے جوتے اور اسی قسم کی الم غلم چیزیں جن میں کچھ تو اماں سے آنکھ بچا کر اس نے باہر پھنکوا دیں، باقی کا سارا سامان چھت پر موجود کوٹھڑی میں پہنچا دیا جہاں سردیوں کے لیے ایندھن وغیرہ رکھا جاتا تھا۔

دو دن کی لگاتار محنت کے بعد اس نے پانی کا پائپ لے کر فرش اور دیواروں کے ساتھ ساتھ چھت بھی دھو ڈالی تھی۔ یہ کمرہ باقی کمروں کی نسبت کافی کشادہ تھا۔ اماں کی پیٹیاں ایک دیوار کے ساتھ لگائیں تو چار چارپائیوں کی جگہ آسانی سے نکل آئی۔ اس نے کور ڈھونڈ ڈھانڈ کر دھوئے اور پیٹیوں پر ڈال دیئے۔ چارپائیوں پر چادریں بچھا کر تکیے رکھ دیئے۔ کمرے کی دائیں دیوار کے ساتھ ابھی بھی کافی جگہ بچ رہی تھی۔ وہاں اس نے اسٹور سے نکلی ہوئی ایک موٹی سی دری کو دھو کر، پیوندکاری کر کے بچھا دیا تھا۔ اوپر ایک چادر ڈال کر گاؤ تکیہ رکھ دیا تھا۔ گھر میں عبادت کے لیے بالخصوص رمضان کے دنوں میں پرسکون جگہ کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی، سو اب وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔

کمرے کی بساند دور کرنے کے لیے اس نے دونوں کھڑکیاں کھول کر کمرے میں اگربتی لگا دی تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں کا میل کچیل صاف کرنے کے لیے اس نے دادی کی ہدایت کے مطابق سرسوں اور مٹی کے تیل میں کپڑا بھگو کر ان پر رگڑا تھا جس سے وہ قدرے نئے معلوم ہونے لگے تھے۔ اسٹور کی صفائی کے دوران پیتل کے دو نہایت خوب صورت گلدان نکلے تھے مگر ان کا رنگ اس قدر سیاہ پڑ چکا تھا کہ اس نے یونہی اوپر کوٹھڑیوں میں پھینک دیئے بعد میں دادی سے سرسری انداز میں ذکر ہوا تو انہوں نے فوراً گلدان واپس منگوا لیے پھر سنگترہ کاٹ کر اس پر لیموں لگا کر گلدان پر رگڑا تو چند منٹ میں ہی گلدان خوب چمک اٹھے تھے۔

"یہ تو کمال ہو گیا بھئی۔" سعدیہ کمرے میں آتے جاتے گلدانوں کو دیکھتی تو بے اختیار کہہ اٹھتی۔

"یہ چھوٹے چھوٹے کمال ہی مل کر بڑا کمال دکھاتے ہیں سعدیہ بیٹی! لہٰذا انہیں اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔" دادی لگے ہاتھوں اسے نصیحت کرنے سے نہ چوکتیں۔

"چاقو، چھریوں کے دستے مسلسل استعمال سے سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ ان پر نمک اور لیموں رگڑا جائے تو ایک دم صاف ہو جائیں گے۔ لوہے کی چیزوں پر عموماً زنگ لگ جاتا ہے روئی کو سرکے میں بھگو کر زنگ پر پھیر دو اور پھر نتیجہ دیکھو۔" دادی کے بتانے پر وہ تمام ٹوٹکے آزماتی اور انہیں صد فیصد درست پا کر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ پاتی۔

"ارے عمر بھر سیکھا ہی کیا ہے اس کے سوا۔ ہمارے زمانے میں پڑھائی لکھائی کا تو رواج ہی نہ تھا بس بڑی بوڑھیاں چوبیس گھنٹے گھر داری کا سبق پڑھاتی رہتیں۔ اس وقت ان کی نصیحتیں نہایت بری لگتی تھیں مگر وقت آنے پر خود بخود ان کی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا۔"

دادی اپنے زمانے کی باتیں بتانے لگتیں اور وہ ہمہ تن گوش ہو جاتی۔

اس روز بھی یونہی باتیں کرتے کرتے دادی نے سنگترے کے چھلکوں کو نہایت باریک کاٹ کر سعدیہ سے انہیں دھوپ میں رکھنے کو کہا تو وہ بے دھیانی میں ہی ان کی بات پر عمل کرنے کے بعد اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ دھوپ ختم ہوئی تو دادی نے چھلکے اٹھا کر کمرے میں رکھ لیے۔ اگلے دو تین دن تک وہ مسلسل یہ چھلکے دھوپ میں سکھاتی رہیں پھر انہیں باریک پیس کر ایک پاؤ گیہوں کے آٹے میں ملا دیا۔ ساتھ ہی ایک پاؤ بیسن اور تھوڑی سی ہلدی بھی ملا دی اور لے جا کر سعدیہ کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ابھی ابھی قرآن پاک پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے دادی؟"

"ابٹن ہے۔"

"ہائیں۔ اس عمر میں آپ کو ابٹن کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"بے وقوف! یہ میرے لیے نہیں تمہارے لیے ہے۔ ابھی اور اسی وقت اس کی تھوڑی سی مقدار لے لو۔ ذرا سا سرسوں کا تیل اس میں ڈالو اور دودھ ڈال کر لئی سی بنا کر چہرے پر پندرہ بیس منٹ کے لیے مل لو۔" انہوں نے سختی سے ہدایت جاری کی تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"لیکن دادی...... میں...... اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی جبھی تو بنایا ہے۔ ذرا رنگت دیکھو اپنی کیسی جھلس کر رہ گئی ہے۔ ایک دم روکھی پھیکی حالانکہ بچپن میں تو اچھی بھلی تھیں تم۔ یہ صرف اور صرف تمہاری غفلت اور لاپروائی کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔ اور ہاں اسے احمد کی نظر سے بچا کر رکھنا وہ تم سے زیادہ خیال رکھتا ہے اپنا۔" وہ سختی سے

کہتی ہوئی باہر نکل گئیں اور آخری بات پر سعدیہ کے لیے اپنا قہقہہ دبانا محال ہو گیا تھا۔

○ ○ ○

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوا تو ساتھ ہی ثریا بیگم کی آمد کا انتظار بھی شروع ہو گیا۔ ثریا ظہیر کی بے تحاشا مصروفیت کے باوجود اسے ساتھ لے کر ہی آئی تھیں کیونکہ راستوں سے ناواقف تھیں۔ ظہیر ان کی ہدایت کے مطابق انہیں بڑے تایا کے ہاں چھوڑ کر واپس لوٹ گیا تھا اگر ثریا چاہتیں تو سیدھی فیضان کے پاس بھی جا سکتی تھیں، مگر وہ اپنی جٹھانیوں کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے پہلی رات ان ہی کے ہاں گزاری تھی۔

اگلے روز فیضان کے ہاں جانے کا پروگرام بنا تو بڑی تائی جھٹ سے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں اور جب وہ لوگ گھر سے باہر نکلیں تو بینا اور کامنی بھی ان کے ساتھ ہو لی تھیں۔ دل میں یہی ارادہ تھا کہ ایک ساتھ دھاوا بول کر غریب آباد کے غریبوں کا تماشا دیکھیں گے اور لطف اندوز ہوں گے۔ راستے بھر وہ دونوں بہنیں عجیب و غریب حرکات کرتی آئی تھیں۔ پہلے سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتیں اور پھر قہقہے لگانے لگتیں۔ ثریا بیگم ان کے انداز و اطوار دیکھ کر دل ہی دل میں پریشان ہوئی جا رہی تھیں۔

"اگر اماں نے ان ہی میں سے کسی کو پسند کر لیا ہو تو......؟" ان کے ذہن میں اماں کی بات گونج رہی تھی کہ "ثریا میں نے تمہارے لیے بہو تلاش کر لی ہے، تم بھی آ کر دیکھ لو۔"

خدا خدا کر کے فیضان کے گھر پہنچے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بڑی تائی دستک دیے بغیر اندر گھس گئیں تو ثریا بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے اندر چلی آئیں۔ انہوں نے حسب عادت سب سے پہلے گھر کا جائزہ لیا تھا۔ صاف ستھری ڈیوڑھی کی دائیں دیوار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گملے مناسب فاصلہ چھوڑ کر ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ صحن کی سامنے والی اور دائیں دیوار کے ساتھ بھی گملوں کی یہی ترتیب تھی۔ برآمدے کے ستونوں کو ہری بھری بیل نے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ ستون تقریباً چھپ کر رہ گئے تھے۔ صاف ستھرا کشادہ صحن کسی بھی آلائش سے پاک تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی دیورانی کو داد دے کر رہ گئی تھیں۔

"ارے...... گھر میں ہے کوئی؟" شام کا وقت تھا مگر ہر طرف بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی تائی کی پاٹ دار آواز صحن میں گونجی تو کمرے میں اونگھتی اماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ دادی نوافل پڑھنے کے بعد کمر سیدھی کرنے کو لیٹی تھیں وہ بھی چونک گئیں۔ سعدیہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے لمحہ بھر کو ٹھٹک گئی تھی۔

چند لمحے انتظار کے بعد اماں چپل گھسیٹتی باہر نکلی تھیں۔

"بسم اللہ، آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں ہمارے گھر میں۔" ان کے پرتپاک انداز اور خصوصاً "بڑے لوگوں" کا سنتے ہی بڑی تائی کی گردن کچھ مزید اکڑ گئی تھی۔ اتنے میں سعدیہ اور دادی بھی آگئیں۔ سعدیہ بڑی تائی کے ساتھ ساتھ بینا اور کامنی کی آمد پر خاصی حیران تھی۔ خیر سب لوگوں کو کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا جہاں بائیں دیوار کے ساتھ کرسیاں رکھی گئی تھیں اور ان کے سامنے چٹائی پر کشن رکھے ہوئے تھے۔

سعدیہ نے سب سے پہلے روزے کے متعلق پوچھا تھا بینا اور کامنی کا روزہ تو نہیں تھا مگر سب کے سامنے انکار کرتے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تو فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر گپ شپ کرنے کے بعد وہ کچن میں آگئی تھی۔

"چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔" اپنے پیچھے اس نے بینا کی سرگوشی سنی تھی مگر نظر انداز کر دیا تھا۔

باورچی خانے میں آکر اس نے سب سے پہلے وقت دیکھا تھا۔ روزہ کھلنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور اس ایک گھنٹے میں ہی اسے سب کچھ کرنا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ان چیزوں کا جائزہ لیا تھا جو اس کے پاس موجود تھیں اور پھر ان چیزوں کو ذہن میں رکھا تھا جو اس نے بنانی تھیں۔ آج افطاری میں اس نے دہی بڑے بنانے کا ارادہ کیا تھا لہٰذا اس کا سامان تو مکمل تھا۔ پکوڑوں کے لیے بیسن وہ پہلے ہی گھول کر رکھ چکی تھی۔ لہٰذا سب سے پہلے پکوڑیاں تل کر ٹھنڈے پانی میں ڈالی تھیں۔ پھر باقی سب چیزیں کھلے برتن میں ڈال دی تھیں۔ دہی بڑوں میں ڈالنے کے لیے جو آلو اس نے ابالے تھے اس میں آدھے اس نے بچا لیے تھے۔ دہی بڑے تیار کر کے اس نے ایک طرف رکھ دیئے۔ کل افطاری میں اس نے سموسے بنائے تھے تھوڑا سا میدہ بچ گیا تھا، جسے اس نے گیلے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اب تک جوں کا توں نرم تھا۔ سعدیہ نے جلدی سے اس کی پوریاں بنائیں۔ ابلے ہوئے آلوؤں میں سے دو چار آلو بچا کر باقیوں کا بھرتا بنایا اور سات آٹھ سموسے تیار کر لیے۔ بچے ہوئے آلوؤں کو کاٹ کر اس نے ایک باؤل میں ڈالا، پھر چنے جو کہ اس نے دہی بڑوں میں ڈالنے کے لیے ابالے تھے، کچھ زیادہ ابال لیے تھے ارادہ تھا کہ تڑکا لگا کر سالن بنالے گی مگر اب اس نے یہ ارادہ ملتوی کرتے ہوئے آلوؤں اور چنوں کو مکس کیا تھا۔ اس میں سرخ مرچ اور نمک کے ساتھ املی کی چٹنی بھی ڈالی تھی۔ پھر ٹماٹر اور پیاز باریک باریک کاٹ کر اس پر ڈالی اور آخر میں کٹی ہوئی سبز مرچ، تھوڑا سا کٹا ہوا دھنیا اور لچھے دار پیاز بنا کر سجاوٹ کے طور پر چاٹ کے اوپر رکھ دیئے تھے۔

تینوں چیزیں تیار ہو چکی تھیں۔ تب ہی دادی اماں نے اسے پکار لیا۔ وہ گئی تو اسے تسبیح دینے کا

کہتے ہوئے انہوں نے مبہم سا اشارہ میز پر پڑے فروٹ کی طرف کیا تھا جو تائی ثریا اپنے ساتھ لائی تھیں۔ واپس کچن میں آتے ہوئے وہ فروٹ کے شاپرز اٹھا لائی تھی۔ پھر فروٹ دھو کر ڈش میں رکھا تو ایک لمحے میں ذہن میں خیال آیا کہ اگر فروٹ چاٹ بنا لی جائے تو وہ یقیناً بہت مزہ دے گی بہ نسبت سادہ فروٹ کے۔ لہٰذا اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اور پھر سب تیار شدہ ڈشز کو کچن میں میز پر رکھنے کے بعد انہیں ایک بڑے رومال سے ڈھانپ دیا تھا۔ افطار میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے جلدی سے سب چھلکے وغیرہ سمیٹ کر کوڑے دان میں ڈالے۔ خشک کپڑا فرش پر پھیرنے کے بعد وہ ہاتھ وغیرہ دھو کر سموسے تلنے کے لیے بیٹھ گئی تھی تب ہی کامنی اور بینا کچن میں آگئیں۔

"کیا بنا رہی ہو بھئی؟" انہوں نے آتے ہی کڑاہی میں جھانکا تھا۔ پھر اطراف کا جائزہ لیا اور غالباً یہی سمجھیں کہ صرف سموسے ہی تلے جا رہے ہیں۔

"اللہ...... ہمارے ہاں تو افطاری میں اتنی زیادہ ڈشز تیار ہوتی ہیں کہ چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جاتا ہے۔" کامنی نے اترا اترا کر اسے بتایا۔

"ہاں تو اور کیا؟ ہر فرد کی پسند کے مطابق ایک ڈش بنتی ہے۔" بینا نے بھی کامنی کا ساتھ دیا۔

سعدیہ چپ چاپ مسکراتی رہی۔

سموسے تل کر فارغ ہوئی تو ابا اور باقی سب بھائی آگئے۔ ابا حسب معمول کھجوریں لے کر آئے تھے۔ سعدیہ نے ابلے ہوئے دودھ پر سے ساری بالائی اکٹھی کر کے ایک پیالی میں ڈالی اور پھر کھجوروں میں سے گٹھلیاں نکالنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے بینا کی نگاہوں کی تپش کا احساس بھی ہو رہا تھا جو بڑی دیر سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ آج اس نے نہا کر ہلکے زرد رنگ کا لباس پہنا تھا۔ ایک کلائی میں زرد چوڑیاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس بھی تھے جو فاروق اپنے جیب خرچ سے اپنی "آپی" کے لیے لے کر آیا تھا اور وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اب انہیں مستقل پہنے رکھتی تھی۔ پاؤں میں سیاہ انگوٹھے والی چپل تھی جس میں اس کے صاف ستھرے پاؤں دمک رہے تھے۔ پیروں کا یہ حال تھا تو چہرے کی چمک دمک نے بینا کو زیادہ ہی الجھا کر رکھ دیا تھا۔

"پتا نہیں اسے ہوا کیا ہے۔ پہلی تو ایسی نہ تھی؟" وہ کھجوروں میں بالائی بھرنے کے بعد ہاتھ دھونے کو اٹھی تو بینا نے فوراً کامنی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ہاں تو اور کیا...... تم نے بال دیکھے ہیں اس کے۔ پہلے کیسے جھاڑ جھنکار بنے رہتے تھے اور اب اتنے سیاہ اور چمک دار۔ میرا خیال ہے اس نے شیمپو بدل لیا ہے۔" کامنی کے دماغ میں یہی بات آئی تھی۔

"ارے بے وقوف۔ شیمپو تو ہم بھی امپورٹڈ استعمال کرتے ہیں، یہ خدا جانے کون کون سے ٹوٹکے آزماتی ہوگی۔" بینا کو فکر لاحق ہوگئی تھی۔

"پوچھ کر دیکھوں؟"

"لو...... وہ بتائے گی تھوڑی۔ گھنی اور میسنی ہے پوری۔" بینا زیادہ ہی جل بھن گئی تھی۔

تب ہی سعدیہ کے ابا نے کمرے سے آواز لگائی کہ "دسترخوان لگا دو صرف پانچ منٹ ہیں روزہ کھلنے میں۔" بینا اور کامنی بھی اٹھ کر کمرے میں چلی آئیں۔ سعدیہ نے کشن ایک طرف رکھ کر دسترخوان بچھایا تو حسب معمول احمد اس کی مدد کو اٹھ کر چلا آیا۔ تمام ڈشز لے جا کر دسترخوان پر رکھی گئیں تو تائی ثریا بے اختیار کہہ اٹھیں۔

"سعدیہ بیٹی! اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ بس کھجوریں ہی کافی تھیں۔"

"تکلف نہیں۔ یہ تو ہماری خوشی ہے تائی امی۔" وہ رسان سے کہہ کر برتن سیٹ کرنے لگی جبکہ بڑی تائی اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی تھیں۔

'کیسی چلتر لڑکی ہے...... سب ثریا کو پھانسنے کے طریقے ہیں۔' انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ ادھر کامنی، بینا کے کان میں گھسی ہوئی تھی۔

"تم ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ واقعی بڑی گھنی اور میسنی ہے۔ کچن میں تو ہمیں نہیں بتایا کہ یہ اتنا سب کچھ تیار کر لیا ہے۔ ہم کیا کھا جاتے۔"

سعدیہ ان کی سوچوں کی برعکس سب کو ڈشز پیش کر رہی تھی۔ اور ثریا اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہی تھیں کہ اس نے اتنی جلدی یہ سب کیسے تیار کر لیا۔ ان کی اس بات کے جواب میں سعدیہ نے ایک نظر دادی کو دیکھا تھا جو توصیفی نظریں اس پر جمائے بیٹھی تھیں۔

"بس...... یہ بھی تمہاری طرح ہی پھرتیلی ہے ثریا! پلک جھپکتے ہی کام کر لیتی ہے۔"

دادی کے لہجے کی شفقت کو محسوس کرتے ہوئے تائی اماں پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔

نماز اور پھر افطاری کے بعد اندھیرا اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ ابا بڑی تائی، بینا اور کامنی کے گھر واپس جانے پر کسی طور پر راضی نہ ہوئے تھے۔

"یہ کوئی غیر کا گھر نہیں ہے بھابی جان! آپ آرام سے یہاں ٹھہریں، میں بھائی صاحب کو فون پر اطلاع کر دوں گا۔" سب کے اصرار پر وہ رک گئی تھیں۔ سعدیہ کو رات کے کھانے کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ ابا نے احمد سے مرغ منگوا دیا تھا۔

"کھانا بھی دسترخوان پر ہی لگا دینا۔ ایسا نہ ہو ظہیر بھائی کی طرح بعد میں سب کو شوربے میں ڈبکیاں لگانا پڑیں۔" گوشت اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے احمد نے کہا تھا اسے اب تک "

شرمندگی یاد تھی۔ سعدیہ بے اختیار ہنس دی۔

"فکر نہیں کرو اس دفعہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" اس نے اطمینان سے کہا تھا۔ اماں بھی بھاگی چلی آئی تھیں پریشانی میں کہ اتنے ساری لوگوں کو کیسے بھگتایا جائے گا۔ سعدیہ نے انہیں مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ پھر گوشت پکاتے ہوئے اس نے اس میں مٹر اور آلو شامل کر کے سالن بڑھا لیا تھا تا کہ کم نہ پڑ جائے اور ساتھ ہی ساتھ دادی کو دعائیں بھی دی تھیں جو دو روز قبل چھٹی کے دن احمد کے نا نا کے باوجود منڈی گئی تھیں اور ڈھیر ساری تازہ سبزیاں لے کر آئی تھیں۔ میٹھے میں اس نے فروٹ کسٹرڈ تیار کر لیا تھا۔

چپاتیاں بنانے سے قبل اس نے کمرے میں جا کر کھانا لگا دینے کا پوچھا تو سب ہی نے انکار کر دیا کہ کچھ دیر بعد کھائیں گے۔ وہ اطمینان سے واپس آ گئی اور پھر جتنا وقت بچا تھا اس میں اس نے مونگ کی دال سبز مسالے کے ساتھ بھون لی تھی۔ یوں دس گیارہ بجے کے قریب کھانا بھی اس قدر اہتمام سے پیش کیا گیا تھا کہ بڑی تائی کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ سب نے ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا سوائے سعدیہ کے کیونکہ جب تک وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے تب اس نے سب کے بستر لگا دیے تھے۔

کھانا کھاتے ہی اس نے برتن سمیٹ لیے۔ جھوٹے برتنوں کا ایک ڈھیر تیار ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کو دل چاہا کہ یوں ہی رکھ کر سو جائے مگر پھر خیال آ گیا کہ صبح سحری بھی تیار کرنی ہے اگر برتن نہ دھوئے تو صبح پریشانی ہوگی۔ یہی سوچ کر اس نے باوجود بے تحاشا تھکن کے برتن دھو کر خشک کرنے کے بعد الماری میں رکھے تھے۔ باقی صفائی معمول کے مطابق کی تھی اور جب وہ سونے کے لیے بستر پر آئی تھی تو تھکن کے باعث چند لمحوں میں ہی غافل ہوگئی تھی۔



صبح سحری کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو دادی اور تائی ثریا دونوں کی چارپائیاں خالی تھیں۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانے میں آئی تو دونوں وہاں سر جوڑے بیٹھی نہ جانے کون سی باتوں میں مصروف تھیں۔ اس کی آمد پر تائی ثریا تو ایک دم خاموش ہوگئیں۔ دادی البتہ مسکرا کر بولی تھیں۔

"آؤ بھئی سعدیہ...... ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔"

"آپ اتنی جلدی اٹھ گئیں۔ لیکن یہ کام وام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں خود کر لیتی سب کچھ۔" چولہے پر چڑھائی کی دیگچی دیکھی تو وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ آٹا بھی گوندھ کر رکھا ہوا تھا۔

"ہم لوگ سوئے ہی کب تھے۔ پہلے عبادت کرتے رہے پھر باتیں کرنے لگے تو سوچا فارغ

ہی بیٹھے ہیں چلو تمہارا کچھ بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ یوں بھی فارغ رہنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔"

تائی ثریا نے وضاحت کی تھی۔ پھر سعدیہ نے پراٹھے اور آملیٹ بنا لیے تھے۔ سحری کے لیے سب کو جگایا تو کامنی اوں...... آں کر کے دوبارہ بستر میں گھس گئی۔ بڑی تائی کو اس وقت اٹھنے کی عادت نہیں تھی لہٰذا چھینکوں پہ چھینکیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہاتھ میں رومال تھا نہ ٹشو پیپر، وہ عجیب شرمندگی سے دوچار ہونے لگیں۔ سعدیہ نے الماری میں سے ایک شاپر نکالا اور استری کیا ہوا تہہ شدہ رومال ان کے ہاتھ میں تھما دیا تب کہیں جا کر انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ سحری کے بعد ابا اور احمد مسجد چلے گئے تھے۔ باقی بستر میں گھس گئے۔ سعدیہ صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ اور جب بڑی تائی گھر جانے کو تیار ہوئیں تو وہ مکمل طور پر فارغ ہو چکی تھی۔

"بھئی، عید کی شام ہم گھر میں ایک پارٹی ارینج کر رہے ہیں۔ آپ سب لوگوں نے ضرور ہی آنا ہے۔" جاتے جاتے بڑی تائی ایک نیا شوشہ چھوڑ گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ تائی ثریا سے یہ بھی کنفرم کر لیا کہ "ظہیر تو عید پر آئے گا نا؟"

ان کے جانے کے بعد تائی ثریا اور دادی کی کھسر پھسر ایک مرتبہ پھر شروع ہو گئی تھی۔ اماں خاصی متجسس تھیں۔ اس معاملے میں ایک دو بار سعدیہ سے ٹوہ لینے کو کہا، مگر اس پر ایک نئی فکر سوار ہو گئی تھی۔ کیونکہ عید کے روز اس نے جو سوٹ پہننا تھا وہ ابھی تک خریدا ہی نہیں گیا تھا۔ چند ماہ پہلے گھر کے سب افراد ایک شادی پر گئے تھے اور سب نے نئے سوٹ بنوائے تھے لہٰذا عید پر وہ کپڑے پہنے جاتے۔

سعدیہ ابا کے ساتھ گھر پر ہی رہی تھی لہٰذا نہ تو اس وقت ہی نیا سوٹ بنوایا تھا نہ ہی عید پر بنوانے کا ارادہ تھا۔ خیال تھا کہ گھر پر ہی رہنا ہے کوئی قدرے بہتر سوٹ نکال کر پہن لوں گی۔ لیکن اب جب کہ بینا اور کامنی اصرار کر کے گئی تھیں اور دادی کا بھی کہنا تھا کہ اسے ضرور اس پارٹی میں شرکت کرنی چاہیے تو اسے فوراً ہی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ سارے ٹرنک اور صندوق کھنگالنے کے بعد اسے ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ ملا تھا اسے ہی غنیمت جان کر گہرے رنگ کے دھاگے منگوائے اور اس پر کڑھائی شروع کر دی۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ عبادت میں مصروف ہو جاتے کیونکہ رمضان المبارک کے آخری ایام تھے۔ سحری کے وقت سب لوگ سو جاتے مگر وہ کڑھائی کرنا شروع ہو جاتی۔ لیکن اس روز جب سحری کے بعد وہ کچن سمیٹ کر کمرے میں آئی تو صورتحال کافی مختلف تھی۔ ابا جو اس وقت تک مسجد جا چکے ہوتے تھے دادی کی پائنتی پر بیٹھے ہوئے تھے، اماں جو اس وقت تک جایا کرتی تھیں، وہ تائی ثریا کے لحاف میں دبکی بیٹھی تھیں۔

چاروں کے درمیان بہت ہلکی آواز میں گفتگو ہو رہی تھی اس نے کمرے میں قدم رکھا تو سب ہی ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اپنی قمیص اور فریم اٹھا کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔

"پتا نہیں کیا ہوا ان لوگوں کو؟" وہ حیران تھی مگر ذہن چونکہ اپنے سوٹ کی تیاری میں اٹکا ہوا تھا اس لیے زیادہ سوچنے کے بجائے کڑھائی پر توجہ دینے لگی۔ جب فاروق وغیرہ کے اسکول جانے کا وقت ہوا تو وہ اٹھ کر دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ میٹنگ ابھی بھی جاری تھی۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر ابا ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے پھر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا سر پیار سے تھپتھپایا اور باہر نکل گئے۔ اس نے قدرے حیرت سے باقی خواتین کی طرف دیکھا وہ تینوں ہی مسکراتے ہوئے اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

"یا اللہ...... یہ کیا ہو گیا ہے ان سب کو......" وہ گڑبڑا سی گئی تھی اور فوراً فاروق کو جھنجھوڑنے لگی۔

آج ستائیسواں روزہ تھا۔ وہ سب افطاری کے لیے بیٹھے ہی تھے جب دروازہ بجنے لگا احمد بڑبڑاتا ہوا دسترخوان سے اٹھ گیا تھا لیکن جب واپس آیا تو مسکراتی آواز میں اماں کو پکار رہا تھا کہ "دیکھیں کون آیا ہے؟" اس کے پیچھے پیچھے ظہیر کمرے میں داخل ہوا تھا اور ابھی وہ سب سے ٹھیک طرح سے مل بھی نہیں پایا تھا کہ سائرن بجنے لگا۔

"بیٹھو بھئی بیٹھو، پہلے روزہ افطار کرو......" ابا نے فوراً ہی سب کو متوجہ کیا تھا۔

افطاری کے بعد کھانا چونکہ دیر سے ہی کھایا جاتا تھا اس لیے سعدیہ سب کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔ قمیص کے دامن پر کڑھائی کرنے کے بعد اس نے گلے پر کڑھائی شروع کی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ کم از کم آج ہی قمیص کا کام ختم ہو جائے تا کہ صبح آستینوں کی باری بھی آ جائے۔ اور جب فاروق نے اسے کھانا لگانے کا پیغام آ کر دیا تو وہ گلے پر آخری پھول کاڑھ رہی تھی۔

"بس ابھی آئی......" اسے واپس بھیج کر اس نے قمیص کو فریم سے نکالا اور دھاگے سوئیاں سمیٹ کر قمیص اٹھائے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ قمیص دادی کو دکھانا چاہ رہی تھی کیونکہ یہ کڑھائی اس نے ان ہی سے سیکھی تھی۔

"دادی اماں دیکھیں......" اپنی ہی روانی میں کہتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ اگلے ہی پل پوری قوت سے ظہیر نعمان سے ٹکرا گئی تھی، جو چائے کا ایک کپ ہاتھ میں لیے دادی اماں کی طرف بڑھ رہا تھا اس زوردار ٹکر کے نتیجے میں چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ سعدیہ نے لڑکھڑاتے ہوئے فوری طور پر دروازے کے پٹ کو تھام کر خود کو گرنے سے بچا

لیا تھا، لیکن جب حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ ایک دم چیخ اٹھی تھی۔ اس کی نئی قمیص زمین پر گری ہوئی تھی اور اس پر چائے کا کپ کرچیوں کی صورت میں پڑا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے قمیص کو اٹھایا مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ قمیص پر چائے کے بڑے بڑے بدنما دھبے دیکھ کر اسے اور تو کچھ نہیں سوجھا تھا قمیص گول مول کر کے دوبارہ وہیں پھینکی اور خود زور زور سے روتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی کمرے میں بیٹھے باقی افراد میں جان پڑ گئی۔ ثریا نے تو ہوش میں آتے ہی ظہیر کو ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی ہونق بنا کھڑا تھا اب مزید سر جھکا لیا تھا اماں بے چاری شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

"ارے آپا! رہنے دو وہ بے وقوف ہے ذرا سی بات ہوئی نہیں اور رونے بیٹھ گئی۔ ابھی خود ہی ٹھیک ہو کر واپس آ جائے گی۔ ایک قمیص کے پیچھے اتنے لوگوں کو ناحق پریشان کر دیا۔"

وہ فوراً اٹھ کر کرچیاں سمیٹنے کے بعد باہر نکل گئی تھیں۔ اور الٹا جا کر سعدیہ پر ہی برسنے لگی تھیں جو ابھی تک دونوں بازوؤں میں منہ چھپائے روئے چلی جا رہی تھی۔

"غضب خدا کا، سوٹ پر ذرا سی چائے گر گئی اور اس نواب زادی نے پورا گھر سر پہ اٹھا لیا اس سے تو اچھا تھا اس کو فوراً دھو لیتی۔ اسی وقت صاف ہو جاتا۔" وہ دھیمی آواز میں اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

"دھونے سے کیسے صاف ہو جاتا۔ کاٹن سے چائے کا داغ اترا ہے کبھی۔" وہ روتے روتے بولی تھی۔

"تو پہلے ہی ڈھنگ سے کام کر لیا کرو، منہ اٹھائے بھاگے چلی آ رہی تھیں۔ غلطی بھی تمہاری ہی تھی اور اس پر ڈانٹ پڑوا دی ظہیر کو۔ کیسے شرمندہ کھڑا تھا بے چارہ سب کے درمیان۔ چلو بس کرو اب یہ ٹسوے بہانا، تمہاری دادی کے پاس بیسیوں نسخے ہوتے ہیں کوئی ٹوٹکا پوچھ لینا۔ اتر جائیں گے چائے کے داغ بھی۔" آخر میں انہوں نے تسلی دی۔

"اور اگر نہ اترے تو......؟" آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا تو اماں پلٹ کر غصے سے اسے گھورنے لگی تھیں۔

"تو مت جانا پارٹی پر، گھر پر ہی رہ لینا......" وہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔ ان کی بات پر اس نے ایک بار پھر کھل کر آنسو بہانے چاہے، مگر عین اسی وقت اماں پھر پلٹ آئیں۔

"خبردار جو اب دوبارہ شروع ہوئیں۔ اٹھو اور چل کر کھانا لگاؤ سب کے لیے۔" اماں کے تنبیہی لہجے پر اٹھتے اٹھتے اس نے دو چار آنسو مزید بہائے اور پھر بھیگی پلکوں سرخ ہوتی ناک کے ساتھ دستر خوان لگا کر احمد کے ہاتھ سب چیزیں بھجوا دیں۔ وہ رات اس نے عبادت کرتے اور روتے

ہوئے گزاری تھی۔ اگلی صبح دادی نے خوب تسلی دی۔ کئی ٹوٹکے بتائے اور دلاسا دیا کہ سوٹ نہ بھی سل سکا تو وہ اسے نیا سوٹ لا دیں گی۔

"کہاں سے لا دیں گی؟ آج اٹھائیسواں روزہ ہے، اگر انتیس کی عید ہو گئی تو؟"

وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ صفائی کرتے ہوئے دیکھا اماں نے سوٹ دھو کر رات کو ہی پھیلا دیا تھا۔ لیکن ہلکے ہلکے داغ جوں کے توں موجود تھے، وہ اس قدر بددل ہوئی تھی کہ دادی کا نسخہ آزمانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ قمیص یونہی گول مول کر کے ٹرنک میں رکھ دی۔ دل ہی دل میں ظہیر کو خوب کوسا جس کی بدولت عید کی خوشی کا ستیاناس ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی روز تائی ثریا اور اماں بازار چلی گئیں۔ دادی گھر پہ موجود تھیں انہوں نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ آیا سوٹ پہننے کے قابل ہوا کہ نہیں۔

"ہو سکتا ہے دادی نے نیا سوٹ منگوا لیا ہو۔" ایک خیال اس کے دل میں آیا تھا۔ اسی امید کے سہارے باقی کا سارا دن ٹھیک ٹھاک گزار لیا تھا۔ جب تائی اور اماں بازار سے آئیں وہ افطاری بنانے کے لیے کچن میں مصروف تھی رات کو جب انہوں نے سب کے لیے شاپنگ دکھائی تو ہر شاپر کھلتے وقت اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آ جاتی کہ شاید اسی میں سے میرا سوٹ برآمد ہو گا۔ مگر ایک ایک کر کے سارے شاپرز کھلے اور پھر بند ہو گئے۔

تائی سب گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ لائی تھیں۔ اس کے لیے بھی چوڑیوں کے دو سیٹ تھے جو انہوں نے باقی سامان کے ساتھ اماں کو دے دیئے تھے۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو سیدھی چھت پر آ گئی۔ مرغیوں کا ڈربا بند کرنے کے بہانے، وہاں پہلے رو کر اندر کا غبار نکالا پھر خیال ہی خیال میں ایک ایک فرد کے ساتھ خوب جھگڑا کر کے نیچے اتر آئی۔

اگلی صبح انتیسواں روزہ تھا، بچوں کی چونکہ آج کل چھٹیاں تھیں اسی لیے گھر میں خوب رونق تھی ہر کوئی خواہش کر رہا تھا کہ آج ہی عید کا چاند نظر آ جائے۔ غرض ایک ہنگامہ سا گھر میں مچا ہوا تھا۔ نجانے کن باتوں پر قہقہے لگ رہے تھے۔ ابا بار بار احمد کو تاکید کر رہے تھے کہ وہ ابھی جا کر دھوبی سے سوٹ لے آئے۔ اماں بیٹھی شیر خورمے کے لیے میوہ صاف کر رہی تھیں اور ظفر کو بار بار ڈانٹ بھی رہی تھیں۔ تائی ثریا دادی کے کان میں گھسی بیٹھی تھیں ہر کوئی بے حد خوش تھا یا پھر اس کو چڑانے کے لیے خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، کم از کم سعدیہ کو تو ایسا ہی لگ رہا تھا کسی کو بھی تو فکر نہیں تھی کہ وہ اتنی گم صم کیوں پھر رہی ہے یا پھر یہ کہ اب وہ عید کے روز کیا پہنے گی۔

سب کی بے حسی پر اسے زیادہ ہی رنج ہوا تو باقی سب کام چھوڑ چھاڑ کر چھت پر چلی آئی۔ وہاں دھوپ میں جھلنگا سی چارپائی پر لیٹے لیٹے اسے نیند آ گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو شام کے سائے

ہر طرف پھیل رہے تھے۔ اس نے الجھے الجھے بالوں کو سمیٹ کر انگلیوں کی مدد سے سنوارتے ہوئے نیچے صحن میں جھانکا۔ خاصی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صحن میں حسن اور فاروق کھیل رہے تھے، احمد بھی موجود تھا۔

''میں ہی پاگل ہوں جو سب کی خدمتیں کر کر کے ہلکان ہوئی جاتی تھی یہاں کسی کو اتنی بھی پروا نہیں کہ اوپر آ کر یہ ہی دیکھ لیں، سعدیہ مر گئی ہے یا زندہ ہے۔''

اسے ایک بار پھر غصہ آ گیا تو سر سے پاؤں تک دوپٹہ تان کر دوبارہ لیٹ گئی۔ آس پڑوس سے کھانا پکنے کی خوشبوئیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے بھی ٹھان لی تھی کہ آج اس وقت تک نیچے نہیں اترے گی جب تک کوئی بلانے نہیں آئے گا۔ تھوڑا وقت مزید سرک گیا تھا وہ بے چین ہو گئی۔

''ان کم بختوں کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔'' سب سے زیادہ ناراضی بھائیوں سے تھی۔ جب دیکھا کہ افطاری کا وقت سر پہ آ گیا ہے تب وہ خود ہی دانت کچکچاتی، پاؤں پٹختی نیچے اتری تھی۔

''افطاری کا وقت بھی ہو گیا اور مجھے کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔'' اس نے جان بوجھ کر احمد کے سامنے فاروق سے کہا۔

''وہ ظہیر بھائی افطاری کا سامان بازار سے لینے گئے ہیں۔ انہوں نے ہی منع کر دیا تھا۔'' فاروق نے اسے اطلاع دی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور ظہیر کتنے ہی شاپرز سمیت اندر چلا آیا۔ ''یہ لو بھئی، سارا سامان پلیٹوں میں نکال لو۔''

اس نے آتے ہی شاپرز اس کی طرف بڑھائے تو وہ کلس کر رہ گئی۔

''جب اتنی دور سے لے کر آئے ہیں تو پلیٹوں میں بھی خود ہی نکال لیں۔'' وہ پاؤں پٹخ کر کمرے میں آ گئی۔ ظہیر نے حیرت سے احمد کو دیکھا۔ وہ بے چارہ کندھے اچکا کر مسکرا دیا تھا۔

سعدیہ کمرے میں گئی تو اماں اور باقی لوگوں کو موجود نہ پا کر خاصی پریشان ہوئی تھی۔ ظفر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا تو معلوم ہوا ابا، دادی، اماں اور تائی ثریا سب بڑے تایا کے ہاں گئے ہیں۔

''مگر کیوں......؟'' خاصا تعجب ہوا تھا اسے، اس کے پوچھنے پر ظہیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر قدرے جھینپتے ہوئے ''پتہ نہیں'' کہہ کر کروٹ بدل لی۔ وہ الجھتے ہوئے باورچی خانے میں آ گئی۔ روزہ کھلنے میں تھوڑی ہی دیر تھی جب باہر صحن میں شور سا مچ گیا۔ اس نے اچک کر کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

بڑے تایا، تائی کے ساتھ بینا، کامنی اور فروا بھی آ رہی تھیں۔ وہ پریشان سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہو......محترمہ نے اتنا بڑا تیر مار لیا اور اب یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔'' بینا اس کے باہر نکلنے

سے پہلے ہی کچن میں چلی آئی تھی۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے گلے ملتے ہوئے حیرت سے پوچھا تو بینا طنزیہ انداز میں اسے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا؟ ہماری کزن بہت معصوم ہے اسے تو کسی چیز کی خبر ہی نہیں ہوتی۔'' بینا، کامنی اور فروا سے کہتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ اس کی بات کا مطلب ہی کھوجتی رہ گئی۔ اسی دوران سائرن بجنے لگا تھا سب لوگ کمرے میں روزہ افطار کرنے لگے تھے وہ چپ چاپ کچن میں بیٹھ کر ماچس کی تیلیاں جلانے لگی۔ آج اس کی جگہ سارا کام احمد نے کیا تھا۔ وہی ایک پلیٹ میں مختلف چیزیں رکھ کر بھاگا آیا تھا، اور اس کے سامنے رکھ کر واپس چلا گیا۔

اس نے بس کھجور کھا کر روزہ افطار کر لیا تھا۔ پھر نماز پڑھنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نماز پڑھنے کے دوران بھی وہ بے چین سی رہی، کوئی نہ کوئی بات ایسی تھی ضرور، جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو فروا اسے بلانے چلی آئی۔

''دادی اماں تمہیں پکار رہی ہیں۔''

''بڑی جلدی یاد آ گئی دادی اماں کو میری۔'' وہ خاصی تلخ ہو رہی تھی۔

''اوہو......بڑی بے چینی ہو رہی ہے جناب کو......'' فروا زور سے ہنسی تھی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو ایکدم ٹھٹک گئی۔ سب ہی لوگ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

''آؤ......آؤ سعدیہ بیٹی......'' دادی کے پکارنے پر ان کی طرف بڑھی تو انہوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر فوراً اپنے پاس بٹھا لیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے سر پہ پیار دینے کے بعد انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ تب ہی تائی ثریا اپنی جگہ سے اٹھی تھیں، انہوں نے میز پر چند ڈبے رکھے تھے اور پھر اس کی طرف بڑھی تھیں۔ چھوٹی سی ڈبیہ میں سے سونے کی انگوٹھی نکال کر انہوں نے دادی اماں کی طرف بڑھائی تو سعدیہ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔

''بسم اللہ کریں اماں!''

دادی اماں نے انگوٹھی ان سے لے کر سعدیہ کی انگلی میں ڈال دی تھی۔ وہ ہکا بکا سی انہیں دیکھے گئی تھی۔

''بے وقوف لڑکی۔ اس موقع پر شرم سے سر جھکایا جاتا ہے۔'' احمد اس کے پیچھے سے چیخا تھا مگر اس کے حواس ہی قابو میں نہ آ رہے تھے۔ یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔ اس نے الجھی سی نظر سب پر ڈالی۔ اماں اور ابا پر شفقت مسکراہٹ چہرے پر لیے اسے دیکھ

رہے تھے۔

"میرا ظہیر تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔" تائی ثریا نے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا تھا، اسے اور تو کچھ نہیں سوجھا چند لمحے ہاتھ میں چمکتی انگوٹھی پر نظریں جمائے بیٹھی رہی اور اگلے ہی لمحے دادی اماں کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ہائیں......ارے......ارے......یہ کیا؟" دادی گھبرا گئی تھیں۔

جب کہ باقی لوگ بے اختیار ہنس دیئے تھے پھر بڑی شفقتوں اور منتوں کے بعد اسے خاموش کروایا گیا تھا، احمد سب کا منہ میٹھا کروانے لگا تھا۔ تائی نے مختلف ڈبے کھول کر اس کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

"لو بیٹی۔ دیکھو اور بتاؤ کہ میرے بیٹے کی پسند کیسی ہے؟" تائی ثریا نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ ذرا اونچا کیا تو جھلملاتے ہوئے جوڑوں کو بس ایک نظر ہی دیکھ سکی تھی۔

"ارے سعدیہ کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ تمہارے بیٹے کی پسند کیسی ہے؟" دادی کے کہنے پر سب کا قہقہہ سن کر وہ بری طرح شرما گئی تھی۔ لہٰذا فوراً ہی ان سب کے درمیان سے کھسک گئی۔ اسی دوران باہر خوب شور سا مچ گیا تھا۔ غالباً عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔ ابا بڑے تایا کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ احمد سب بھائیوں کے ساتھ چھت پر بھاگا۔ بینا وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھیں، جب کہ وہ باورچی خانے میں تنہا کھڑی انگوٹھی پر نظریں جمائے مسکرا رہی تھی۔ سب نے جی بھر کے بے وقوف بنایا تھا اسے۔

تب ہی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ظہیر نعمان کو آتے دیکھ کر فوراً رخ موڑ لیا۔ وہ ہلکا سا کھنکھار کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

"عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔ میری طرف سے عید مبارک۔" اس نے اس کے عقب میں کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا جس میں سونے کا لاکٹ جھول رہا تھا۔

"انگوٹھی تو امی نے پہنا دی تھی۔ میرا خیال ہے لاکٹ میں......"

"جی نہیں...... میں خود پہن لوں گی......" اس نے گھبرا کر فوراً لاکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ ظہیر بے اختیار ہنس کر پلٹنے لگا تھا۔

"آپ کو بھی عید مبارک ہو......" اپنے پیچھے ہلکی سی سرگوشی سن کر وہ ٹھٹک گیا تھا۔

"میری عید تو تب ہو گی جب یہ چاند میرے آنگن میں......" اس نے قدرے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا تب ہی دادی نے اسے پکار لیا۔ وہ سٹپٹا کر سیدھا ہوتے ہوئے پلٹا تو دادی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"دادی اماں......وہ میں تو......" اس سے کچھ نہ بن پایا تو قریب سے گزر کر باہر نکل گیا۔

دادی اس کے جانے کے بعد مسکراتے ہوئے اس کی طرف آ گئیں۔

"جانتی ہو وہ کیا کہہ رہا تھا؟ بالکل میرے دل کی بات تھی کہ میری عید تو اس وقت ہو گی جب یہ چاند میرے آنگن میں اترے گا۔" دادی اماں نے کہا تو سعدیہ نے جھینپ کر ان کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ دادی نے دل ہی دل میں اسے دعاؤں سے نوازتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔



تراشتا ہے سفر

بلیک جینز، وائٹ کلر کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور اس پر بلیک کارڈیگن پہن کر میں نے اسکارف گلے میں ڈالا تھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے جونہی میری نظر موبائل پر باتیں کرتی مما اور ان کے ساتھ شام کے اخبار میں منہمک احتشام احمد پر پڑی تو میرا موڈ بری طرح بگڑ گیا تھا۔

’کیا ضروری تھا کہ یہ دونوں اس وقت یہاں موجود ہوتے؟‘ میں نے تلخی سے سوچا تھا اور پھر ان دونوں کو مکمل نظر انداز کر کے میں نے بیرونی دروازے کا رخ کیا تھا۔

’’شانزے بیٹا! کہاں جارہی ہو اس وقت؟‘‘

وہی شہد کی مانند میٹھا، نرم لہجہ تھا مگر میرے جسم میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ میں سنی ان سنی کرتے ہوئے سر جھٹک کر آگے بڑھی تھی۔

’’شانزے! میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔‘‘ احتشام احمد کی قدرے بلند آواز نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔

’’مگر میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔‘‘ میں نے پلٹ کر زہر خند لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی مگر وہ ضبط کے ہنر سے بخوبی واقف تھے اسی لئے اگلے ہی لمحے وہ بالکل نارمل ہو گئے تھے۔ البتہ مما کے چہرے پر ناگواری کے شدید تاثرات اُبھر آئے تھے۔

’’واٹ نان سینس شانزے! یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو؟‘‘ انہوں نے موبائل آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر پٹخا۔ ’’احتشام احمد تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔‘‘ ان کا تنبیہی انداز میں کہا گیا جملہ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

’’مما پلیز!‘‘ میں ایک دم چیخ اٹھی تھی۔ ’’میں ہزار بار آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ شخص آپ کے ہزبینڈ کے خانے میں تو فٹ ہو سکتا ہے مگر میرے باپ کی جگہ کبھی نہیں لے سکتا۔‘‘ ان کا کہا گیا

ایک جملہ ہی جیسے مجھے بھٹی میں جھونک گیا تھا۔ اپنی بات کہہ کر میں رکی نہیں تھی بلکہ اپنے پیچھے پوری قوت سے دروازہ بند کرتے ہوئے میں باہر نکل آئی تھی اور معلوم نہیں ایسے کسی بھی موقع پر اتنا زورآور، اتنا ڈھیروں ڈھیر غصہ میرے دل میں کہاں سے اُمڈ کر آتا تھا۔ اس وقت بھی میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں کی پتیاں نوچ ڈالوں یا قطار در قطار رکھے گئے گملوں کو اپنی ٹھوکروں سے تہس نہس کر دوں۔

اس دیوانگی کی حالت میں جب میں گاڑی لے کر نکلی تو مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جارہی ہوں اور جب ایک طویل، سنسان سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے میں تھک گئی تو بے اختیار ہی میرا پاؤں بریک پر جا پڑا۔

’’اوہ میرے خدا!‘‘ میں نے تھک کر دونوں ہاتھ اپنی گود میں گرا لئے اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے محاذ پر لڑتے لڑتے میں نڈھال ہو کر رہ گئی ہوں۔

’ہاں..... شاید یہ جنگ ہی تو ہے جس میں تنہا لڑتے لڑتے میں خود سے بھی جدا ہوتی جارہی ہوں۔ اور کیا یہ ضروری ہے کہ میں اس موقعے پر کمپرومائز کر کے مما کو مکمل طور پر ’’فاتح‘‘ قرار دے دوں؟‘ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

’نہیں..... ہرگز نہیں۔‘ پاپا کا ہارا ہوا وجود میری نظروں کے سامنے آ گیا۔

’کاش..... کاش پاپا! آپ میرے سامنے ہوتے تو میں ایک بار آپ سے ضرور پوچھتی کہ آپ نے اتنی جلدی زندگی کیسے ہار دی؟ تھوڑی جدوجہد تو کرتے۔ پھر دیکھتے آپ کی شانزے آپ کے لئے کیا کرتی۔ مگر آپ نے تو اپنی ناؤ میں سوراخ ہوتے دیکھ کر پتوار ہی پھینک دیئے۔ ذرا مڑ کر دیکھتے تو سہی..... آپ کی شانزے اپنے دونوں ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے، آپ کو سہارا دینے کے لئے کھڑی تھی..... مگر پاپا! آپ نے دیکھا ہی نہیں۔‘ میرے وجود میں سارا غم و غصہ، ساری تلخی گرم سیال کی صورت میری آنکھوں سے بہہ نکلی تھی۔

’اور مجھے لگتا ہے پاپا جان! میں آج بھی آپ کو سہارا دینے کے لئے، اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے دریائے کنارے کھڑی ہوں۔‘

’’ٹھک، ٹھک۔‘‘ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی گاڑی کا شیشہ بجا رہا ہے۔ بمشکل میں نے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، میرے آنکھیں کھولتے ہی ایک دم سیدھا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ میں اس کی شکل بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پائی تھی۔

’’باہر آیئے۔‘‘ گاڑی کا دروازہ کھولے وہ بہت سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

’کون ہے؟ کیا کرنے والا ہے؟‘ میں ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔

"محترمہ! میں آپ سے کہہ رہا ہوں باہر تشریف لے آئیے۔" خاصے مہذبانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ میں حیران پریشان سی کھلے دروازے سے باہر آ گئی۔

"آنسو پونچھ لیجئے۔" اس نے براؤن کلر کا رومال میری طرف بڑھایا تھا اور میں اس اچانک صورتِ حال پر اس طرح شرمندہ ہوئی تھی کہ بے ساختہ ہی اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔ اس نے کندھے اچکا کر رومال دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"میں نے زندگی میں بڑی طویل جدوجہد کی ہے اور اس جدوجہد میں سب سے بیکار چیز ان آنسوؤں کو پایا ہے۔" دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے وہ شخص بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

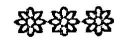
"اگر کوئی دکھ آپ کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے تو سمجھیں یہ آنسو دکھوں کی فصل پر بارش کا کام دیں گے۔ اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو اتنا ڈھیر سارا رو لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود ہے...... تو جب یہ آنسو ہمارے کسی کام نہیں آ سکتے تو کیوں نہ ہم ان کی جگہ کچھ نیا سوچیں۔"

اس نے اپنی بات مکمل کر کے میرے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی اور یقیناً اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔ اسی لئے اس نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"یہ کارڈ رکھئے۔" اس نے جیسے زبردستی اپنا کارڈ میرے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ "کبھی فرصت ملے تو یہاں ضرور آیئے گا۔ زندگی بہت ہنستی کھلکھلاتی ملے گی آپ کو۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پلٹ گیا تو میں نے اتنی دیر سے جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔ وہ بہت دراز قامت شخص تھا۔ عجلت میں اپنی کار کا دروازہ کھول کر وہ اس میں بیٹھا تھا اور زن سے گاڑی لے اڑا تھا۔ میں صرف اس کے گھونگھریالے بال اور چوڑی پشت ہی دیکھ پائی تھی۔ سخت جھنجلا کر میں نے ہاتھ میں پکڑا وزیٹنگ کارڈ بغیر پڑھے ڈیش بورڈ پر اچھال دیا تھا۔

'تف ہے مجھ پر۔ کیا اب میں اسی قابل رہ گئی ہوں کہ سڑک پر آتا جاتا ہرا ایرا غیرا مجھے زندگی گزارنے کے اصول پڑھانے لگے۔' خود پر بری طرح برستے ہوئے میں نے گاڑی واپسی کے لئے اسٹارٹ کی تھی۔



"میری سمجھ میں نہیں آتا شانزے! آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" ونیزہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ میں چپ چاپ راستے میں آتی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو جوگرز کی مدد سے دور دور تک پھینکتی رہی۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یونیورسٹی سے غیر حاضر ہوئے۔ آج اگر مارے باندھے آ ہی گئی ہو تو تم نے ڈھنگ سے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی اور ابھی پروفیسر بشیر احمد ارشد کی کلاس میں تم نے کس طرح مس بی ہیو کیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک منٹ میں تمہاری انسلٹ کر کے کلاس سے باہر نکال دیتا۔"

میں نے اکتا کر اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"کیوں اتنی گرمی کھا رہی ہو؟ آخر ایسا کیا کر دیا میں نے؟"

"واٹ؟ ابھی تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ ان کے پورے لیکچر کے دوران تم اپنی پنسل اور نوٹ بک سے کھیلتی رہی ہو۔ تین مرتبہ انہوں نے تمہیں پکارا تھا اور اگر میرے متوجہ کرنے پر تم حواسوں میں آ ہی گئی تھیں تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "سر! میں نے آپ کا لیکچر سنا ہی نہیں۔" یعنی کہ حد ہو گئی۔" کیفے ٹیریا میں پہنچ کر اس نے فائل میز پہ پٹخی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سینڈوچ اور چائے کا آرڈر دے کر میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بالکل بھی میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ ایک پاؤں مسلسل ہلاتے ہوئے وہ خوامخواہ باہر دیکھے جا رہی تھی گویا مکمل ناراض تھی۔

"ونیزہ! پلیز اپنا موڈ درست کر لو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمہاری ناراضگی برداشت کر سکوں۔" میں نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور غالباً اس نے اس ایک نظر میں ہی میری کیفیت کو جانچ لیا تھا۔ اسی لئے ایک طویل اور گہرا سانس لے کر اس نے گویا اپنا سارا غصہ باہر نکالا اور پھر نرمی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"شان! تم مجھ سے وہ سب کیوں نہیں کہہ دیتیں جو تم کہنا چاہتی ہو۔ کیا تم مناسب سمجھتی ہو کہ عام روایتی سے انداز میں، میں تمہاری منتیں کر کے تمہیں اس بات پر آمادہ کروں کہ تم وہ سب مجھ سے شیئر کرو جو تمہارے دل میں ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم شان! کہ تمہاری بے چینی مجھے کس قدر اذیت دیتی ہے؟"

میں نے میز کی کھردری سطح سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تیر رہی تھی۔

'اور یہ ونیزہ عثمان جو میرے دکھ کو پا جانے ہی خود کو اذیت دے رہی ہے، اگر یہ جان لے کہ میں اس وقت کس کرب میں مبتلا ہوں تو نہ جانے یہ کیا کر ڈالے۔ مگر میں اسے یہ کیسے بتاؤں کہ زندگی نے اپنا جو بھیانک روپ مجھے دکھایا ہے وہ اس قدر خوف زدہ کر دینے والا ہے کہ اگر میں اسے بیان کرنے لگوں تو زبان مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور سارے لفظ ایک ایک کر کے چپ کے قلعے میں مقید ہو جاتے ہیں۔'

''اور میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس صورتِ حال میں خود کو ایڈجسٹ کیوں نہیں کر پا رہی ہو؟ تم تو ہر طرح کے حالات میں خود کو ڈھال لیا کرتی تھیں۔'' ونیزہ نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''مانا کہ احتشام انکل کو پاپا کی جگہ سمجھنا تمہارے لئے اذیت ناک ہے مگر یہ بھی تو سوچو کہ تمہاری مما کو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔ اتنا وسیع وعریض کاروبار چلانے کے لئے انہیں کسی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی جبھی تو احتشام انکل کو انہوں نے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔'' وہ بڑے معصومانہ انداز میں میری دلجوئی کر رہی تھی۔

''آہ ونیزہ جانو کاش میری مما اتنی ہی بے بس، معصوم اور لاچار ہوتیں۔ مگر وہ تو آستین میں چھپا ایسا زہریلا سانپ نکلیں جنہوں نے موقع ملتے ہی میرے پاپا کو ڈس لیا۔'' میں نے ٹھنڈی یخ چائے کا بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اپنے اندر اُبلتے لاوے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''آج سینڈوچ بڑے مزے کے ہیں۔'' میں نے ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے مزے سے کہا تو مسلسل بولتی ہوئی ونیزہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک ہی بے تحاشا غصہ اُمڈ آیا تھا۔

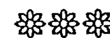
''یہ لو پکڑو۔ انہیں بھی ٹھونس لو۔'' اس نے اپنے سامنے سے پلیٹ اٹھا کر میرے سامنے پٹخی اور اپنی فائل، بیگ اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتی باہر کی طرف بڑھی۔

''ارے کہاں بھئی؟ بات تو سنو۔'' میں بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکی۔

''ونیزہ پلیز رُکو تو۔'' میں بھاگ کر اس کے برابر پہنچی۔

''کوئی ضرورت نہیں مجھے بلانے کی۔'' اس نے اچھا خاصا ڈپٹ کر کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنا بیگ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ سے چھڑایا تھا جسے پکڑ کر میں اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ غلطی میری ہی تھی اور ونیزہ کو ناراض ہونے کا حق بھی تھا مگر اس کے باوجود اس کی بات سن کر میں اپنی جگہ پر چپ سی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی تھی اور میں نہ جانے کس پر غصہ ہوتے ہوئے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سامنے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ بھوری زمین کو گھورتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی، جب وئی چپکے سے میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

''چلو گھر چلیں۔'' اس کی آواز میں ناراضگی کے ساتھ ساتھ مفاہمت کا تاثر بھی واضح تھا۔ میں بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی جرسی کی جیب میں ہاتھ گھساتی اس کے پیچھے چل دی تھی۔



سیاہ بادل کسی بے سمت مسافر کی طرح نہ جانے کس دیس سے بھولے بھٹکے آئے تھے اور سفید

موتیوں کی صورت بارش کی سوغات دھرتی کو سونپ کر کسی اور منزل کی طرف رواں ہو گئے تھے۔ سردی جو پہلے کسی اناڑی رقاصہ کی طرح پائل چھنکاتی پھرتی تھی، اب بڑی مہارت اور تندہی سے زمین پر رقص کرنے لگی تھی۔ کہر کی نم آلود سفید چادر نے بڑی نرمی سے پھول، پتوں اور درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دھند کی دبیز تہ کھڑکیوں کے شیشوں اور گلاس ڈور سے چپک کر بڑی شرارت سے کمرے کے گرم ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایسی صورت میں یونیورسٹی جانا مجھے کسی حماقت سے کم معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سو ونیزہ کو فون پر اپنے یونیورسٹی نہ جانے کی اطلاع دے کر میں اپنے کمبل میں مزید سمٹ گئی تھی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ونیزہ نے میرے اس فیصلے کو بہت سراہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی جسے میں خود کو کہیں جانے پر آمادہ نہ پا کر سہولت سے رد کر چکی تھی۔ اور اب نہ جانے کتنی دیر سے، میں ایک ہی زاویے میں کھڑکی سے باہر وسیع وعریض لان پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ پاپا کو یہ موسم بے حد پسند تھا۔ ایسی ٹھٹھرا دینے والی سردی میں جب مما اپنے فل ہیٹڈ روم میں بند ہو کر رہ جاتیں اور میں بہت سے کمبلوں میں گھسی سردی، سردی چلا رہی ہوتی تو پاپا بڑے مزے سے کافی کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لئے گلاس وال کے قریب راکنگ چیئر پہ جا بیٹھتے اور پھر کتنی ہی دیر تک ان کی نگاہیں کبھی آسمان کی وسعتوں پہ ڈولتے سرمئی بادلوں میں اُلجھتیں تو کبھی لان میں سبز گھاس پر جم کر رہ جاتیں جس پر سفید کہر بے رحمی و سفاکی سے براجمان ہوتی تھی۔ میں اپنے کمرے سے کمبل گھسیٹتی ہوئی ان کے پاس آ کر کشن پر ڈھیر ہو جاتی۔

''پاپا! کیا دیکھ رہے ہیں اتنی دیر سے؟'' میں ان کے اُداس چہرے کو دیکھ کر پوچھتی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چونکتے، مجھے دیکھتے اور پھر ایک بہت مدھم سی مسکراہٹ ان کے عنابی لبوں کو چھو جاتی اور اس مسکراہٹ میں ایسی تھکن ہوتی کہ مجھے خود بخود یہ احساس ہونے لگتا جیسے پاپا اس ٹھنڈے یخ ماحول میں تو موجود ہی نہیں تھے۔ وہ تو کسی کٹھن راستے کی مسافت طے کر رہے تھے۔ اپنی روح کے تمام تر دکھوں، نا تمام خواہشوں اور بھرپور یاسیت کا بوجھ اٹھائے اور جیسے میرے پکارنے پر وہ ایک دم اس سفر سے لوٹ تو آئے ہوں مگر خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر پا رہے ہوں۔ میں اپنے ہی دل میں اُبھرنے والے خیالات کی یورش سے گھبرا کر پھر سے انہیں پکارنے لگتی اور اپنی بے تکی باتوں سے ان کا دل بہلانے لگتی۔

''پاپا! بتائیں نا، آپ کو اس موسم میں کون سی چیز سب سے زیادہ انسپائر کرتی ہے؟'' میں ان کا بازو ہلا کر پوچھتی۔

''شانزے ڈارلنگ! مجھے سردی کا موسم پورا کا پورا بے حد اچھا لگتا ہے۔ اپنے آغاز سے

اختتام تک اس موسم کا ہر بدلتا منظر مجھ پر عجیب انداز سے اثر انداز ہوتا ہے۔ بدن کو کپکپا دینے والی سرد، سرسراتی ہوائیں، اپنے پورے قد سے کھڑے نیم خوابیدہ درخت، یوکلپٹس کے پتوں سے قطرہ قطرہ پگھلتی ہوئی کہر، اُداس افسردہ شام میں گھلی یاسیت آمیز خاموشی، سیاہ گھور راتوں کا جاگتا طلسم اور گھنے بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھار اپنی جھب دکھلاتا پورا چاند...... میں تمہیں کیا بتلاؤں شانزے ڈیئر! کہ مجھے اس موسم کی کون سی ادا سب سے زیادہ بھاتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہتے۔

"لیکن پاپا! آپ نے رگوں میں خون جما دینے والی اس ٹھنڈک کا تو ذکر ہی نہیں کیا جو اس وقت مجھ پر پوری طرح قابض ہے۔" میں کپکپاتی آواز میں کہتی تو جواباً وہ زور سے ہنس پڑتے۔

"ایسی صورت میں آپ کو ہرگز یہاں نہیں بیٹھنا چاہئے بلکہ اپنے کمرے میں جا کر ہیٹر آن کر کے گرم گرم چائے کا لطف اٹھانا چاہئے۔"

"مگر آپ بھی تو یوں ہی بیٹھے ہیں اتنی سردی میں۔ اگر آپ کو ٹھنڈ لگ گئی تو؟" مجھے فوراً ان کی فکر پڑ جاتی۔ کھدر کا سوٹ اور اس پر ایک گرم چادر۔ یہ لباس اس موسم کے لئے ناکافی تھا۔

"بیٹا جانی! آپ کے پاپا اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ اتنی سی سردی برداشت نہ کر سکیں۔ ابھی اس بدن میں اتنی حرارت موجود ہے کہ یہ اس موسم سے نبرد آزما ہو سکے۔"

پاپا کہتے اور میں ان کے سرخ و سفید چہرے کو بڑے پیار سے دیکھنے لگتی۔ واقعی پاپا اس عمر میں بھی اتنی شاندار شخصیت کے مالک تھے کہ انہیں دیکھ کر بغیر جانے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں۔ خود مما ابھی تک اتنی ایکٹو اور پُرکشش تھیں کہ مجھ سے محض چند سال بڑی دکھائی دیتی تھیں۔

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں پاپا۔ بھلا اتنے اسٹرونگ مین کو یہ چھوٹے موٹے موسم کہاں شکست دے سکتے ہیں؟" میں بڑے فخر سے ان کو دیکھتی ہوئی وہاں سے اٹھ جاتی اور یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات بلند و بانگ، عظیم الشان عمارتوں کو گھن اندر ہی اندر اس طرح چاٹ جاتا ہے کہ وہ تیز آندھی کے پہلے تھپیڑے سے ہی زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ اور پاپا! آپ کے شاندار جسم کو ڈھانے کے لئے بیرونی عناصر دشمنی پر نہیں اُترے تھے۔ آپ کو تو اپنے ہی کئے گئے فیصلوں کا گھن چاٹ گیا اور رہی سہی کسر پوری کرنے کے لئے تو آپ کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔

میں جیسے تھک کر بیڈ سے نیچے اُتر آئی۔ کمرے کی گرم فضا بے حد بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ بے اختیار ہی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور پھر میرے قدم لونگ روم میں گلاس وال کے سامنے رک گئے شیشے کی بے جان، سرد اور چکنی سطح پر پیشانی ٹکا کر میں نے باہر جھانکا۔

ذرا سی ہوا چلتی، یوکلپٹس کے پتوں پر جمی کہر قطروں کی صورت زمین پر گرتی تو آہٹ کا گمان ہونے لگتا تھا۔ خاک بسر زمین پر سبزے کی چادر اوس کے سفید موتیوں سے سجی ہوئی تھی۔ نیم خوابیدہ درخت آج بھی اپنے پورے قد سے کھڑے تھے۔ ہوا بھی ویسی ہی سرد تھی اور فضا میں گھلی اُداس و افسردہ خاموشی بھی۔

میری نظریں بھٹکتی ہوئی راکنگ چیئر پر جا کر ٹھہر گئی تھیں۔ اس پیارے سے، پُرشفقت، محبت بھرے وجود سے خالی۔ میرا دل کہیں گہرائی میں جا گرا تھا۔

نجانے یہ موسم اس جگہ ٹھہر سا کیوں گیا ہے؟ شاید یہ اپنے اس ساتھی کا منتظر ہے جس کے ساتھ اس نے سیاہ، گھور راتوں کے طلسم میں جاگنا تھا اور گھنے بادلوں میں چھپے چاند سے آنکھ مچولی کھیلنی تھی اور مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ جا کر ان ہواؤں، درختوں، اُداس شاموں کو یہ کہہ سکوں کہ۔ "سنو! وہ مسافر ایک مرتبہ پھر اپنی روح کے تمام تر دکھوں، ناتمام خواہشوں اور بھرپور یاسیت کا بوجھ اٹھائے ایک کٹھن سفر کی مسافت طے کرنے نکلا ہے اور اب میرے پکارنے پر بھی واپس نہیں لوٹتا۔"

میں راکنگ چیئر پر گر گئی تھی اور اس لمحے پاپا مجھے بہت شدت سے یاد آئے تھے۔



"مجھے جمشید آفندی سے ملنا ہے۔" دارالاطفال کے سیاہ، آہنی بلند و بالا گیٹ کے سامنے مستعد کھڑے چوکیدار سے میں نے کہا تو اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا تھا۔

"آپ یہاں سے سیدھی سامنے چلی جائیں۔ کوریڈور کے پہلے کمرے میں مسٹر عاصم بیٹھے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ وہ آفندی صاحب کے سیکرٹری ہیں۔"

اس کے بتانے پر میں سرخ روش پر چلتی ہوئی اس کمرے تک پہنچی۔ دروازہ اگرچہ کھلا تھا مگر پھر بھی میں ذرا سا کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی تھی۔ فائل میں منہمک بیٹھے شخص نے سر اٹھا کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر جما دیں۔

"تشریف رکھئے۔" اس نے گولڈن پین، ہولڈر میں پھنساتے ہوئے مہذبانہ اور شائستہ لہجے میں کہا تو میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"انہوں نے آپ کو وقت دے رکھا ہے؟"

"جی نہیں۔ انہوں نے یہ کارڈ مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ میں کسی وقت بھی آ جاؤں۔" میں نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف کھسکایا جس پر اس نے سرسری سی نظر ڈال کر دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔

''وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے کہتے ہوئے دوبارہ فائل کھول لی تھی اور بڑے رسمی سے انداز میں چائے کا بھی پوچھا تھا جسے میں نے شکریے کے ساتھ ٹال دیا تھا اور کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئی تھی۔ آج گھر میں بند رہنے کے بعد میں سخت اُکتا کر باہر نکلی تھی۔ یونیورسٹی میں ایک آدھ کلاس اٹینڈ کی تھی۔ ونیزہ بھی موجود نہیں تھی، وہ وہاں سے جلد ہی لوٹ آئی تھی اور یوں ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی جب ڈیش بورڈ پر پڑے اس وزیٹنگ کارڈ پر نظر جا پڑی تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے گاڑی مطلوبہ سڑک پر ڈال دی تھی۔ اور اب میں جمشید آفندی کے انتظار میں یہاں بیٹھی تھی۔ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد میں اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی جب اچانک کھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ دراز قد اور گھنگھریالے بالوں کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اس روز یہی شخص مجھے سڑک پر ملا تھا اور یقیناً یہ جمشید آفندی ہی تھا۔

اس کی آمد پر عاصم مؤدبانہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جمشید آفندی بڑے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے سنجیدگی سے کچھ ہدایات دے رہا تھا جسے وہ بڑی توجہ سے سن بھی رہا تھا جبکہ میں یہ دیکھ رہی تھی کہ عاصم کی اچھی خاصی شخصیت جمشید آفندی کے سامنے دب سی گئی تھی۔

'ہاں، بعض لوگ ہوتے ہیں نا ایسے جو کسی بھی ماحول پر چھا جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔'

''سر! یہ محترمہ آپ سے ملنے کے لئے آئی ہیں۔'' عاصم کی آواز پر میں چونک گئی۔

اس نے سرسری سے انداز میں مجھے دیکھا۔ شناسائی کی کوئی چمک اس کی آنکھوں میں نہ اُبھری تھی۔

''ہوں...... انہیں میرے کمرے میں بھیج دو۔'' وہ اپنی بھاری جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ناگواری کی کوئی لہر سی اُٹھی تھی اور ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں اس شخص سے کوئی بات کئے بغیر ہی لوٹ جاؤں مگر چونکہ یہ بھی کچھ مناسب نہیں تھا۔ اسی لئے اگلے لمحے میں اس کے آفس میں موجود تھی۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ایک ضروری فون کرلوں۔'' اس نے گویا اخلاقاً پوچھا تھا۔ جواباً میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''تھینک یو۔ آپ اس وقت تک چائے سے لطف اندوز ہوں۔'' اس نے چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتے ملازم کو دیکھ کر کہا اور خود فون پر بزی ہوگیا۔ چائے کا بھاپ اُڑاتا کپ

میرے سامنے تھا مگر میرے لئے اس شخص کا جائزہ لینا زیادہ لطف انگیز ثابت ہوا تھا بہ نسبت چائے کے۔ اس کے گھنگھریالے، بے ترتیب بال بڑی شان سے اس کی کشادہ پیشانی پر براجمان تھے اور اس کی آنکھیں...... میں نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر آگے کو جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ہاں، سبز جھیل سی جادوئی آنکھیں مسحور کر دینے والی طلسماتی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی ہی پُراسرار کشش تھی۔ بہت مانوس سی کشش۔ میری نظریں بھٹکتی ہوئی عنابی ہونٹوں کے بالکل برابر دائیں گال پر موجود معصوم سے تل پر جا پڑیں جو اس کے ہونٹوں کے ساتھ ہی مسکرا اُٹھتا تھا۔ اس کی بھاری اور جاندار آواز میں نرمی کا تاثر غالب تھا اور اس کی سبز رگوں کی جھلک دکھاتے سرخ و سفید ہاتھ میں دبے قلم کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا تھا کہ ان ہاتھوں میں برش ہوتا۔ اسے دیکھ کر خود بخود میرے ذہن میں کسی مصور کا خیال اُبھر آیا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت بے حد متاثر کن اور بھرپور تھی۔

ریسیور رکھتے ہوئے وہ ہلکا سا کھنکارا تھا اور پھر سامنے پڑی فائلیں ایک طرف کھسکاتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی مجھے شانزے ایمان کہتے ہیں۔''

''ہوں...... پہلے تو یہ بتائیے مس شانزے ایمان! کہ اپنے آنسوؤں سے کب کنارہ کش ہو رہی ہیں آپ؟'' گویا وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

''جن کے دلوں میں سمندر آ ٹھہرا ہو آفندی صاحب! وہ آنسوؤں سے کبھی بھی کنارہ نہیں کر سکتے۔'' میرے کہنے پر اس نے چند لمحوں کے لئے بغور میرے چہرے کو کھوجا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم مس شانزے! کہ آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے، کیا پریشانی ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کے ساتھ کوئی پرابلم ہے بھی یا آپ اپنی کلاس کے اور بہت سے لوگوں کی طرح شوقیہ فرسٹریشن کا شکار ہیں۔ ہاں البتہ اس بات سے واقفیت ضرور رکھتا ہوں کہ بعض اوقات کوئی دکھ، کوئی غم ہمارے دل میں اس طرح مستقل گھر کر لیتا ہے کہ پھر کسی طور اس گھر سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اسے دربدر کرتے کرتے ہم خود نڈھال ہو جاتے ہیں۔ اس روز آپ کو دیکھا تو ایسی ہی تھکن آپ کے چہرے سے جھلکتی دکھائی دی۔ ہوسکتا ہے مجھے سمجھنے میں غلطی بھی ہوئی ہو کہ بہرحال میں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اس روز میں خود کو روک نہیں سکا تھا اسی لئے بے اختیار آپ کو یہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔'' وہ پوری توجہ سے پیپر ویٹ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چلیئے مان لیتے ہیں کہ آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے۔" میں نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا۔ اگرچہ دل میں اس کے سو فیصد درست خیال کی قائل ہو چکی تھی۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ یتیموں اور بے آسرا بچوں کی پناہ گاہ میں آ کر مجھے کیا حاصل ہوگا جبکہ مجھے کسی قسم کے سوشل ورک سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔" میں چونکہ اس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی اس لئے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ جواباً وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں اپنے غم کو غلط کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے دوسروں کے غم میں ضم کر دیا جائے۔ جس طرح ایک قطرہ سمندر میں جا کر اپنا وجود کھو دیتا ہے اسی طرح اس کائنات میں بکھرے بے شمار دکھوں میں آپ کا غم آپ کو بہت حقیر نظر آئے گا اور شاید آپ کو یاد نہیں، میں نے کہا تھا، یہاں زندگی بہت ہنستی کھلکھلاتی ملے گی آپ کو۔ ہاں اگر آپ مزید کچھ چاہتی ہیں تو وہ آپ کو واقعی یہاں سے نہیں ملے گا۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔

"ہونہہ، زندگی اور وہ بھی ہنستی کھلکھلاتی۔" میں تمسخرانہ انداز میں مسکرائی۔ "مسٹر جمشید آفندی! کہیں آپ جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تو نہیں؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر طنز کیا تو لمحہ بھر کو وہاں سکوت سا چھا گیا۔

"خواب کسے کہتے ہیں مس شانزے ایمان؟" اس نے کرب آمیز معصومیت سے سوال کیا تھا۔

"میرا کبھی خواب نامی چیز سے واسطہ نہیں پڑا۔ حقیقت کبھی آنکھوں سے اوجھل ہی نہیں ہوئی تو خوابوں کو جگہ کہاں سے ملتی؟" اس نے آخری جملے جیسے خود سے کہے تھے۔ مجھے لگا، وہ شخص ایک لمحے کے لئے کہیں کھو گیا تھا اور پھر پلٹ آیا تھا۔

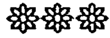
"بہر حال میڈم! میں آپ کو یہاں آنے پر مجبور تو نہیں کر رہا۔ آپ کی مرضی ہے دل چاہے تو آ جایئے گا۔ نہ آنا چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں۔" وہ ایک دم بہت رُوڈ سا ہو کر بولا تھا۔

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی چند لمحے قبل زمانے بھر کا ہمدرد نظر آنے والا شخص، اپنے چہرے پر "نو لفٹ" کا بورڈ سجائے فائل کھولنے میں مصروف تھا۔

'عجیب شخص ہے یہ۔' میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے اس کے "نظریہ ہمدردی" نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔

یہاں تو ہر شخص اپنی ذات کے گنبد میں قید ہے۔ کوئی شخص اگر کسی کے آنسو بھی پونچھ رہا ہے تو میں نہیں مان سکتی کہ اس میں اس کی کوئی غرض پوشیدہ نہیں۔ میں نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے اس بڑی سی تصویر کو دیکھا جہاں ایک ہاتھ، ایک معصوم بچے کے گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو صاف کر رہا تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے انتہائی قریبی رشتوں کو سانپ کی طرح پھن پھیلائے ڈستے دیکھا ہے۔ ایسی صورت میں تمہاری ہنستی کھلکھلاتی زندگی کا فلسفہ ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ کچھ نہیں مسٹر جمشید آفندی!' میں نے سیاہ آہنی گیٹ سے باہر نکل کر اپنی کیڈلک کا ڈور لاک کھولتے ہوئے سوچا تھا۔



"دارالاطفال" سے نکل کر میں نے بے مقصد کتنی ہی سڑکیں روند ڈالی تھیں اور پھر لائبریری کی دھند میں لپٹی سفید عمارت کو دیکھ کر میں نے گاڑی روک لی تھی۔ لائبریری کا اندرونی ماحول باہر کی نسبت کافی گرم اور پُرسکون تھا۔ بہت سے لوگ کتابیں کھولے یوں مگن تھے گویا ہر لفظ میں ایک نئی دنیا دریافت کر رہے ہوں۔ کچھ لمحے گزرے اور پھر میں بھی نئی دنیاؤں کو کھوجنے لگی اور جب ان جانی انجانی زمینوں پر گھومتے پھرتے میرے قدم تھکنے لگے تب میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

سڑکوں پر لگے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ اردگرد عمارتوں میں ننھی منی روشنیاں بڑے اشتیاق و معصومیت سے بڑھتی ہوئی رونق کو دیکھ رہی تھیں اور دن کو اختتام پذیر ہوتے دیکھ کر مجھے انجانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔

'چلو کم از کم ایک دن تو میری زندگی سے خارج ہوا' میں نے تھکے تھکے ذہن سے سوچا۔

جب انسان کا اس دنیا پر اعتبار باقی نہ رہے تو شاید وہ دن کے اختتام پر یوں ہی مسرت محسوس کرتا ہوگا۔ میرا گھر جانے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی اس چھ کنال کی وسیع و عریض عمارت میں مجھے "گھر" جیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے اب میرا ٹھکانہ "شایان ریستوران" ٹھہرا تھا۔

اس کے وسیع و عریض سبزہ زار میں اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ گیٹ وے پر البتہ آنے جانے والوں کی چہل پہل موجود تھی۔ صبح کے وقت اس سبزہ زار میں بے حد رونق ہوتی تھی۔ لوگ مختلف ڈشز اُڑانے کے ساتھ ساتھ نرم گرم لطیف دھوپ کا مزہ بھی اٹھاتے تھے مگر اس وقت ساری رونق ریستوران کے اندرونی حصے میں منتقل ہو گئی تھی۔ گلاس ونڈوز سے اندر کے خواب ناک ماحول کا اندازہ ہو رہا تھا۔ کینڈل لائٹ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے لوگ، ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ینگ کپلز، مستعد باوردی ویٹرز، برتنوں کی کھنک، نت نئے کھانوں کا مزہ، کافی کی مہک، میں نے جیسے باہر کھڑے کھڑے اندرونی ماحول کو پوری طرح محسوس کیا تھا۔

'تو کیا یہ سب ہنستے مسکراتے، خوب صورت اور پیارے چہرے اندر سے اتنے ہی کریہہ اور بھیانک ہیں؟' کوئی آکٹوپس ایک بار پھر میری سوچوں پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اردگرد نظر دوڑائی۔ کچھ ویٹرز لان میں لگے تمام ٹیبلز ہٹا رہے تھے۔ میں ایک قدرے الگ تھلگ

میز کا انتخاب کر کے اس پر جا بیٹھی۔

'کم از کم یہاں بیٹھ کر کسی آشنا کے سامنے خود کو بے حد مطمئن ظاہر کرنے کی کوئی بے چارگی کی کوشش تو نہیں کرنی پڑے گی نا۔' میں نے قریب سے گزرتے ویٹر کو پکار کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر کیا۔ وہ بے حد حیرت سے میری طرف دیکھتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ میں بے اختیار ہی مسکرا دی تھی۔

''اب میں کیا بتاؤں تمہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی تمام حسیات کو مفلوج تصور کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے نہ وہ سن سکتا ہے، نہ بول سکتا ہے، نہ ہی کچھ محسوس کرنے کے قابل رہا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے کوئی بھی چیز اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی۔ نہ کسی کے آنسو، نہ مسکراہٹ، نہ کسی کی ہمدردی دل کو بھاتی ہے اور نہ ہی محبت کا اظہار۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس بات پر بھی شک ہونے لگتا ہے کہ اس کے سینے میں دل دھڑک رہا ہے اور اب سے کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا جیسے میری تمام حسیات مفلوج ہو چکی ہیں۔ مگر اب میں یہاں بیٹھ کر خود کو اس برفاب ہوا میں ٹھٹھرتے دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں۔ گویا ابھی بھی زندوں کی صف میں کھڑی ہوں۔'

میں نے گرم کافی کے بڑے بڑے گھونٹ لئے۔ اس کی گرمی نے اس سردی میں کافی سہارا دیا تھا مجھے۔

''شانزے! یہ تم ہی ہو نا؟'' قدرے حیران لہجے میں کہا گیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر آنے والے شخص کو دیکھا اور کافی کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ اور یہ آخری گھونٹ بے حد ثابت ہوا تھا۔

''تم یہاں کیوں بیٹھی ہو، اتنی سردی میں؟'' وہ پریشان و متحیر چہرہ لئے میرے سامنے آیا تھا۔ میں نے ایک گہرا اور طویل سانس کھینچ کر موسم کی ساری خنکی اپنے اندر جذب کر لینی چاہی۔

''کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟'' وہ اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ ارادتاً بیمار ہوتی رہتی ہوں۔

''بہت بری بات ہے شانزے! یہ تو سراسر خود اذیتی ہے۔''

''اوہ گاڈ۔ کیا دنیا کے باقی سب کام ختم ہو گئے ہیں جو ہر بندہ مجھ پر ریسرچ کرنے چلا آتا ہے۔''

میں نے جھنجلا کر بل میز پر پٹخا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ بنا پیچھے چلا آیا تھا۔

''رات کافی بیت گئی ہے۔ اب سیدھی گھر جانا۔''

''مسٹر! تم میرے گارجین نہیں ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔'' میں یہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھی تھی اور پوری قوت سے دروازہ بند کیا تھا۔ میری اس حرکت پر وہ زیر لب

مسکرایا تھا اور پھر ایک لمحے کے لئے کھڑکی میں جھکا تھا۔

''سنو! اپنا خیال رکھا کرو۔'' اس کے لہجے سے زیادہ اس کی نگاہوں میں نرمی تھی۔ اگنیشن میں چابی لگاتا میرا ہاتھ لمحہ بھر کے لئے رکا تھا۔

'معلوم نہیں کیوں، کبھی کبھی یہ شخص مجھے بالکل پاپا کی طرح لگتا ہے۔ ویسا ہی لوِنگ، ویسا ہی کیئرنگ۔ مگر اس کو ناپسند کرنے کے لئے کیا یہ جواز کم ہے کہ یہ احتشام احمد کا بیٹا ہے۔' میں نے سلگتی نگاہوں سے سائیڈ مرر میں ولید احتشام کے معدوم ہوتے عکس کو دیکھ کر سوچا تھا۔



''یہ آج کل تم کن چکروں میں پڑی ہوئی ہو؟'' گھر پہنچ کر میں ابھی اپنے پاؤں بھی جوتوں کی قید سے آزاد نہیں کر پائی تھی کہ مما میرے اعصاب پر سوار ہونے کے لئے آ پہنچی تھیں۔

''ملازمہ بتا رہی تھی کہ تم صبح ناشتہ کئے بغیر ہی نکل گئی تھیں۔ لنچ پر بھی تم نہیں آئیں۔ اور اب تم رات کے گیارہ بجے آ رہی ہو، جبکہ ہم لوگ ڈنر سے بھی فارغ ہو چکے ہیں۔''

''مما! یوں مڈل کلاس لوگوں کی طرح پوچھ گچھ کرنا آپ کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔ اور جس کلاس سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہاں اگر کوئی فرد رات کے ایک بجے بھی گھر میں داخل ہو تو بھی یہ پوچھنا حماقت سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں سے آ رہا ہے، کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔''

میں نے زہرخند لہجے میں انہی کے الفاظ دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ پاپا کے سوال پر کہا کرتی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور اگلے ہی لمحے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔

''آر یو آل رائٹ؟ یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو میرے ساتھ؟''

''یس، آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ۔ اور اس لہجے میں بات کرنا تو میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔'' میں نے ان کی حیران حیران آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی جرأت سے کہا تھا اور اسی جرأت پر مما کو پتنگے لگ گئے تھے۔ ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

''تم بے حد گستاخ اور بدتمیز ہوتی جا رہی ہو شانزے! آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہو تم؟ جب سے احتشام احمد اس گھر میں آئے ہیں، تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ جس کاروبار کی ہمیں الف، ب نہیں آتی ہم کیسے اس کی دیکھ بھال کر سکتے تھے؟ الٹا سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا اور ایک وقت آتا کہ یہ گاڑیاں، یہ بنگلہ اونے پونے فروخت کر کے کسی دو کمروں کے کوارٹر میں جا پڑے ہوتے ہم۔ ایسے میں اگر میں نے احتشام احمد سے شادی کر لی تو کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ تمہیں تو اس شخص کا شکر گزار ہونا

چاہیے جو......''

''اسٹاپ اِٹ مما! میرے سامنے اس شخص کے قصیدے پڑھنے سے بہتر ہے کہ آپ اِن احتشام احمد کے سامنے جائیں اور جی بھر کے اس کی شکر گزار ہولیں۔ تا کہ بدلے میں آپ کو مزید آزادی مل سکے۔ آپ جی بھر کے من مانیاں کر سکیں اور وہ کبھی میرے پاپا کی طرح آپ پر روک ٹوک کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔''

میں نے شدید غصے میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے بمشکل کہا اور پھر بھاگ کر ٹیرس پر آ گئی کہ اگر میں وہاں کھڑی رہتی تو شاید اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکتی۔

'کاش...... کاش میں کہیں چھپ سکوں۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس عورت کی پرچھائیں بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے جو بدقسمتی سے میری ماں کہلاتی ہے۔' ٹھنڈی یخ گرل سے پشت ٹکا کر میں نے پوری شدت سے خواہش کی تھی۔



بعض لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی میں سے ان ادھوری، ناتمام خوشیوں کا حصہ بھی ختم ہو گیا ہے جو کبھی پاپا کی زندگی میں مجھے نصیب تھیں۔

شاید اسی کو مقدر کا بانجھ پن کہتے ہیں کہ آپ نہ جرم کرنے والوں میں سے ہوں، نہ جرم سہنے والوں میں سے، مگر جب فیصلہ آئے تو معلوم ہو کہ ساری کی ساری سزا آپ کے حصے میں آئی ہے۔

خوشیوں کی، خوابوں کی، مسکراہٹوں کی عمر قید کی سزا۔

ہر پل ذہن و دل پہ پڑنے والے یاد کے کوڑوں کی سزا۔

مال و متاع چھن جانے کی سزا۔

اور سب سے اذیت ناک سزائے موت، جو جسم کو نہیں روح کو سہنی پڑتی ہے۔

اور بے چاری روح، سانسوں کا پھندا گلے میں ڈالے عمر بھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکی رہ جاتی ہے۔

'تو کیا میں بھی اپنے قدم کبھی زمین پر نہیں جما سکوں گی؟' کوئی خوف دھیرے دھیرے میرے وجود پہ سایہ کرنے لگا تھا۔ میں بے چین سی ہو کر اُٹھ بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' بہت احتیاط سے کیوٹکس لگاتی ونیزہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے مضمحل سے انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''میرا خیال ہے اب تم شاور لے لو۔ کچھ دیر میں مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔''

اس کے کہنے پر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آج اس کی منگنی کا فنکشن تھا، اس لئے میں یونیورسٹی سے سیدھی یہیں چلی آئی تھی اور حسب توقع مجھے سامنے پا کر پھپھو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر مجھے سینے سے لگائے، پیشانی پر پیار کرتے ہوئے پاپا کو یاد کرتی رہیں۔ پاپا، پھپھو سے چھوٹے تھے مگر ہمیشہ انہوں نے بڑے بھائی کی طرح پھپھو کا خیال رکھا تھا۔ اور پھر چونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا، اس لئے ان کی آپس کی محبت کی بھی مثال نہ ملتی تھی۔ پھپھو کے اس طرح رونے پر پاپا کی یاد جیسے ایک دم تازہ ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں ہم سے بچھڑے ایک سال نہیں، ایک لمحہ گزرا ہے۔

''پھپھو! اس طرح مت روئیں۔ پاپا کو تکلیف پہنچے گی۔ اور یوں بھی خوشی کا موقع ہے۔'' میں نے پاپا کی یاد میں بہنے والے سارے آنسو مقدس موتیوں کی طرح اپنی پوروں پر سمیٹ لئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ تو نارمل ہو گئیں مگر میرا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور اب کتنی ہی دیر سے آرام کی خاطر لیٹے رہنے کے باوجود میرا دماغ اپنے ہی بنے ہوئے سوچ کے جال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

شاور لے کر میں باہر نکلی تو ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ ونیزہ اپنے میک اپ میں مصروف ہو گئی تو میں ڈرائیر سے بال خشک کر کے ونڈو میں آ گئی تا کہ آنے والوں کا جائزہ لے سکوں۔ پھپھو اور انکل کا دائرہ احباب اگرچہ بہت وسیع تھا مگر منگنی میں صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو انوائٹ کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود خاصی رونق اور گہما گہمی تھی۔ پھپھو کو بہت عجلت میں آنے والے مہمانوں کو ریسیو کرتے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہاں کھڑے رہنا فضول ہے۔ لہٰذا میں ونیزہ سے کہتی ہوئی باہر آ گئی۔

اگرچہ تمام کام ملازموں کے ذمہ تھا، پھر بھی نگرانی تو بہرحال ضروری تھی۔ ونیزہ کی باقی کزنز گیسٹ روم میں اپنی نشست سنبھال چکی تھیں۔ یوں بھی وہ مہمانوں کی طرح یہاں آیا جایا کرتی تھیں جبکہ میں نے شاید اپنی آدھی زندگی اپنے گھر میں اور آدھی اس گھر میں گزاری تھی۔ لہٰذا میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ یہاں چائے اور کھانے کے تمام لوازمات کو چیک کر کے میں نے کچھ ہدایات جاری کیں اور پھر مطمئن ہو کر گیسٹ روم میں آ گئی۔ کچھ کزنز ونیزہ کے پاس جا چکی تھیں اس لئے میں وہیں بیٹھ کر باقی فرینڈز سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگی تھی۔

''ارے فصیحہ! کتنی دیر لگا دی تم نے آنے میں۔'' پھپھو کی آواز کانوں میں پڑی تو میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سیاہ مقیش لگی ساڑھی میں ملبوس مما اور ان کے پیچھے سیاہ ڈنر سوٹ میں احتشام احمد کو دیکھ کر میرے دل پر گھونسہ سا آ پڑا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا تھا، ایسے ہی ایک فنکشن پر جب میں صبح ونیزہ کے گھر آئی بیٹھی تھی، میں نے پھپھو کی بے قرار آواز سنی تھی کہ

"ایمان حسن! کتنی دیر لگادی تم نے آنے میں۔"

اور اب ایمان حسن کو کبھی نہیں آنا تھا۔ نہ جلد، نہ بدیر۔ محفل کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اور جب ونیزہ کے سسرالیوں کی آمد پر میں ونیزہ کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اتر رہی تھی تو ایک لمحے کے لئے چونک سی گئی تھی۔ ولید احتشام بڑی بے تکلفی سے ونیزہ کے منگیتر حماد کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ پُرلطف مسکراہٹ چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

"ونیزہ جی! آپ نے تو ہمیں انوائٹ نہیں کیا مگر دیکھ لیں، ہم آپ کی خوشی میں شریک ہونا نہیں بھولے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا وہ حماد کا انتہائی قریبی دوست تھا اور اسی حوالے سے حماد کے ساتھ آیا تھا۔

ونیزہ کو حماد کے برابر بٹھا کر میں چپکے سے پیچھے کھسک گئی تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی اور شوخ و شریر لڑکیوں کے درمیان مجھے اپنا گم صم سا وجود کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ لہٰذا میں ہال کمرے میں ٹیبل سیٹ کروانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو واپس جا پہنچی اور پھر مووی، تصاویر کا ایک طویل سلسلہ میں نے ونیزہ کے ساتھ مل کر ختم کیا۔ کھانے کے بعد مہمانوں نے جانے کا قصد کیا تو میں بھی اسی بہانے باہر چلی آئی اور اس وقت میں برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے لان میں گھومتے پی کاک اور پی ہین کو دیکھ رہی تھی جن کے سفید پَر چاندنی میں نہائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، جب ونیزہ، حماد کے ہمراہ چلی آئی۔

"اور جناب! یہ ہیں شانزے ایمان جو محض اتفاقاً اب تک آپ سے مل نہیں سکیں۔" اس نے حماد سے میرا تعارف کروایا۔

"افسوس کہ میں آج سے پہلے ان سے نہیں مل سکا۔" حماد نے شرارتی نظروں سے پہلے مجھے اور پھر ونیزہ کو دیکھا۔

"کاش میں آپ سے یہ کہہ سکتی کہ ایک اور انگوٹھی لے کر شان کو بھی پہنا دیں۔ کیونکہ ہم دونوں با آسانی آپ کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہیں۔ مگر اب یہ ممکن نہیں کیونکہ یہ میری دودھ شریک بہن ہے۔" ونیزہ کے کہنے پر میرے ساتھ ساتھ حماد نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی، یہ بچپن میں مجھ سے فیڈر چھین کر سارا دودھ ہڑپ کر جاتی تھی۔" اس کی بات پر حماد کے چہرے پر جاندار سی مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

"ویسے شانزے سے پوچھو، اگر یہ راضی ہو تو میں ابھی انگوٹھی اتار کر......" وہ اپنی ترنگ میں جو کہنے جا رہی تھی، میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا جبھی تو بے اختیار اسے ٹوک بیٹھی تھی۔

"ونیزہ! کبھی کبھی تم بغیر سوچے سمجھے بول جاتی ہو۔" میری سنجیدگی پر حماد نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ میں تو بس یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ یو آر لائیک مائی سسٹر۔" حماد نے میرا سر پکڑ کر ذرا سا ہلایا تو جواباً میں بھی مسکرا دی۔

"اچھا بھئی اب اجازت۔ انشاء اللہ پھر کسی دن تفصیلی ملاقات ہو گی۔" حماد نے باقی سب لوگوں کو گاڑی میں سوار ہوتے دیکھ کر کہا۔

"شیور، وائے ناٹ۔" میں نے بھی خوش دلی سے کہا اور انہیں رخصت کرنے آگے بڑھی۔ ونیزہ اپنی ہونے والی نند کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"ویسے حماد! آپ کو ونیزہ کیسی لگی ہے؟" چونکہ یہ رشتہ خالص بڑوں کی ایما پر ہوا تھا، اس لئے میں نے حماد کی رائے جاننے کی کوشش کی تھی۔

اس لمبے چوڑے شخص نے دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے کچھ دور کھڑی، سفید لباس پہنے پریوں سی ونیزہ کو دیکھا اور کچھ لمحوں بعد حلاوت آمیز لہجے میں اس نے کہا۔

"As fresh as dew."

"As innocent as dove."

"As fair as lily."

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ہزار جگنو رقصاں تھے۔ ایک طمانیت بخش کیفیت میرے دل میں اُترتی چلی گئی اور ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد جب میں نے ونیزہ کو حماد کی رائے سے آگاہ کیا اور اس کی رائے بھانپنے کی کوشش کی تو وہ چند لمحے تفکر کے بعد شرارتی لہجے میں بولی تھی۔

"As rich as jew."

"As tall as steeple."

"اوہ شٹ اپ ونیزہ!" میرے منہ بنانے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی اور اس ہنسی کی کھنک نے اس کے دل کے تمام راز مجھ پر افشا کر دیئے تھے۔

"چلو کمرے میں، یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔" اس کے کہنے پر میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

"میں ہمیشہ ماں کے لمس سے محروم رہا ہوں۔ مگر اب لگتا ہے۔ ساری تشنگی مٹ گئی ہے۔"

ولید احتشام کے الفاظ سن کر میری مسکراہٹ میرے ہونٹوں پہ اچانک ہی دم توڑ گئی تھی۔ چند قدم آگے جا کر منظر واضح ہوا تھا۔ ولید، مما کے کندھے پر بازو پھیلائے بڑی محبت سے کہہ رہا تھا۔

"اور اگر اس شخص پر مما کی اصلیت واضح ہو جائے تو کیا تب بھی یہ ان سے ایسی ہی محبت

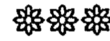
جتائے گا۔'

ونیزہ غالباً مجھے بیٹھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں غائب دماغی سے اس کے برابر بیٹھ گئی اور اپنی طرف بڑھا چائے کا کپ خاموشی سے تھام لیا۔

''ہاں، مجھے بھی تو اتنا فرمانبردار، پلا پلایا بیٹا مل گیا ہے۔'' مما کا لہجہ محبت و شفقت میں گندھا ہوا تھا، چائے کا پہلا گھونٹ مجھے بے حد بدمزہ لگا تھا۔

'کاش مما!....آپ ''محبت'' نامی لفظ سے آشنا ہوتیں تو جان سکتیں کہ آپ نے کتنی محبتوں کو کھویا ہے اور یہ نئی محبتیں...... چند روز بعد یہ بھی ریت کی طرح آپ کی مٹھی سے پھسل جائیں گی۔ اس لئے کہ محبت بدصورت چہروں پر تو مہربان ہوسکتی ہے، مگر بدصورت دلوں پر کبھی مہربان نہیں ہوتی اور آپ کے سینے میں دھڑکتا دل انتہائی مکروہ اور کریہہ ہے۔'

میں اردگرد کے ماحول سے بے نیاز، چائے کے کپ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی، جب ونیزہ نے مجھے ٹہوکا دیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا کہہ رہی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر نظروں کا زاویہ بدلا تو اس لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ کمرے کی دائیں طرف کاؤچ پر نیم دراز احتشام احمد کی زیرک نگاہیں میرے چہرے کو کھوج رہی تھیں۔ میں طویل سانس لے کر ان پر سے نظریں ہٹا کر ونیزہ کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی۔



ونیزہ کی منگنی کی خبر پورے ڈیپارٹمنٹ میں پھیل چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کلاس روم میں قدم رکھتے ہی ''ٹریٹ'' کے فلک شگاف نعرے سے گھبرا کر ہم دونوں باہر نکل آئی تھیں۔

''ارے ارے، بھاگ کہاں رہی ہو تم لوگ؟'' علی بھاگ کر ہم لوگوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''منگنی کی ہے تم نے۔ کوئی جرم نہیں کیا جو یوں فرار ہو رہی ہو۔'' مدیحہ اپنی سیٹ پر چلائی تھی اور ونیزہ منہ بنا کر کلاس روم میں داخل ہوگئی تھی۔

''افوہ، لگتا ہے ونیزہ کو انگوٹھی پسند نہیں آئی۔'' حیدر حسب عادت روسٹرم کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔

''تم سے کس نے کہا؟'' ونیزہ نے اسے گھورا۔

''تمہاری شکل دیکھ کر تو کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''جی نہیں، آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے جناب! انگوٹھی بھی بے حد پیاری ہے اور......'' اس کے ادھورے جملے پر حیدر کھنکار کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

''اگر واقعی تمہارے فیانسی بھی اتنے ہی پیارے ہیں جتنی یہ رنگ تو پھر ہم ڈبل ٹریٹ لیں

گے۔ کیوں شانزے؟'' رائمہ نے پہلے بغور ونیزہ کی انگلی میں پہنی رنگ دیکھی اور پھر مجھ سے رائے طلب کی اور میری پُرزور تائید پر ونیزہ چیخ اُٹھی تھی۔

''بروٹس یوٹو۔''

''مجبوری ہے بھئی۔ میں اس معاملے میں پوری طرح ان کے ساتھ ہوں۔'' میرے کہنے پر ونیزہ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پھر ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ پروفیسر رانا صادق صاحب سے اجازت لے کر انہیں دعوت دے کر یونیورسٹی میں ہی چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کرلیا گیا تھا اور بہت احتیاط سے کام لیتے لیتے بھی اچھا خاصا ہنگامہ ہوگیا تھا۔ نوید چپکے سے ارسلان کا لیگ پیس چرا کر سیدھا ہوا تھا تو اس کی پلیٹ سے کیک غائب تھا۔ نیلم اس بات پر شور مچا رہی تھی کہ فہد نے بڑا کے پورے چار پیس کھائے ہیں جبکہ باقی سب کے حصے میں صرف دو، دو پیس آئے تھے۔ سب اسٹوڈنٹس کے اصرار پر کسی گرم مشروب کی جگہ پیپسی کا انتظام کیا گیا تھا اور اس موسم میں جبکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سرد ہوا جسم سے ٹکرانے پر بے اختیار جھرجھری سی آجاتی تھی، جب پیپسی سب کے ہاتھوں میں آئی تو جی بھر کے اس شخص کو گالیوں اور کوسنوں سے نوازا گیا، جس نے سب سے پہلے اس کی نہ صرف فرمائش کی تھی بلکہ سب لوگوں کو ورغلایا بھی تھا۔

''بھئی پی لو سب لوگ۔ پارٹی کے اختتام پر گرما گرم چائے میری طرف سے۔'' ارسلان نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر سب کو خوش کر دیا تھا اور ان سب کاموں سے فارغ ہو کر پوری یونیورسٹی کا راؤنڈ لینے کی خواہش نوید نے ظاہر کی تھی۔ اور شاید یہ دن ہی ہر قسم کی بے تکی حرکتوں کا تھا۔ جبھی تو ہر کوئی راضی نظر آرہا تھا۔ نائلہ نے نخرہ دکھانے کی کوشش کی تو فہد جھٹ میدان میں کود گیا۔

''جو نہیں آئے گا، اسے ہم اٹھا کر لے جائیں گے۔'' وہ دونوں کزنز تھے اور ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ بھی تھے اسی لئے ایک دوسرے پر دھونس بھی جمالیا کرتے تھے۔

''یار! اس طرح واک کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ گانا وانا بھی ہونا چاہئے۔'' حیدر نے سرد ہوا سے بچنے کے لئے جیکٹ کے کالر کھڑے کئے۔

''جی ضرور۔ اسی سلسلے میں دعوت دی جاتی ہے جناب علی شیر کو۔'' ارسلان نے فرضی مائیک، علی کو تھمایا۔ علی نے ہلکا سا کھنکارا اور پھر پُرسوز آواز میں گانے لگا۔

ایسا کبھی سوچا نہ تھا
یوں بے وفا ہو جاؤ گے
آگ لگا کر دل میں میرے
اور کسی کے ہو جاؤ گے

وہ ونیزہ کے عین سامنے الٹے قدموں چلتے ہوئے بے حد دکھ سے گا رہا تھا۔

"سنو، کہیں یہ ونیزہ میں انٹرسٹڈ تو نہیں تھا؟" گانے کے بول سے متاثر ہو کر [illegible] نے بڑی دکھ بھری حیرت سے پوچھا۔

"پریشان مت ہونا سسٹر! یہ ہر لڑکی کے انگیج ہونے پر یوں ہی افسردہ ہوتا ہے۔" [illegible] نے تسلی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے مٹھی بھر کیشونٹ اپنی جیب سے میرے ہاتھ پر منتقل کیے۔ اس کی بات سن کر سب ہی بے اختیار ہنس دیئے تھے۔ اور جب اس خوشگوار پارٹی کے اختتام پر میں ونیزہ کو ڈراپ کر کے چرچ روڈ تک آئی تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ جاتے ہی اپنے بستر میں گھس جاؤں گی اور پھر ایک لمبی نیند لوں گی۔

ایک عرصے بعد مجھے اس مخصوص پریشان کن، سرد کیفیت کا زور ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا، جو پاپا کی ڈیتھ کے بعد سے مستقل مجھے اپنے گھیرے میں لئے رکھتی تھی۔ میری اس تبدیلی کو یقیناً ونیزہ نے بھی محسوس کیا تھا، جبھی وہ تمام عرصے میں بغور میرا جائزہ لیتی رہی تھی کہ آیا یہ مسکراہٹ جرا میرے ہونٹوں پہ سجی ہے یا واقعی کوئی خوشی دل سے بھی پھوٹی ہے۔

'اور یہ ہی تو مسئلہ ہے کہ جو لوگ ہماری رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں، انہیں ہم کسی صورت دھوکا نہیں دے سکتے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے نادانستگی میں ہم ایسے پیاروں کو بھی اذیت دیتے رہتے ہیں جو درحقیقت ہمارے اندر بستے ہیں اور جن کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم انہیں دھوکا دینا بھی چاہیں تو وہ باآسانی دھوکا کھا جائیں گے صرف ہمارے اطمینان کی خاطر......' میں نے موڑ کاٹتے ہوئے سوچا۔

'اور یہ ونیزہ بھی تو انہی لوگوں میں سے ہے۔ جس سے میں کچھ چھپانا چاہوں بھی تو جیسے سب خود بخود اس پر عیاں ہو جاتا ہے۔'

میں لاشعوری طور پر ہی اس کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ تب ہی اچانک سیاہ چادر میں لپٹی لپٹائی عورت ایک دم گاڑی کے سامنے آ گئی۔ فوری طور پر میرا پاؤں بریک پر نہ جا پڑتا تو گاڑی اس کے اوپر سے گزر جاتی۔ گاڑی کے وہیل پوری قوت سے چرچرائے تھے اور آتے جاتے کئی راہ گیروں کو متوجہ کر گئے تھے۔ اس احتیاط کے باوجود گاڑی ہلکی سی اس عورت سے ٹکرائی تھی اور وہ اُچھل کر دور جا گری تھی۔

"اوہ گاڈ" حادثہ اچانک ہی ہوا کرتا ہے مگر چونکہ میرا ساتھ یہ پہلا واقعہ ہوا تھا، اس لئے میں بے حد متوحش ہو کر اس عورت کی طرف لپکی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک بچہ اوندھے منہ گر کر زور و شور سے رو رہا تھا۔ غالباً وہ بچہ عورت نے چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا، جبھی اس بچے پر میری نظر

نہیں پڑی تھی۔ بہرحال اسے کسی راہ گیر نے اٹھا کر سیدھا کیا اور میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ بظاہر تو کسی چوٹ کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ وہ غالباً خوف کی وجہ سے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اپنے گرد پھیلے مجمعے کو دیکھا۔ اکثر لوگوں کے چہروں پر ناگواری ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسی ہی ناگواری، جو ایسے موقعوں پر گاڑی میں سوار کسی بھی فرد کے خلاف پیدل چلنے والوں کے چہرے پر باآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

"پلیز اسے اٹھانے میں میری مدد کریں تا کہ میں اسے ہاسپٹل لے جا سکوں۔" میں نے مدد طلب نظروں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر شخص فوراً آگے بڑھ آیا۔ اس عورت کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اس کا بچہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چپ کروانے کی کوشش کی مگر وہ بہت سہما ہوا تھا۔ وہ بمشکل ڈھائی، تین سال کا ہی تھا اور روتے ہوئے بار بار پلٹ کر ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہچکیوں اور متواتر بہتے آنسوؤں نے مجھے قدرے بوکھلا دیا تھا۔ اس لئے جس پہلے پرائیویٹ کلینک پر میری نظر پڑی تھی، میں نے وہیں گاڑی روک دی تھی۔

"صرف کمزوری کی وجہ سے اتنی دیر بے ہوش رہی ہے ورنہ کوئی چوٹ وغیرہ نہیں آئی۔ کیوں بی بی! کہیں درد یا تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

ڈاکٹر کے پوچھنے پر اس عورت نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی ہوش میں آئی تھی۔ اس کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ بچے کو گود میں لے کر اس نے تھپکنا چاہا مگر وہ مسلسل ریں ریں کئے جا رہا تھا۔

"بچے کو ٹھیک طرح سے چپ کرواؤ۔ وہ کب سے روئے جا رہا ہے۔" مجھے اسے ٹوکنا پڑا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ بچے کی پیشانی پہ ہونٹ رکھے وہ رو رہی تھی۔ مجھے اس سے بے حد ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

"سنو، کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔

"باجی! یہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہے اور میرے پاس......" باقی کی ساری بات اس نے آنسوؤں کی زبانی کہی تھی۔ اس کی بات سمجھ کر میں نے وہاں کے ایک ملازم سے کچھ فروٹ وغیرہ منگوایا اور جس طرح بچہ ٹوٹ کر کھا رہا تھا، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کئی پہروں سے بھوکا تھا۔

"اب مجھے اپنا ایڈریس بتا دو تا کہ تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں۔" کلینک سے باہر نکلتے ہوئے

میں نے پوچھا تو اس کی ویران آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔

''باجی! میرا کوئی گھر نہیں۔ میں کہاں جاؤں؟'' آنسو ایک بار پھر اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں یتیم و بے آسرا تھی اور اب بیوہ بھی ہوگئی ہوں۔ باجی! پتہ نہیں، میرے مقدر اتنے سیاہ کیوں ہیں؟ سسرال والوں نے برداشت نہیں کیا، گھر سے نکال دیا ہے جی۔ اب بتائیں میں کہاں جاؤں؟ کس گھر کا پتہ بتاؤں؟'' اس نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر گرا لئے تھے اور ٹوٹ کر رونے لگی تھی۔ ''پتہ نہیں، رب نے مجھ کالے نصیبوں والی کو کیوں بھیج دیا اس دنیا میں۔ مر گئی ہوتی میں بھی اسی دن جب ماں باپ کا سایہ مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ ہائے ماں! کہاں کہاں خوار ہوگی تیری بیٹی۔''

وہ عورت جیسے ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس عورت کو اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کرتے دیکھ کر میرے اندر سے چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔

''دیکھو پلیز! یوں مت روؤ۔'' میں نے بہت کمزور سی آواز میں اسے چپ کروانا چاہا۔ راہ چلتے کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ میں نے اسے بازو سے تھام کر اٹھایا۔

''باجی!...... آپ کو خدا کا واسطہ ہے، میری مدد کریں۔ آپ کسی امیر گھرانے کی لگتی ہیں۔ مجھے صرف چھت کا آسرا دے دیں۔ میں ساری عمر آپ کی خدمت میں گزار دوں گی۔ پاؤں دھو دھو کر پیئوں گی آپ کے۔ میرا یہ چھوٹا سا بچہ رُل جائے گا جی۔ خدا آپ کو اس نیکی کی جزا دے گا۔'' وہ ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھی اور میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔

گھر میں تو پہلے ہی ملازموں کی ایک فوج موجود تھی۔ ایسی صورت میں اس عورت کی جگہ کہاں بن سکتی تھی؟ تقریباً تمام کوارٹرز بھی زیرِ استعمال تھے۔ اور پھر اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ میں نے ایک نظر بچے کے معصوم سے چہرے پہ ڈالی اور اگلے ہی لمحے چھپاک سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا اور اسی خیال کی تکمیل کے لئے میں ایک مرتبہ پھر ''دارالاطفال'' جا پہنچی تھی۔

''کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔'' ساری بات سن لینے کے بعد جب عاصم نے فارمل سے انداز میں کہا تو میں نے طویل سانس لے کر کرسی چھوڑ دی تھی۔

''لو بھئی زہرہ! اب تم اطمینان سے یہاں رہو۔ اور عاصم صاحب! آپ کا بے حد شکریہ۔'' میں نے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا تو وہ بھی احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔

''شکریہ کی کوئی بات نہیں میڈم! کسی بھی بے سہارا فرد کو سہارا دینا ہمارے مذہبی فرائض میں شامل ہے۔ اور خاص طور پر خواتین اور بچوں کے لئے صلہ رحمی کے خاص احکامات نازل ہوئے

ہیں۔'' اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا تھا اور میں مسکرا کر اس کی بات کی تائید میں سر ہلا کر باہر نکل آئی تھی اور ابھی میں کوریڈور کی سیڑھیوں سے اُتری ہی تھی جب اچانک بڑا سا فٹ بال میرے کاندھے پہ آ لگا تھا۔ چونکہ حملہ بہت اچانک تھا، اس لئے میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی تھی۔ فطری طور پر غصے کی ایک تیز لہر میرے وجود میں دوڑ گئی تھی۔ تب ہی اچانک کچھ بچے بھاگتے ہوئے میرے قریب آ گئے تھے۔

''ارے آنٹی! کیا یہ فٹ بال آپ کو لگا ہے؟'' ایک بچہ بے حد حیران لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''پھر تو چوٹ بھی آئی ہوگی۔'' دوسرے نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بڑے دکھ سے کہا تھا۔

''ہیں...... پھر تو فرسٹ ایڈ کا بندوبست کرنا چاہئے۔ جاؤ بھاگ کر کمبل لاؤ۔ آنٹی کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔'' پہلے بچے نے گھبرا کر کہا تھا۔

''بے وقوف! چوٹ لگنے پر کمبل نہیں ڈالتے، آگ لگنے پر ڈالتے ہیں۔'' دوسرے بچے نے پیشانی پر ہاتھ مار کر اس کی کم عقلی پر ماتم کیا تھا۔ جبکہ میں ان کی بات سن کر بے ساختہ ہی ہنس دی تھی۔

''آنٹی! چوٹ لگنے پر تو روتے ہیں اور آپ ہنس رہی ہیں۔'' اس بچے کی معنی خیز بات پر میں ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہوگئی تھی۔

''ہاں، مگر......'' میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ 'شاید ہم اپنی بے بسی پر ہنستے ہیں۔'

''آنٹی! آپ ہماری نئی ٹیچر ہیں؟''

''نہیں۔ میں تو بس آج ہی آئی ہوں۔''

''آپ روز کیوں نہیں آتیں؟''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اتنی سردی میں کھیلنا ضروری ہے کیا؟'' میں نے ان کے بے تکے سوالوں سے جان چھڑاتے ہوئے ان کے سرخ سرخ چہروں کو دیکھا۔

''ابھی تو اسٹڈی آور ختم ہوئے ہیں۔ بس تھوڑا سا کھیلیں گے، پھر میوزک کی کلاس شروع ہو جائے گی۔''

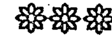
''اچھا یہ تو بتائیں آپ کا نام کیا ہے؟'' میں قریبی بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔

''مالیکول۔'' پہلا بچہ ابھی بولا بھی نہیں تھا کہ دوسرے نے جھٹ سے جواب دیا تھا۔

''جی نہیں، میرا نام شاویز ہے۔''

''اور میرا نام فاران۔'' دوسرے بچے نے فٹ بال زمین پر اچھالتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! آپ کا نام کیا ہے؟" شاویز خاصا سمجھ دار بچہ تھا۔
"میرا نام تو شانزے ہے۔ مگر آپ مجھے شان کہہ سکتے ہیں۔ میرے پاپا مجھے شان کہا کرتے تھے۔"
"شان۔ ہاؤ کیوٹ نیم۔" فاران نے آنکھیں میچ کر کہا۔ "میرے پاپا بھی مجھے فانی کہتے ہیں۔"
"پاپا......" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیونکہ میری انفارمیشن کے مطابق یہاں یتیم بچوں کی پرورش کی جاتی تھی۔ "فانی! آپ کے پاپا ہیں؟" میں نے قدرے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔
"جی بالکل۔" فانی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
"شان! آپ ملی نہیں آفندی پاپا سے؟" شاویز یوں متعجب تھا، جیسے میں کسی بہت بڑی شخصیت سے ملنے سے محروم رہ گئی ہوں۔
"اوہ۔" بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس ادارے کا سرپرست ہونے کے باعث یقیناً وہ بچوں کے باپ کی سی حیثیت ہی رکھتا تھا۔ ابھی میں شاویز کو کوئی جواب بھی نہ دے پائی تھی، جب کہیں دور سے بہت پیاری، نقرئی سی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ایک دم چونک گئے تھے۔
"میوزک پیریڈ شروع ہو گیا۔ اب ہم چلتے ہیں۔" انہوں نے اپنے ننھے منے ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔
"او کے، اللہ حافظ!" میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"شان! آپ بہت اچھی ہیں۔" چند قدم چلنے کے بعد فانی میری طرف پلٹا تھا۔
"آپ دوبارہ آئیں گی نا؟" شاویز کی آنکھوں میں اُمید کی کرن تھی۔
اور کیا بچوں سے بڑھ کر کوئی حسین چیز ہو گی اس دنیا میں۔ معلوم نہیں وہ بچے واقعی اتنے خوب صورت تھے یا مجھے محسوس ہو رہے تھے۔
"ہاں ضرور آؤں گی۔" میں نے آگے بڑھ کر ان کے نرم گالوں کو اپنی اُنگلیوں سے چھوا تو ان کی محبت کا لمس جیسے پورے جسم کو گرما گیا تھا۔
"تھینک یو، بائے۔" وہ دونوں ہاتھ ہلا کر بھاگ گئے تھے اور میں نے بھی واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے تھے۔



کروٹ بدل کر میں نے مندی مندی آنکھوں سے ٹائم دیکھا۔ پونے ایک بج رہے تھے۔

گہری اور طویل پُرسکون نیند لے کر میرے اعصاب کافی سکون محسوس کر رہے تھے۔ کچھ دیر یوں ہی لیٹے رہنے کے بعد میں نے تمام بال کلپ میں جکڑے اور بیڈ سے اُتر آئی۔
میری ہدایت کے پیشِ نظر کسی نے بھی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر خشک کرنے کے بعد جب میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو ایک دم جھرجھری لے کر رہ گئی۔ شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے میں سیڑھیاں اُتر کر کچن میں آ گئی تھی۔
یونیورسٹی سے واپسی پر میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اسی لئے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے فریج کا جائزہ لے کر بریانی نکال کر گرم ہونے کے لئے اوون میں رکھی اور خود چائے بنانے لگی۔
"میرے لئے کافی وِد آؤٹ شوگر اینڈ کریم۔" ایک مانوس سی پکار لاؤنج سے سفر کرتی مجھ تک پہنچی تھی۔ میری نگاہیں بے اختیار ہی بھٹکتی ہوئی لاؤنج میں جا پہنچی تھیں۔ متلاشی و متجسس نگاہیں، کسی کو ڈھونڈتی، کھوجتی ہوئی۔ مگر اسی پل تمام تر بے قراری و بے چینی کو اپنے اندر سمو کر واپس پلٹ آئی تھی۔
'کمال ہے پاپا! منوں مٹی تلے جا سوئے آپ......لیکن ابھی بھی یوں لگتا ہے ہر قدم پر آپ میرے ساتھ ہیں۔ میں یہاں چائے بنا رہی ہوں اور آپ لاؤنج میں کافی کے منتظر بیٹھے ہیں۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ اور ابھی جب میں بیڈروم واپس جا رہی ہوں گی تو آپ اپنے اسٹڈی روم سے نکل کر اچانک ہی میرے سامنے آ جائیں گے۔
"شب بخیر پاپا کی جان!" آپ کی دھیمی سی آواز چاروں طرف پھیلی خاموشی میں نازک سا ارتعاش پیدا کر دے گی اور آپ کے وجود کی نرم، گرم خوشبو صبح تک مجھے اپنی آغوش میں لے کر تھپکتی رہے گی۔ مگر پھر بھی پاپا! ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود یہ احساس مسلسل مجھے ڈستا رہتا ہے کہ آپ کہیں نہیں ہیں۔ نہ اپنے اسٹڈی روم میں، نہ لاؤنج میں، نہ بیڈروم میں اور نہ ہی کہیں اور......' کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے ذرا سی چائے میرے ہاتھ پہ گری تو میں یکلخت ہی خیالات کے چنگل سے آزاد ہو گئی۔
بے اختیار ہی ہاتھ کھینچ کر میں نے جائزہ لیا۔ کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھو کر میں چائے کا کپ اٹھائے ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ بار بار چینل بدلنے کے باوجود دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آیا تو میں نے جھنجلا کر ریموٹ کنٹرول صوفے پر لڑھکا دیا۔ بے وقت سونے کی غلطی پر پچھتاتے ہوئے میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اتنا ڈھیر سارا وقت کن کاموں میں صرف کیا جائے جب اچانک کوئی میرے نزدیک ہلکا سا کھنکارا تھا۔ سناٹے میں یہ آواز میرے

لئے اتنی غیر متوقع تھی کہ میں ایک دم خوف سے کانپ گئی تھی۔

''اوہ......شاید تم ڈر گئیں۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ لیکن میں تو کوریڈور کی لائٹیں آن کر ہوا آیا ہوں اور میرا خیال تھا، قدموں کی چاپ سن کر تمہیں یقیناً اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کوئی فرد اِدھر طرف آرہا ہے۔'' احتشام احمد نے دائیں طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں دیکھ کر غصہ اور ناگواری کی تیز لہر میرے دل سے اٹھی اور چہرے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اتنی وضاحت کی تھی۔ میں نے بچی کھچی چائے سمیت کپ میز پر پٹخا اور چپل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ احتشام احمد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے حیرت سی نمودار ہوئی۔

''شانزے! میں رات کے ڈیڑھ بجے یہاں ٹی وی پروگرام دیکھنے نہیں آیا۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں نے آپ سے یہاں آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔ اور یوں بھی میں اس وقت فارغ نہیں ہوں۔'' میں بے اعتنائی سے کہہ کر پلٹی۔

''شانزے پلیز۔'' انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ پکارا تھا۔

''کبھی کوئی شخص پیچھے سے آواز دے تو پلٹ کر ایک مرتبہ ضرور دیکھنا چاہئے۔'' پاپا نے ایک مرتبہ مجھے کہا تھا اور اس وقت یہی بات مجھے اگلا قدم اٹھانے سے روک گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بڑی امید سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے دوبارہ بیٹھتے دیکھ کر انہوں نے جیسے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

''جو کہنا ہے جلدی کہئے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ انہوں نے کچھ دیر کے لئے ٹی وی اسکرین کو دیکھا اور پھر مجھے۔ وہ غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔

''شانزے! معلوم ہے، جب فصیحہ نے مجھے تمہارے متعلق پہلی بار بتایا تھا تو میرے ذہن میں ایک بہت خوب صورت سا تصور ابھرا تھا۔ میں نے سوچا تھا، شانزے ایک پیاری سی گڑیا کا نام ہو گا جو کومل سی کانچ جیسے جذبات کی مالک، روپہلی چاندنی کی طرح معصوم اور سورج کی اولین کرنوں کی طرح شوخ و شریر، نٹ کھٹ سی ہو گی۔ بیٹیاں تو ایسی ہی ہوتی ہیں نا؟''

انہوں نے جیسے مجھ سے تائید چاہی تھی۔ میں چپ چاپ میز کی سطح کو گھورتی رہی۔

''میں نے سوچا، وہ گڑیا اپنے پاپا کی جدائی کے صدمے سے مرجھا کر رہ گئی ہو گی۔ میں نے ہزار طریقے سوچے تھے اسے بہلانے کے۔ میرا خیال تھا، میں اسے بے انتہا محبت اور بے شفقت بھری چاہت دوں گا کہ وہ ایک بار پھر سے کھل اٹھے گی مگر......'' وہ ایک لمحے کے رکے تھے اور میں نے بمشکل خود کو اٹھنے سے باز رکھا تھا اور اسی لمحے مجھے معلوم ہوا تھا کہ کسی

ناپسندیدہ ہستی کو مسلسل سننا کس قدر ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

''میں نے جہاں جہاں بھی تمہاری زندگی کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی، وہاں وہاں تمہارا گریز، تمہاری نفرت میری راہ روکتی چلی گئی۔ کتنے مہینے گزر گئے مجھے یہاں آئے ہوئے مگر تمہارے روّیے میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فصیحہ کا خیال ہے کہ میں تمہاری بلا جواز نفرت کا شکار ہو رہا ہوں۔ لیکن میں اسے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ میرے خیال میں محبت تو بلا جواز کی جا سکتی ہے مگر نفرت نہیں۔ اور اگر تم میرے ساتھ نفرت کرتی ہو تو اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔''

مجھے اپنے وجود میں گرم گرم سی لہریں اس شدید سردی کے باوجود بھی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے اس شخص پر بے حد غصہ آرہا تھا جو خوامخواہ خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''میں جانتا ہوں، بیٹیاں ماں کی نسبت باپ سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں، انہیں زیادہ چاہتی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں شانزے! کہ تم مجھے اپنے پاپا کی جگہ اس گھر میں قبول نہیں کر رہیں؟ اگر ایسا ہے تو تم بلاجھجک مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ میں صرف فصیحہ کے کہنے پر یہاں سکونت اختیار کئے ہوئے ہوں۔ لیکن اگر تم ڈسٹرب ہوتی ہو تو میں اپنے گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا۔ لیکن تم اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں زبردستی تمہارے پاپا کی جگہ پر قبضہ جما رہا ہوں۔ میرے ذہن میں تمہارے روّیے کی یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے لیکن اور بہت سی باتوں کو بھی میں نظرانداز نہیں کر رہا۔ ہو سکتا ہے تم مجھے کوئی لالچی انسان سمجھ رہی ہو جو تمہارے خیال میں محض دولت، جائیداد کے حصول کے لئے اس گھر میں قدم جما رہا ہو۔ یا پھر یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجھ سے شادی کرتے وقت فصیحہ نے تمہیں اعتماد میں نہ لیا ہو یا پھر اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی وجہ جس سے ہو سکتا ہے میں واقف نہ ہوں۔'' ان کی نظریں مجھے اندر تک کھوج رہی تھیں۔

اب میرے لئے خاموش رہنا ناممکن تھا اس لئے بے حد سرد مہری سے میں ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

''پہلی بات تو یہ ہے مسٹر احتشام احمد! کہ پاپا کی جگہ اس گھر میں نہیں میرے دل میں ہے۔ اور اس دل سے نہ انہیں کوئی ہٹا سکتا ہے اور نہ زبردستی ان کی جگہ لے سکتا ہے۔ باقی رہ گئی دولت اور جائیداد تو اس سلسلے میں مجھے کسی قسم کی کوئی فکر ہے نہ کسی سے کوئی خطرہ ہے۔ کیونکہ میری مما کو اس دنیا میں دو ہی چیزوں سے محبت ہے اور وہ ہے دولت اور آزادی۔ اور ان دونوں چیزوں کی حفاظت کرنا وہ خوب جانتی ہیں۔ اور آخری بات یہ ہے احتشام صاحب! کہ میں محبت بھی ٹوٹ کر کرتی ہوں اور نفرت بھی۔ میری نفرت کا جواز اتنا معمولی ہرگز نہیں ہو سکتا جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔ اور میرا

خیال ہے آپ اتنے معصوم اور انجان ہرگز نہیں جتنا خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' بڑ
زہر خند لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر ان کے سامنے
سے ہٹ گئی تھی۔ ان کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بن گیا تھا اور ان کی اُلجھی اُلجھی نظروں نے اس
وقت تک میرا پیچھا کیا تھا، جب تک میں اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے گم نہیں ہو گئی تھی۔

'اور میں کیسے مان لوں احتشام احمد! کہ اس سارے کھیل میں تمہارا کوئی حصہ نہیں تھا؟'

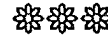
میں نے کمرے کی کھڑکی کو کھول کر سرد ہوا کو جی بھر کے کمرے میں داخل ہونے دیا۔ لمبے
لمبے سانس لے کر میں نے اپنے اندر کی ساری گھٹن باہر نکال دینی چاہی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر
کہنیاں جما کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دُکھتے ہوئے سر کو تھام لیا اور پھر میں نے نجانے
کتنی دیر یونہی خود کو نارمل کرتے ہوئے گزار دی تھی۔

سرد ہوا میرے جسم سے ٹکرا کر پلٹتی رہی اور وقت گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب میرا
پورا جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ میں نے بہت آہستگی سے اپنے جامد اعضاء کو حرکت دی اور سیدھی
ہو کر کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا دی۔ آسمان کے سینے پر روشن پورا چاند ست روی سے اپنا سفر طے
کر رہا تھا۔ کھڑکی سے ذرا آگے ٹیرس پر رکھے وائٹ بیم کی پتیاں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔
میں نے گردن گھما کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی پاپا کی خوب صورت سی تصویر کو دیکھا اور پھر قریب آ
کر تصویر کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا۔

''پاپا! میں تو صرف آپ کی بیٹی ہوں نا...... صرف آپ کی۔'' میں نے جیسے سرگوشی میں انہیں
مخاطب کیا تھا۔

'اور اس شخص کو یہ گمان بھی کیسے گزرا کہ وہ آپ کی جگہ لے سکتا ہے؟' میں نے اپنے ہاتھ کی
پوروں سے تصویر کو چھونے کی کوشش کی۔

کبھی نہیں...... کبھی نہیں پاپا!...... وہ شخص دوسرا جنم لے لے، تب بھی وہ آپ کی جگہ نہیں لے
سکتا۔'' میں تصویر پر اپنا چہرہ ٹکا کر سسک اُٹھی تھی۔



اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں مسلسل اٹھتے گرتے قدموں کا طواف کر رہی تھیں۔ اس کے
جوتے راستے کی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ بے تحاشا تھکن اس کے جسم میں خون کے ساتھ ساتھ
سفر کر رہی تھی۔

''میں کون ہوں؟''

''کہاں سے آیا ہوں؟''

''مجھے کہاں جانا ہے؟''

اس نے زیرِ لب پوچھا تھا۔ اپنے آپ سے، اپنے سر پر ڈولتے پرندوں اور دور تک بل کھاتی
سیاہ سڑک سے۔

مگر جواب میں ایک سنسان اور دبیز خاموشی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے
لیے رک کر کچھ سوچا۔

'کتنے سال بیت گئے...... یا شاید کئی صدیاں۔ میں یونہی حالتِ سفر میں ہوں، مڑ کر پیچھے
دیکھتا ہوں تو لگتا ہے ابھی قدم بھر مسافت بھی طے نہیں ہوئی۔ میرے پاؤں اپنی جگہ ساکت ہیں۔
سفر کے آغاز سے لے کر آج تک صرف زمانے بدلے ہیں۔ راستہ اور مقام وہی ہے۔ میں بھی
وہیں کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا۔ ہاں مگر زمین گردش میں ہے۔'

اس نے سر اٹھا کر رنگ بدلتے آسمان کو دیکھا۔

'جب میں نے سفر کا آغاز کیا تھا تو ہر چیز جیسے اپنے نقطہ آغاز پر تھی اور اب دن اپنی تمام تر
مسافت کو سمیٹے رات کی آغوش میں پناہ لینے جا رہا ہے۔ شاہ خاور اپنی نیم خوابیدہ کرنوں کو لے کر کسی
دُور دیس میں جا اُترے گا۔

پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کی سمت محوِ پرواز ہیں۔ منزل کو چھو لینے کی جستجو میں ان
کے نازک پَر برفاب ہوا کو کاٹتے چلے جا رہے ہیں۔

اور میں؟...... میں منزل کو کھوجنے کی کوشش کرتا ہوں تو آنکھوں میں دُھند اُتر آتی ہے۔ اور
طویل لامتناہی، بل کھاتی سڑک بھی کہیں راہ میں کھو سی گئی ہے۔'

اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے لگا وہ بہت دیر سے ایک ہی جگہ کھڑا ہے۔ اس
کے ساتھ ساتھ چلتے شاہ بلوط کے درخت بھی اس کے ساتھ ٹھہر گئے تھے۔ اس کے قدموں تلے
گردش کرتی زمین بھی تھم گئی تھی۔

آج کا سورج اُفق کی بجائے اس کی آنکھوں میں ڈوبا تھا اور وہ کھلے آسمان تلے تاریکیوں
میں مدغم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے قدموں میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔

'تو گویا ٹھہر جانا بھی نصیب نہیں۔' اس نے بے بسی سے قدم اٹھائے۔ زمین ایک مرتبہ پھر
گردش میں تھی۔

'اور کیا معلوم ان شکستہ قدموں تلے زمین ہے بھی کہ نہیں۔' اس نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی
جیبوں میں گھساتے ہوئے سوچا تھا۔ اس کے چاروں طرف فضا جامد تھی۔ صرف پاؤں متحرک
تھے۔ رات کی یخ بستہ دہلیز پہ بکھرا سناٹا اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ اس نے شدت سے کسی ہم سفر کی

چاہ کی تھی اور اس کے دل میں بکھری تنہائی نے کسی خواب کے فسوں سے آزاد ہو کر اس کے گلے
میں باہیں ڈال دی تھیں

ہم بے نشان لوگوں کو
راستہ نہیں ملتا
راستہ جو مل جائے
منزلیں نہیں ملتیں
منزلیں جو مل جائیں
خود کو مل نہیں پاتے
خود کو مل نہیں پاتے

اس کی تنہائی اسے بہلا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک سمندر جاگ رہا تھا۔
'میں تو آج تک خود سے نہیں مل سکا..... خدا جانے میں ہوں بھی یا نہیں۔' اس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں اور رات کے رخسار نم ہوتے چلے گئے تھے۔ دور کہیں روشنیاں سی جگمگاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"شاید بستی نزدیک ہے۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔

"صاحب! آپ آ گئے ہیں؟" گلزار خان کی آواز کہیں قریب سے اُبھری تھی۔

اس نے سر اُٹھا کر دیکھا..... بلند و بانگ سیاہ آہنی گیٹ اس کے عین سامنے تھا اور اس کے پار ایک دنیا اس کی منتظر۔

"صاحب! گاڑی کدھر ہے؟ آپ پیدل کیوں آئے ہیں؟" گلزار خان کا متفکر چہرہ دیکھ کر اس کے چہرے پہ مسکراہٹ لہرائی تھی۔

"گاڑی خراب ہو گئی تھی خان!" اس نے کہتے ہوئے سیاہ گیٹ عبور کیا۔

"آفندی پاپا کب آئیں گے؟"

"وہ کھلونے لے کر آئیں گے نا؟"

"وہ ہمیں سیر کے لئے بھی لے کر جائیں گے۔"

"وہ آ کیوں نہیں جاتے؟"

زندگی سے بھرپور آوازیں رات کے معصوم سناٹے پر کندہ ہو رہی تھیں اور اس کے وجود پر بھی تھکن زدہ تنہائی لمحہ بھر میں چیخ گئی تھی۔ اس نے خالی ہتھیلیاں اپنے سامنے کر لیں۔

نہ کوئی کھلونا..... نہ مٹھائی..... نہ تحفہ..... کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔

"آفندی پاپا! جلدی آ جائیں۔" کوئی محبت آمیز بے قراری سی دعا سنائی دی تھی۔
'اگرچہ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ مگر انہیں دینے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے۔' اس نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔



میں نے تھک کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔ میرے سامنے ٹیبل پر کتابوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا، جو ونیزہ جاتے ہوئے چھوڑ گئی تھی۔ آج اس نے اسائنمنٹ تیار کرنے کے لئے پوری لائبریری خالی کر ڈالی تھی مگر واپسی پر حماد اسے پک کرنے چلا آیا تھا۔ ان کے بے حد اصرار کرنے پر بھی میں نے ان کے ساتھ لنچ پر جانے سے معذرت کر لی تھی۔ سو ونیزہ ناراضگی کے طور پر کتابوں کا یہ ڈھیر میری گود میں ڈال کر چلی گئی تھی اور اب تین گھنٹے کی مسلسل عرق ریزی کے بعد اسائنمنٹ مکمل کر کے ہی میں نے کتابوں سے سر اٹھایا تھا اور Rhythm of the world سنتے ہوئے میں خود کو ریلیکس کر رہی تھی۔

"بی بی جی! اس میں کیا ہے؟" ملازمہ کی آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دیوار گیر وارڈروب میں کپڑوں کی ترتیب درست کر رہی تھی اور اب ایک شاپنگ بیگ ہاتھ میں پکڑے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے حیرت سے اس شاپنگ بیگ کو دیکھا۔

"اوہ۔" چند لمحوں بعد مجھے یاد آیا تھا۔ "دارالاطفال" سے آنے کے اگلے روز میں ونیزہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں جب ونیزہ حماد کو گفٹ دینے کے لئے کوئی ڈیڑھ، دو انچ کا بھالو خرید رہی تھی، مختلف کھلونوں کو دیکھتے ہوئے مجھے بے اختیار ہی شاویز اور فاران یاد آ گئے تھے۔ سو میں نے اپنے پرس میں موجود تمام پیسے چھوٹے، بڑے کھلونے خریدنے میں خرچ کر دیئے تھے۔ خیال تھا کہ ایک دو روز میں جاؤں گی اور بچوں کو کھلونے دوں گی مگر یہ بات پھر ایسے ذہن سے نکلی تھی کہ آج ہی یاد آئی تھی۔

"اسے باہر ہی رہنے دو۔" میں ملازمہ سے کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

ونیزہ کے اتنی جلدی آنے کی مجھے امید نہیں تھی، اس لئے میں نے ابھی جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"سنو، ونیزہ آئے تو اسے کہنا ابھی گھر مت جائے۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گی۔"

سرمئی کھدر کے سوٹ کی شکنیں میں نے ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے ملازمہ کو ہدایت دی اور پھر شاپنگ بیگ لے کر باہر آ گئی۔ مما کے بیڈروم سے زور و شور سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً ان کی کوئی قریبی دوست آئی ہوئی تھی، جبھی تو ڈرائنگ روم کی بجائے بیڈ روم میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ ان کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر ایک بھی نگاہ ڈالے بغیر

میں آگے بڑھ گئی تھی۔

''دارالاطفال'' کا پٹھان چوکیدار حسب سابق مجھے سرتا پا گھورنے کی بجائے نہ صرف خوش مزاجی سے مسکرایا تھا بلکہ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام بھی داغ دیا تھا۔

''سنو! بچے اس وقت کہاں ہوں گے؟'' عمارت کے دائیں طرف بنے وسیع و عریض خالی لان اور ساکت جھولوں کو دیکھ کر میں نے چوکیدار سے پوچھا تھا۔

''ان کا تو اس وقت......'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ''ہاں جی، ان کی اس وقت مارشل آرٹ کی کلاس ہو رہی ہے۔''

''مارشل آرٹ کی؟'' میں واقعی حیران ہوئی تھی۔ ''یہ تم کیا کچھ سکھاتے ہو بچوں کو؟''

''بیگم صاحبہ! ہم انہیں ہر وہ چیز سکھاتے ہیں جو اکیسویں صدی کے بچوں کو سیکھنی چاہئے۔ صبح کے وقت انہیں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ پھر کمپیوٹر کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ پھر جناب! ان کی میوزک اور ڈرائنگ اور پھر مارشل آرٹ کی کلاسیں ہوتی ہیں۔'' وہ رٹو طوطے کی طرح ایک دم شروع ہو گیا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے مجھے شاویز اور فاران سے ملنا تھا۔'' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس ادارے کی ہسٹری سے بھی واقف نہ ہو، سو میں نے فوراً کہہ دیا تھا۔

''ابھی بلاتے ہیں۔ ویسے زہرہ نے کہا تھا کہ کبھی آپ آئیں تو اس کو ضرور خبر کروں۔'' مجھے ایک دم ہی اس کا خیال آ گیا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے، اسے بھی بلا دو۔'' میں وہیں بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔ مگر چوکیدار نے کسی ملازم کو پیغام دے کر اندر بھجوا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی زہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی میرے پاس آ گئی تھی۔ وہ پہلے کی نسبت مطمئن لگ رہی تھی اور میرے ساتھ بیٹھ کر وہ تقریباً پندرہ منٹ تک خشوع و خضوع کے ساتھ مجھے دعاؤں سے نوازتی رہی تھی۔

''بھئی میرا تو اس میں کوئی کمال نہیں۔ تمہیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہئے جن کی وجہ سے تمہیں اور تمہارے بچے کو تحفظ مل گیا ہے۔'' بالآخر مجھے ٹوکنا پڑا تھا۔

''ہاں جی۔ ان کو تو جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیتی ہوں۔ کل آئے تھے جی آفندی صاحب۔ میں بھی ملی تھی ان سے۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ اللہ ان کی ہر مراد پوری کرے انہیں ان کی ہر نیکی کا صلہ دے۔''

''آفندی صاحب یہاں نہیں رہتے کیا؟''

''نہیں جی۔ سنا ہے، کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتے ہیں۔ یہاں بس

کچھ دنوں کے لئے آتے ہیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کا ایک پاؤں یہاں ہوتا ہے اور ایک ملک سے باہر۔'' زہرہ سے بات کرتے کرتے میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے واپس بھی جانا تھا اور بچوں کا دور دور تک کہیں نشان نہیں تھا۔ میں نے زہرہ سے ذکر کیا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں انہیں خود بلا کر لاتی ہوں۔''

اور تھوڑی دیر بعد جب میں کافی بور ہو رہی تھی، سامنے سے تین بھالو لڑھکتے ہوئے میری طرف آتے دکھائی دیئے۔ سفید اُونی لباس میں ان تینوں بچوں کو دیکھ کر میری ساری بوریت ختم ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ دور آ کر رکے، جھجکے اور پھر آہستہ سے نزدیک چلے آئے۔ ان کی سانسیں بھاگنے کی وجہ سے پھول رہی تھیں اور چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

''ادھر آؤ نا میرے پاس۔'' میں نے پیار سے انہیں پکارا تو وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں آ گئے۔

''آپ بالکل بھی اچھی نہیں ہیں۔'' شاویز کا لہجہ ناراضگی لئے ہوئے تھا۔

''کیوں بھئی؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں اور فانی ہر روز آپ کا انتظار کرتے تھے مگر آپ آئی ہی نہیں۔''

''اوہ سوری بھئی۔ اصل میں، میں بھی پڑھتی ہوں نا، اس لئے مصروفیت میں وقت ہی نہیں نکال سکی۔ دیکھو، آج جیسے ہی فارغ ہوئی فوراً یہاں چلی آئی۔'' میں نے دل میں پشیمان ہوتے ہوئے ان سے بہانہ کیا۔

''ویسے یہ گڑیا کون ہے؟ آپ نے تعارف ہی نہیں کروایا۔'' میں نے اس گم صم سی بچی کو دیکھا جس کی سیاہ خاموش آنکھیں اس کے دل کی حساسیت کا پتہ دیتی تھیں۔

''یہ عینی ہے میری دوست۔'' شاویز نے کہا۔

''میری بھی دوست ہے۔'' فانی نے جھٹ کہا۔

''جی نہیں شان! یہ عینی کو تنگ کرتا ہے، اس لئے یہ اس کا دوست نہیں ہے۔'' شاویز نے جھٹ انکار کر دیا تھا۔

''عینی بتائے گی کہ یہ کس کی دوست ہے۔ کیوں عینی؟''

''دونوں دوست ہیں۔ بس فانی میری پونی کھینچتا رہتا ہے، اس لئے میں اس سے کٹی کر لیتی ہوں۔'' اس نے بہت سوچ کر کہا تھا۔

''بھئی بہت بری بات ہے فانی! فرینڈز کو تنگ تو نہیں کرتے نا؟'' میں نے فانی کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"سوری شان! آئندہ نہیں کروں گا۔" وہ بڑے آرام سے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معذرت کرنے لگا تھا۔

"دیٹس لائک اے گڈ بوائے۔ اسی خوشی پر میں آپ لوگوں کو آپ کے گفٹس دے رہی ہوں۔" میں نے کہا تو ان کی آنکھیں ایک دم چمک اُٹھی تھیں۔

"شان! اس میں کیا ہے؟" فانی نے باقی گفٹس دیکھے۔

"یہ آپ کے دوسرے فرینڈز کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ چاکلیٹس اور سویٹس بھی ہیں۔ زہرہ آپ سب میں تقسیم کردے گی۔ ٹھیک؟"

"نہیں، نہیں۔ وہ بالکل بھی اچھی بچی نہیں ہے۔ اس کو نہیں دینے۔" شاویز نے پاؤں پٹخے۔

"کیوں بھئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جب مجھے نہلاتی ہے تو گدی گدی بہت کرتی ہے۔" اس کے کہنے پر میں بے ساختہ ہنس دی تھی۔

"اچھا تو زہرہ تمہیں نہلاتی ہے۔ کیوں زہرہ! تمہیں شاویز کے گدگدی نہیں کرنی چاہئے۔" میں نے خاموش بیٹھی زہرہ سے کہا تو وہ بھی مسکرادی۔

"بس باجی جی! میرا دل چاہتا ہے، یہ بچے ہر وقت ہنستے کھیلتے رہیں۔ اسی لئے کبھی کبھار چھیڑتی رہتی ہوں۔ میرا بس نہیں چلتا باجی! ورنہ میں سب بچوں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں، اپنی گود میں لے کر لوریاں سناؤں، اپنی ساری محبت ان بچوں پر لٹا دوں۔"

میں نے حیرت سے دیکھا، زہرہ کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں کا ایک جہان آباد تھا۔ ماں کا ایسا روپ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک دم کسی کمی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے، میں اب چلتی ہوں۔" میں بولی تو میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"شان! آپ پھر کب آئیں گی؟" عینی نے میرا ہاتھ پکڑ کر سوال کیا تھا۔

"معلوم نہیں۔" میں نے ایمانداری سے جواب دیا۔

"ہم کل آپ کا انتظار کریں گے۔" شاویز نے کہا تھا اور باقی دونوں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی تھی۔ میں نے ان کے جذبات کو محسوس کر کے اثبات میں سر ہلا دیا اور جب میں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے تو وہ تینوں مجھے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہے تھے۔



"وجہ کچھ نہیں۔ بس اسے بھی اپنے باپ کی طرح موقع چاہئے، مجھے ستانے کا۔" مما، ونیزا

سے غالباً میری ہی شکایت کر رہی تھیں۔ میں پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں میری طرف متوجہ ہوگئیں۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"دیکھ لیا تم نے۔ کتنی بدتہذیب ہوتی جارہی ہے یہ۔ گھر میں آکر "ہیلو" تک کہنا گوارا نہیں اسے۔ اور اس کا حلیہ دیکھو ذرا۔ ایک سے ایک قیمتی سوٹ ہے اس کی وارڈروب میں۔ مگر مجال ہے کبھی جو یہ ڈھنگ کا لباس پہن لے۔ آخر کیا سوچتے ہوں گے لوگ اسے دیکھ کر۔"

مما میری بے نیازی پر غصے سے کھول اُٹھی تھیں۔ ونیزہ بے چاری خود کو مجرم سمجھتے ہوئے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں خود کو پلٹنے سے روک نہیں سکی تھی۔

"ونیزہ! انہیں بتا دو کہ جن لوگوں سے میں مل کر آرہی ہوں وہ ظاہر سے نہیں، باطن سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ قیمتی ملبوسات اور امپورٹڈ جیولری کسی کی عزت وتوقیر میں اضافے کا باعث نہیں بنتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج انتہائی کمتر لباس میں ایک ان پڑھ عورت مجھے اپنی ماں کے مقابلے میں ہزار درجے بہتر نظر نہ آتی۔"

میں مما کے تلملاتے چہرے اور ونیزہ کی بے حد حیرت کو نظر انداز کر کے کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ اور قبل اس کے کہ ونیزہ آکر مجھے سمجھانے کا فریضہ سرانجام دیتی، میں اسٹیریو پر The wory we do it کا نمبر فل والیوم میں چلا کر اپنے بیڈ پر گر گئی تھی۔ مگر اس سے پہلے میں دروازہ لاک کرنا اور کانوں پر تکیہ رکھنا نہیں بھولی تھی۔



"وہ جی بڑی بیگم صاحبہ نے آپ کے لئے پیغام دیا تھا کہ آج ڈنر پر ونیزہ بی بی اور ان کے منگیتر کے گھر والوں کو دعوت دی ہے۔ اس لئے آپ گھر پر ہی رہیں۔" میں شاور لے کر باتھ روم سے باہر آئی ہی تھی، جب رضیہ پیغام لے کر آدھمکی۔

"کیا؟ ابھی چند گھنٹے پہلے تک تو ایسا کوئی پروگرام منظر عام پر نہیں آیا تھا۔"

"معلوم نہیں جی۔ انہوں نے پیغام دیا تھا، میں نے آپ تک پہنچا دیا۔ خانساماں کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بنانا ہو، ابھی سے بتا دیں۔"

"اُف..... ایک تو مما کو وقت بے وقت دعوت سوجھتی رہتی ہے۔ اور اس پر ملازمین کو ہدایات تک دینا گوارا نہیں کرتیں۔" میں نے گیلا تولیہ بیڈ پر پٹخا تھا۔

"مما خود کہاں ہیں؟"

"احتشام صاحب کے ساتھ کسی دعوت پر گئی ہیں۔" اس کے جواب نے مجھے اچھا خاصا تپا کر رکھ دیا تھا۔

’’آخر ضرورت ہی کیا تھی یہ کھڑاگ ڈالنے کی۔ اچھا تم چلو، میں خود آ کر بتاتی ہوں۔‘‘ زنیرہ کو ٹال کر میں فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

’’ہاں بھئی ونیزہ بی بی! یہ دعوت کا کیا چکر ہے؟‘‘ میں نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا۔

’’کوئی چکر وکر نہیں۔ فصیحہ آنٹی نے کہا، میں تم لوگوں کی دعوت کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کرلیں۔ یوں بھی حماد ایک دو دنوں میں بزنس ٹور پر جا رہے ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا، یہی وقت مناسب ہے۔‘‘ وہ مزے سے کہہ رہی تھی۔

’’جی ہاں، آپ کی آنٹی صاحبہ خود تو دعوت اُڑانے چلی گئی ہیں اور مصیبت ساری میرے لئے...... خیر اب بتاؤ کیا کیا بنواؤں تمہارے ٹھونسنے کے لئے؟‘‘ میں اصل مقصد کی طرف آئی۔

’’ہاں، یہ پوچھی ہے نا کام کی بات۔ اچھا رُکو ذرا، میں سوچ کر بتاتی ہوں۔‘‘ دوسری طرف ایک طویل خاموشی چھا گئی تھی۔

’’سوچ رہی ہو یا مراقبے میں چلی گئی ہو؟ اب بتا بھی چکو۔‘‘ میں نے اُکتا کر کہا۔

’’اچھا، پھر یوں کرو ریڈ فش بنوالو، سویٹ اینڈ سار ساس کے ساتھ اور لیمن چکن ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اسپائسی کنگ پران وِد بوائل رائس اور سبزی کوئی سی بھی بنوالینا۔ میٹھے میں رس بھری جیولز اور اس کے علاوہ اگر تم کوئی اضافہ کرنا چاہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔‘‘

’’کاش تم میرے پاس ہوتیں تو یقیناً ڈائننگ ٹیبل پر تکہ بوٹی کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ بہت شوق سے تناول فرماتے تمہارے حماد صاحب۔‘‘ میں نے دانت کچکچائے۔

’’اچھا، اچھا...... سنو ذرا۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے مجھے کہا۔ ’’دیکھو ذرا، دھیان سے۔ حماد کے گھر والے بھی ہوں گے، اس لئے پلیز تم......‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہنا چاہا۔

’’آئی نو اِٹ ویری ویل۔‘‘ مجھے معلوم تھا، وہ کیا کہنے جا رہی تھی اس لئے میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

’’تھینک یو۔‘‘ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے خانساماں کو ہدایت دے کر ڈائننگ روم کی ازسرِنو ڈسٹنگ کروائی۔ تازہ پھولوں کا گلدستہ خود بنا کر ٹیبل پر رکھا اور پھر مووی لگا کر بیٹھی تو اسی وقت اُٹھی، جب سب مہمانوں نے ایک دم دھاوا بول دیا۔ پھر باتوں کے دوران جب کھانا لگنے کی اطلاع دی گئی تو سب کا رخ ڈائننگ روم کی طرف ہو گیا۔ ونیزہ سے باتیں کرتے ہوئے جب میں نے اپنی مخصوص کرسی سنبھالی تو نظریں خود بخود عین سامنے رکھی کرسی پر جا پڑی تھیں۔ اس کرسی پر ہمیشہ پاپا بیٹھا کرتے تھے اور کبھی کوئی فرد ان کی جگہ بیٹھ جاتا تو میں چھریاں کانٹے پٹخ کر ناراض ہو جایا کرتی تھی کہ ہرگز نہیں، یہاں پاپا بیٹھیں گے۔ اور اب...... اب بھی میرا دل چاہ رہا

تھا کہ میں ایک مرتبہ پھر ناراض ہو جاؤں اور یہ کرسی فوراً خالی کر دی جائے۔ اور اگر مجھے ذرا بھی امید ہوتی کہ کرسی خالی ہوتے ہی ہنستے مسکراتے پاپا اس پر آ بیٹھیں گے تو میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ کرتی۔

’’ہیلو ایوری باڈی۔‘‘ ہشاش بشاش، جاندار آواز نے سبھی کو چونکا دیا تھا۔

’لو، ایک اسی کی کمی رہ گئی تھی۔‘ میں نے جھنجلا کر چمچہ پلیٹ میں پٹخا مگر اگلے ہی لمحے اسے دوبارہ اٹھا لیا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس لمحے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

’’آؤ بھئی۔ کب سے تمہارا انتظار تھا۔‘‘ حماد پُرتپاک انداز میں اس سے ملا تھا۔

’’ریئلی؟‘‘ ولید احتشام جیسے خوشگوار حیرت کا شکار ہوا تھا۔

’’اچھا، اچھا بھئی بیٹھو اب کھانا شروع کرو۔‘‘ احتشام احمد کے کہنے پر ولید میرے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں کھانے میں نمک ایک دم بہت تیز ہو گیا تھا۔ میں نے چمچہ رکھ کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ونیزہ بے چاری گاہے بگاہے مجھے دیکھ رہی تھی کہ کہیں کسی بات پر میں واک آؤٹ نہ کر جاؤں۔

’’پلیز، یہ ڈش پکڑائیے گا۔‘‘ ولید احتشام نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور مجھ سے پہلے ہی ونیزہ نے فوراً ڈش اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

’’تھینک یو۔‘‘ دھیرے سے کہا گیا تھا۔

’’تم ٹھیک طرح سے کھا نہیں رہیں؟‘‘ اس نے اچانک ہی گردن موڑ کر بہت اپنائیت سے پوچھا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے اور کچھ مکمل طور پر کھانے کی طرف۔

’’اگر میں نہیں کھا رہی تو اس سے آپ کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟‘‘ میں نے یونہی چاولوں سے کھیلتے ہوئے بہت نارمل انداز میں اس سے کہا تھا اور دل کو بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ جہاں اور بہت سے لوگوں کو برداشت کر رہی ہو، وہاں ایک اور کو بھی بھگت لو۔

میرے جواب پر ولید کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ اُبھری تھی، اس کا اندازہ مجھے اس کی طرف دیکھے بغیر ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد باقی لوگ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے جبکہ ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں آ گئے تھے۔

’’ویسے نازنین! آپ بہت کم بولتی ہیں۔‘‘ حماد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

’’جی ہاں...... کم بولتی ہیں۔ مگر جب بھی بولتی ہیں، خوب بولتی ہیں۔‘‘ وہ غالباً طنز کر رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں جتنی گالیاں ازبر تھیں، اسے دے ڈالیں۔ اگر ونیزہ اور حماد کا خیال نہ ہوتا تو

لمحہ بھر میں اس اسٹوپڈ سے شخص کو اس کی اوقات یاد دلا دیتی۔ اور رات گئے جب سب لوگ واپسی کے ارادے سے اٹھے تو میرے دل و دماغ پر بے حد بوجھ تھا اور اعصاب تمام تر احساسات کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں نڈھال ہو چکے تھے۔

اور جب انہیں رخصت کرنے کے ارادے سے میں سب لوگوں کے ساتھ باہر آئی تو آدھے سے زیادہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا اور سرد سبک خرام ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ لمحے شدت سے میرا دل چاہا تھا کہ میرے اردگرد پھیلے یہ لوگ ایک دم اس منظر سے ہٹ جائیں اور میں تنہا اس ماحول میں خود سے باتیں کروں۔ ونیزہ وغیرہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ حماد احتشام احمد کے سامنے کھڑا الوداعی کلمات کہہ رہا تھا اور مما اپنے ہنستے مسکراتے، فریش چہرے کے ساتھ اس سے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں ان سے قدرے فاصلے پر کھڑی آسمان کے آخری کنارے پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم ان کے دیکھنے کو سمجھتے ہیں زندگی

ان کا یہ حال ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں''

ولید احتشام کی گمبھیر آواز کہیں بہت قریب سے اُبھری تھی۔ میں نے چونک کر گردن گھمائی تو وہ عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔

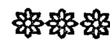
''اپنا خیال رکھنا۔'' نظریں ملتے ہی اس نے ہمیشہ کی طرح بہت نرمی سے کہا تھا اور پھر میرے قریب سے گزر کر مما کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اس کے انداز پر چڑ کر رہ گئی تھی۔

''ارے ولید بیٹا! تم بھی مہمانوں کی طرح چلنے کے لئے تیار ہو۔ بھئی تمہارا تو اپنا گھر ہے، چلو میں تمہارے لئے بیڈ روم کھلواتی ہوں۔'' مما لگاوٹ بھرے لہجے میں اس سے کہہ رہی تھیں اور میں نے چپ چاپ اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیئے تھے۔ نہ جانے کیوں ان تینوں کو اکٹھے دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کسی اجنبی دیس میں کھڑی ہوں، اجنبی لوگوں کے درمیان۔

'اور مجھے لگتا ہے، پاپا کی یادوں کے سوا اس گھر کی ہر چیز میرے لئے اجنبی ہو چکی ہے۔'

میں اپنے تاریک کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔

کچھ لمحوں بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز فضا میں اُبھری اور پھر معدوم ہو گئی تو ولید احتشام جا چکا تھا اور اب باہر مکمل سناٹا تھا۔ میں آہستگی سے ٹیرس پر نکل آئی تھی اور اب بہت دیر تک جاگنا تھا۔



اگلے روز میں دارالاطفال پہنچی تو نہ صرف شاویز بلکہ فانی اور بہت سے بچوں کے ساتھ دائرے میں جمع تھے۔

'ان سب لوگوں کو کیا ہوا؟' میں حیرت سے سوچتے ہوئے ان کے قریب گئی اور پھر ان سب کے درمیان عینی کو بیٹھے دیکھ کر میں مزید حیران رہ گئی تھی۔ عینی کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

''ارے کیا ہوا ہے؟'' میں شولڈر بیگ گھاس پر پھینک کر فوراً اس کی طرف بڑھی۔ مجھے دیکھ کر ہمدردی کا احساس پاتے ہوئے عینی کے آنسو بے اختیار چھلک گئے تھے۔

''شان!......عینی کے کانٹا چبھ گیا ہے۔'' فانی نے فوراً مجھے اطلاع دی۔

''مگر کیسے؟'' میں نے اس کی چھوٹی سی انگلی پر ننھے منے خون کے قطرے کو دیکھا۔

''یہ آپ کے لئے بکے بنا رہی تھی۔ پھول توڑتے ہوئے کانٹا ہاتھ پہ لگ گیا۔'' شاویز نے بھیگے لہجے میں مجھے بتایا۔

''میرے لئے؟'' حیرت کا مقام تو تھا نا کہ جس بچی سے میں صرف چند لمحوں کے لئے ملی تھی، اس نے نہ صرف مجھے یاد رکھا تھا بلکہ تحفہ دینے کی خواہش بھی اس کے دل میں اُبھری تھی۔ میں نے بے اختیار ہی اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

''جانو!......آپ کی محبت میرے لئے کم تھی کیا؟'' میں نے ٹشو سے خون صاف کیا اور پھر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

''اب آرام آ گیا ہے نا؟'' میرے پوچھنے پر عینی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا، خون نکل رہا ہے، کمبل اوپر ڈال دیتے ہیں۔' فانی کی بات پر میں بے اختیار ہنس دی تھی جبکہ شاویز نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

''شان! میں نے اس کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ آگ لگنے پر کمبل ڈالتے ہیں مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ اس روز آصف کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا اور اس نے بیڈ پر پڑا کمبل اٹھا کر اس پر ڈال دیا تھا۔'' شاویز، فانی کی حرکتوں سے خاصا نالاں لگ رہا تھا۔ جبکہ میرے لئے اپنے قہقہے کو کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''اچھا خیر اب اپنے باقی دوستوں سے بھی تعارف کرواؤ۔'' میں نے دوسرے بچوں کی طرف اشارہ کیا تو فانی فرداً فرداً سب کا تعارف کروانے لگا تھا۔

''شان آنٹی! آپ کو کرکٹ کھیلنی آتی ہے؟'' ایک نسبتاً بڑے بچے نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پھر ہو جائے مقابلہ؟'' دوسرے بچے نے بڑے اعتماد سے چٹکی بجاتے ہوئے مقابلے کی

دعوت دی تو میں کچھ لمحے سوچنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاویز اور فانی جیسے ننھے منے بچوں کو ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد دو ٹیمیں بن گئی تھیں۔ ایک وقت تھا جب میں اور ونیزہ کرکٹ کی نشے کی حد تک شوقین تھیں۔ بچپن میں واحد یہ کھیل تھا جو ہم لوگوں نے بے تحاشا کھیلا تھا۔ اسی لئے جب پہلی بال، بیٹ پر آ کر لگی تو اس کے ساتھ ہی ہال کا شیشہ چیخ گیا تھا اور ہنستا مسکراتا بچپن ایک دم سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اسی لئے ہر بال پر شاٹ لگاتے ہوئے اور اچھل اچھل کر آؤٹ ہونے کی اپیل مسترد کرتے ہوئے میں بھول گئی تھی کہ یہ شانزے ایمان سیونتھ کلاس کی اسٹوڈنٹ نہیں بلکہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک حساس لڑکی ہے۔ جوں جوں رنز بڑھتے جا رہے تھے، شاویز اور فانی کے چہرے بے تحاشا خوشی سے چمک رہے تھے اور جسم کا سارا خون جیسے چہروں میں سمٹ آیا تھا۔ وہ پوری طرح مجھے سپورٹ کر رہے تھے۔

اور جب ایک زوردار شاٹ پر بال اونچی گئی تھی تو ''مسکبر'' کا ایک زوردار نعرہ بھی ساتھ ہی گونجا تھا۔ مخالف ٹیم کے بچے کافی دلگرفتہ ہو کر اُڑتی ہوئی گیند کو دیکھ رہے تھے اور انتہائی غیر متوقع طور پر گیند بجائے نیچے گرنے کے دو مضبوط ہاتھوں میں کیچ ہو چکی تھی۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑی، اس آخری کھلاڑی کے آؤٹ ہونے پر بھنگڑا ڈال رہے تھے جبکہ باقی بچے انتہائی صدمے کے عالم میں اس لمبے چوڑے شخص کو دیکھ رہے تھے، جس نے عین وقت پر کیچ کر کے سارا کھیل خراب کر دیا تھا۔

اور میں کسی نامعلوم سی خجالت کا شکار ہوتے ہوئے عینی کی طرف پلٹی تھی۔ میں نہ جانے کیوں اس شخص کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی جو اب بچوں کو نہ جانے کیا کیا ہدایات دے رہا تھا۔ اور جب میں جرسی پہن کر جوگرز کے تسمے خوامخواہ ہی کھول کر دوبارہ کس کر باندھ کر پلٹی تو وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں گھسائے بھاگتے ہوئے بچوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں وہ کسی یونانی دیوتا کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک مغرور سی بے نیازی تھی۔

''ہیلو آفندی صاحب!'' مجھے مجبوراً اسے پکارنا پڑا۔ اس کی ساحر آنکھیں زاویہ بدل کر میرے چہرے پہ جم گئی تھیں۔

''ہیلو..... کیسی ہیں آپ؟'' عنابی ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔

''فائن۔ تھینک یو۔'' میں نے بہت فارمل سے انداز میں کہا تھا۔

''آج سب بچے غیر معمولی طور پر خوش تھے۔ کافی عرصے بعد ان کے پاس ایک ایسا فرد آیا ہے جو ان میں سے نہیں مگر ان جیسا ضرور ہے۔ مخلص، بے لوث، چاہنے والا۔''

میں نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ دوسروں کے بارے میں بہت جلد رائے قائم کر لیتے ہیں۔'' میں نے دونوں بازو سینے پر لپیٹے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ سردی کا احساس بڑھنے لگا تھا۔

''نہیں، میں دوسروں کو بہت جلد پہچان لیتا ہوں۔'' اس کا لہجہ پُریقین تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''آیئے، آپ کو چائے پلواتے ہیں۔'' اس کی آفر پر میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا۔

''نہیں...... میرا خیال ہے، اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے آئے ہوئے۔'' میں نے گھاس پہ پڑا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ جرسی کی جیب میں گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے میں اسے خدا حافظ کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

''آتی رہا کریں۔'' اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا اصرار تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گیٹ سے باہر نکل آئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے چند لمحے کے لئے سوچا اور پھر گاڑی کا رخ ونیزہ کے گھر کی طرف کر دیا تھا۔

اگلے روز میں نے بھاری رقم کا چیک کیش کروایا تھا اور منیجر کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ اب بھی اتنی ہی رقم ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی جاتی ہے جتنی کہ پاپا کی زندگی میں جمع کروائی جاتی تھی۔ احتشام احمد کی یہ عنایت مجھ پر کچھ خاص اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ سارا کاروبار میرے پاپا کا ہی تو تھا اور اس پر میرا حق آج بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ پاپا کی موجودگی میں تھا۔ اور جب یہ رقم میں نے ''دارالاطفال'' کے فنڈ میں جمع کروانی چاہی تو عاصم نے بڑے سبھاؤ سے رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہم لوگ ادارے کے لئے فنڈز یا ڈونیشنز نہیں لیتے۔'' وہ بہت اطمینان سے بتا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' بات اچنبھے کی تھی کہ اگر فنڈز نہیں لئے جاتے تو اتنا بڑا ادارہ اتنی کامیابی سے کیسے چل رہا تھا۔

''ان فیکٹ سب کچھ آفندی صاحب ذاتی طور پر ہی ارینج کرتے ہیں۔ آئی مین تمام اخراجات وہ خود افورڈ کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بیرونی امداد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہاں اگر آپ نیکی کا جذبہ رکھتی ہیں تو اس کی تسکین کے لئے اور بچوں کی مدد کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔''

''مثلاً؟'' وہ رُکا تو میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیں میڈم! یہاں جن بچوں کو آپ خوش، مطمئن اور زندگی کی خوشیوں سے لطف کشید کرتے دیکھتی ہیں، یہ بچے ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں اور نہ ہمیشہ سے یہاں رہتے آئے ہیں۔ ان

بچوں کا پس منظر انتہائی دردناک ہے۔" عاصم نے میز پر رکھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں
پھنساتے ہوئے کہا۔

"ان میں سے کچھ بچے ایسے ہیں جو قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہیں۔ مختلف حادثات
میں جو اپنے ماں باپ کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ لوگوں کے ہجوم میں جن کے ہاتھ سے
ماں کی اُنگلی پھسلی اور پھر وہ پُرشفقت لمس ہمیشہ کے لئے ایک خواب بن کر رہ گیا۔ کچھ وہ ہیں جو
رات کی سیاہی کا ثمر ہیں اور کوڑے کے ڈھیر پر پڑے انسانیت کی اخلاقی قدروں پر ماتم کناں
تھے۔ کچھ بچے وہ ہیں جو اپنے ہاتھ بھیک کے لئے پھیلاتے تھے تو ان کی آنکھیں ندامت سے جھکی
ہوتی تھیں۔ کچھ بچے ماں باپ کی مجبوریوں کے عوض یہاں تک چلے آئے کہ ان کے گھروں میں
بھوک کا ڈیرا تھا اور پیٹ کا دوزخ روٹی مانگتا ہے۔ ان تمام بچوں کو یہاں لانے کا مقصد نہ صرف
ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل بلکہ ان کی شخصیت کی متوازن تعمیر بھی ہے۔ اس لحاظ سے ان
بچوں کی اوّلین ضرورت روٹی، کپڑا، رہائش ہے جو کہ پوری کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد جو چیز ان
کے لئے ٹانک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے پیار، توجہ، شفقت، تعلیم اور پھر بہترین تربیت۔ اور آپ
جیسے ہمدرد لوگوں سے ہم انہی چیزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ انہیں فراغت میں پڑھانے کے
لئے آسکتی ہیں۔ کوئی ایسا فن، کوئی ہنر جو آپ کے خیال میں ان کے لئے بہتر ہو، وہ سکھا سکتی ہیں
یعنی کوئی بھی ایسا کام جس سے ان کی محرومیاں دم توڑ دیں اور ایک مضبوط، پُروقار، مستحکم شخصیت کی
تعمیر ہو سکے۔"

عاصم نے بات مکمل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ میں نے بھی طویل سانس لے کر
خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے عاصم! میں غور کروں گی کہ میری ذات ان بچوں کے لئے کس طرح فائدہ مند
ہو سکتی ہے۔" میں تھکے تھکے سے انداز میں اُٹھ کر چلی آئی تھی۔ درحقیقت عاصم کی گفتگو سے دل پر
بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ میں جو یہاں آ کر جمشید آفندی کے اس قول پر ایمان لا رہی تھی کہ "زندگی
یہاں بہت ہنستی کھلکھلاتی ملے گی" اب ایک نامعلوم دکھ کے حصار میں گھر گئی تھی۔

"تو گویا مسکراہٹ اور آنسوؤں کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے دن اور رات کا۔ جو نہ ایک
دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی روشن اور چمک دار دن اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ رات کے
سیاہ گھور اندھیرے کو کائنات پر قابض ہونے سے روک سکے۔ اور یوں دن، رات کی جنونی
میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور مسکراہٹ آنسوؤں کی بارش میں گھل جاتی ہے۔"

"دارالاطفال" کی سفید عمارت اُداسی کی دُھند میں لپٹی نظر آ رہی تھی اور میں بوجھل دل

ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ گاڑی کو ہموار سڑک پر دوڑاتے ہوئے میں نے عاصم کی باتیں ایک
مرتبہ پھر ذہن میں دہرائی تھیں۔ کچھ نئے خیالات شعور کے دروازے پر دھیرے دھیرے دستک
دے رہے تھے اور گھر پہنچنے تک میں "دارالاطفال" کو مستقل طور پر جوائن کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔



"او بادشاہو! اب کدھر کے ارادے ہیں؟" وہی مخصوص لب و لہجہ، وہی کھنکتی آواز۔ کوریڈور
میں چلتے چلتے میں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو زوار شاہ ہمیشہ کی طرح اپنی بدرنگ جینز اور
گھسی پٹی چپل پہنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا تھا۔ انداز میں حد درجہ بے نیازی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو زوار شاہ! اتنی سردی میں تم صرف چپل پہن کر پھر رہے ہو۔ بیمار
پڑنے کا ارادہ ہے کیا؟ اور وہ تمہارے جوگرز کیا ہوئے جو تم نے دو سال پہلے سال بھر کی پاکٹ منی
جمع کر کے لئے تھے؟" میں جرابوں، جوگرز میں جکڑے ہونے کے باوجود ٹھنڈک محسوس کئے بنا
نہیں رہ سکتی تھی۔

"میں بتاتا ہوں محترمہ! کہ وہ جوگرز کیا ہوئے۔" معظم، ہاشمی صاحب کے آفس سے ابھی
ابھی نکلا تھا۔ "کل جب یہ میری بائیک پر لفٹ لئے گھر جانے کے لئے نکلے تو راستے میں ان کو
ایک ایسا شخص نظر آیا جو پاؤں سے ننگا تھا اور اپنی ریڑھی دھکیل رہا تھا۔ بس ان محترم نے میری
بائیک سے جمپ لگائی، حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور جھٹ سے اپنے جوگرز اُتار کر اس شخص
کے ہاتھ میں تھمائے اور خود چل دیئے ننگے پاؤں۔" معظم ایک ہی سانس میں ساری بپتا سنا کر
غڑاپ سے عاصم کے آفس میں گھس گیا تھا۔ میں نے حیرت سے زوار شاہ کو دیکھا جو اب سر کھجاتے
ہوئے دائیں بائیں جھانک رہا تھا۔

"زوار شاہ! ہمدردی اچھی چیز ہے مگر......"

"شانزے جی!......" اس نے فوراً مجھے ٹوک دیا۔ "وہ شخص بہت بوڑھا تھا۔ موسم کی یہ شدت
اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، میرے لئے نہیں۔ اس لئے مجھے کم از کم وہ تو کرنا چاہئے تھا جو
میں کر سکتا تھا۔"

"تمہیں عاصم کی بات مان لینی چاہئے۔ آخر وہ تمہارے کام کا معاوضہ دے گا۔ خدانخواستہ
کوئی بھیک یا امدادی رقم تو تمہارے ہاتھ پہ نہیں رکھے گا نا۔"

میں جانتی تھی، وہ مفلس ہونے کے باوجود رضاکارانہ طور پر کام کر رہا تھا۔

"شانزے جی! اگر ہر نیکی کا صلہ یہیں مل گیا تو آخرت کے لئے کیا بچے گا؟" اس نے بہت
عام سے انداز میں خاص بات کہی تھی۔ پھر آفس کا دروازہ کھولتے ہوئے بایاں بازو پھیلاتے

ہوئے قدرے جھک کر گویا احتراماً مجھے آفس میں داخل ہونے کے لئے کہا تھا۔ آفس میں اس
خوب رونق لگی ہوئی تھی۔

"آیئے آیئے مس شانزے ایمان! ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" رضا نے فوراً میرے سا
کرسی خالی کی۔

"ویسے بائے داوے...... ذکرِ خیر ہی تھا نا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی جی بالکل۔ آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔
ایک ماہ کے دوران آپ نے جس ڈی وڈشن سے کام کیا ہے، اس نے نہ صرف بچوں بلکہ "بڑوں"
کو بھی آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔" رضا نے بال سنوارتے ہوئے "بڑوں" پر زور دیا تو میں مسکرا
بنا نہیں رہ سکی۔

"واقعی، رضا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسپیشل چلڈرن کے لئے کام کرنا بہت محنت اور صبر طلب
ہے۔ اور جس طرح سے شانزے انہیں ٹریٹ کرتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے باقا
ٹریننگ لے رکھی ہو۔" بریرہ نے کہا تو میں جھینپ کر رہ گئی۔

"کیوں مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے ہو تم لوگ؟ میں نے تو زندگی گزارنے کا ڈھنگ
بھی یہاں آ کر سیکھا ہے۔ طریقہ محبت کا ہنر تو میں نے آپ لوگوں سے سیکھا ہے۔ اور اگر میں یہاں
نہ آتی تو اندر کی گھٹن شاید مجھے کھل کر سانس بھی نہ لینے دیتی۔"

"اوہو...... لگتا ہے، باقاعدہ شاگردی اختیار کر لی گئی ہے ہماری۔" زوار شاہ نے دراز
ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یس سر! یو آر رائٹ۔" میں مؤدبانہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں مس شانزے! ابھی سب کے لئے چائے آ رہی ہے۔" عاصم نے کہا تو میں نے ایک
لمحے کے لئے سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے، اب میں چلتی ہوں۔ اِن فیکٹ میں یونیورسٹی سے سیدھی ادھر آئی
تھی۔ لنچ بھی نہیں کیا۔ اس لئے اس وقت سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"ناٹ پرابلم۔ ہم ابھی لنچ کا بندوبست کروائے دیتے ہیں۔" عاصم نے فوراً انٹرکام کی طرف
ہاتھ بڑھایا۔

"ارے نہیں عاصم! ونیزہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس لئے بہتر ہے کہ اب میں نکل پڑوں۔
وقت پر نہ پہنچی تو وہ مجھے کچا چبا جائے گی۔" میں سہولت سے اسے منع کر کے باہر نکلی تھی۔

"ارے ہاں عاصم!" میں کسی خیال کے تحت اچانک پلٹی تو عاصم جو زوار شاہ کی طرف

موڑ چکا تھا، ایک مرتبہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"آفندی صاحب کو بہت عرصے سے نہیں دیکھا۔ کہیں گئے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ سنگاپور گئے ہوئے ہیں۔" اس نے مختصراً بتایا تو میں سر ہلا کر باہر نکل آئی۔

"اور کتنی عجیب بات ہے کہ پورا ایک ماہ ہو گیا ہے مجھے یہاں آتے ہوئے اور ان تیس دنوں
میں، میں ایک بار بھی اس شخص سے نہیں مل پائی جس نے کہا تھا کہ "جس طرح ایک قطرہ سمندر میں
جا کر اپنا وجود کھو دیتا ہے، اسی طرح کائنات میں بکھرے بے شمار دکھوں میں آپ کا غم آپ کو بہت
حقیر نظر آئے گا۔" اور مجھے لگتا ہے، اس شخص نے درست ہی کہا تھا۔ کیونکہ وہ دُکھ جو میرے جسم کے
روئیں روئیں میں زہر آلود سوئیوں کی طرح گڑا ہوا تھا اور ہر لمحہ میری روح کو ایک نئے عذاب میں
مبتلا رکھتا تھا، اب محض ایک پھانس بن کر دل میں گڑ گیا ہے اور مجھے تو یہ بھی لگتا ہے کہ یہ پھانس ہی
میری روح کا ناسور بنتی جا رہی ہے۔"

میں نے بہت سست روی سے چلتے ہوئے سوچا تھا۔

اطراف میں درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ تپش سے محروم سورج کی کرنیں
پژمردگی اور بے چارگی سے اپنے وجود کو سمیٹتی ہوئی زمین سے لحہ بہ لحہ جدا ہوتی جا رہی تھیں۔ عجیب
سرد سی اُداسی پورے ماحول میں رچی بسی تھی۔ نہ کوئی شور نہ ہنگامہ نہ آواز نہ پکار۔ صرف میرے
قدموں کی مدھم چاپ تھی جو اس لامحدود چپ پر ثبت ہو رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا بالکل یہی کیفیت
میرے دل کی بھی ہے۔ اُداس، پژمردہ، خاموش۔ اور اس خاموش بستی میں بھی کوئی مدھم سی چاپ
اُبھر رہی ہے۔ خیال، سوچ، فکر کے ہزار ہا قدموں کی مدھم سی چاپ اور کچھ بھی نہیں۔



"واٹس رونگ وِد یو ونیزہ! کیوں تنگ کر رہی ہو؟" میں نے سخت جھنجلا کر کہا۔ وہ کوئی پندرہ
منٹ سے عین میرے سامنے صوفے پر بیٹھی نظروں ہی نظروں میں مجھے جانچ رہی تھی بغیر کچھ کہے۔

"تو گویا یہ طے ہے کہ ہمارے "رہے سہے" تعلقات بھی اب اختتام پذیر ہونے کو ہیں۔"
اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ مجھے لگا وہ کئی دنوں کا حساب چکا دینا چاہتی ہے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ایک بات تو بتاؤ شانزے! تم کس سے بھاگ رہی ہو؟ ...... خود سے یا ہم سب سے؟" اس
نے قدرے آگے کو جھک کر مجھ سے پوچھا تھا۔

میں نے ذرا سا ہنس کر اس کی بات کے اثر کو زائل کرنا چاہا مگر شاید میرے ہونٹ میرا ساتھ
نہیں دے سکتے تھے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ونیزہ!"

"ایسی ہی بات ہے۔" ونیزہ نے ایک دم مجھے ٹوک دیا اور اس کے پُریقین لہجے پر میں نے ایسے ہونٹ بھینچ لئے تھے گویا کبھی کھلے ہی نہ ہوں۔

"یہ تم جو سارا دن لور لور سڑکوں پر خوار ہوتی ہو، یہ فرار نہیں تو اور کیا ہے شانزے؟" ونیزہ کی آواز قدرے تیز تھی۔

"یونیورسٹی میں کوئی کلاس اٹینڈ کرو تو تم اس طرح بے زار و بے چین بیٹھی ہوتی ہو جیسے تمہیں زبردستی وہاں لا بٹھایا ہو۔ صبح سے شام تک تم انجانے راستوں پر بھٹکتی رہتی ہو اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ کون سے پہر تم نے کھانا کھایا تھا اور کتنے پہروں سے تم بھوکی ہو۔ گھر جانے کا خیال تمہارے لئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ باپ تو چلو سوتیلا ہے مگر تمہیں تو ماں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ خود اپنی ذات کو بھی بری طرح اگنور کر رہی ہو تم۔ کیا پہننا ہے، کیا اوڑھنا ہے، تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ اور اوپر سے تم نے وہ چلڈرن ہوم جوائن کر لیا ہے۔ جبکہ ایسے کسی بھی ادارے کے بارے میں تمہارا اولین خیال یہ ہوتا تھا کہ یہ محض روپے کمانے اور نام کمانے کا ذریعہ ہے اور کچھ نہیں۔ اور اب تم ایسے ہی ایک ادارے کے لئے پاگل ہوئی جا رہی ہو۔ اتنا وقت اگر تم اس چلڈرن ہوم میں ضائع کرنے کی......"

"شٹ اپ ونیزہ! جسٹ شٹ اپ۔" میں روہانسے لہجے میں چیخ اٹھی تھی۔ مزید برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی مجھ میں۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ آنسو جیسے اُمڈ آنے کو بے تاب تھے۔ مگر میں انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ کتنا اطمینان بخش ہوتا ہے وہ احساس جب کوئی انسان سب کچھ جاننے کے باوجود انجان بن کر آپ کا بھرم رکھ لے۔

اور

اور کتنا اذیت ناک ہوتا ہے احساس کا وہ لمحہ جب وہی شخص آپ کے سامنے بڑی بے دردی سے آپ کی ذات کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دے۔

"تم بہت بدل گئی ہو شانزے!" چند لمحوں بعد ونیزہ کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔

"بہت زیادہ بدل گئی ہو اور میں اس تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے، تم نے کبھی اُداس لہجے میں مجھ سے یہ نہیں کہا کہ "آؤ ونیزہ! ٹیرس پر چلیں۔" وہاں چل کر تم مجھ سے اپنا دکھ، اپنی پریشانی شیئر کرو، کوئی پرابلم ڈسکس کرو۔ تم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں، پاپا یاد آتے ہیں، اور تم نے تو کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ احتشام احمد سے شادی کے فیصلے پر تم مما سے ناراض ہو۔ حالانکہ

ظاہری طور پر یہ سب باتیں تمہیں مجھ سے شیئر کرنی چاہئے تھیں مگر تم نے نہیں کیں۔ کسی اور سے نہ سہی مگر کم از کم مجھ سے تو کچھ کہو۔ اپنی ذات کے گرد اتنی بلند فصیلیں کھڑی کر لی ہیں تم نے کہ تم تک رسائی میرے لئے کارِ دشوار بن کر رہ گئی ہے۔ مگر یہ بات کان کھول کر سن لو شانزے ایمان! کہ آج میں وہ سب کچھ سن کر رہوں گی، جو تمہارے دل میں ہے۔" گویا وہ تہیہ کئے بیٹھی تھی۔

"کیا سننا چاہتی ہو تم؟" میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ضبطِ گریہ سے سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں اس پر جما دیں۔

"یہ کہ پاپا مجھے یاد آتے ہیں...... تو سن لو ونیزہ داور! کہ میں اپنے پاپا کو کبھی نہیں بھولی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں چلتی ہوں تو وہ میرے ہم قدم ہوتے ہیں۔ میں کھاتی ہوں تو وہ میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ میں روتی ہوں تو وہ میرے آنسو پونچھتے ہیں۔" میرے اندر جیسے کوئی جوار بھاٹا اُٹھا تھا۔

"اور وہ احتشام احمد...... ہاں، میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ نفرت مجھے اس عورت سے ہے جسے تم میری ماں کہتی ہو۔ مجھے اسکی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں۔ میں اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے وجود سے اُٹھتی مہک سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ سن رہی ہو ونیزہ! مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے۔"

میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اسے غالباً اس شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی اسی لئے حیران پریشان اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

"میں گھر اس لئے نہیں جاتی کہ میں اس عورت کے سائے سے بھی بچنا چاہتی ہوں۔ اس کی موجودگی کا ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گزرتا ہے۔"

"آر یو کریزی شان؟ کیا اول فول بک رہی ہو؟" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھانا چاہا مگر میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"یہ اول فول نہیں ہے مس ونیزہ داور! یہ وہی سچائی ہے جسے تم سننے کے لئے بے تاب تھیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"شانزے! اچھا تم بیٹھو تو سہی۔" اس نے مجھے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر میرے اندر جیسے کوئی لاوا اُبل رہا تھا۔

"شانزے! فار گاڈ سیک بیٹھ جاؤ۔" اس نے مجھے صوفے پر دھکیلا اور پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

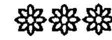
"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" میرے قطعی لہجے پر اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"آئی کانٹ بیلیو اِٹ شانزے! یہ سب تم کہہ رہی ہو اور وہ بھی......"

"ہاں۔" میں نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ "یہ میں کہہ رہی ہوں اور اپنی ماں کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔"

"اسی بات پر تو یقین نہیں آ رہا شانزے! کوئی بیٹی اپنی ماں کے بارے میں ایسا بھی کہہ سکتی ہے۔" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، ماں کے بارے میں یہ سب نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن تمہاری فصیحہ آنٹی ایک چلتا پھرتا ڈیکوریشن پیس ہیں اینڈ نتھنگ مور۔" میں زہر خند لہجے میں کہتی ہوئی ایک جھٹکے سے اُٹھی تھی اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ ونیزہ حیرت و بے یقینی کے باعث مجھے روکنے کی کوئی معمولی سی کوشش بھی نہیں کر پائی تھی۔



خوشیوں کی آرزو میں مقدر بھی سو گئے
آندھی چلی کچھ ایسی کہ اپنے بھی کھو گئے
کیا خوب تھا تمہارا یہ انداز دوستو!
ہمدرد بن کے آئے تھے، کانٹے چبھو گئے

"میرا خیال ہے انکل! شانزے کو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" ونیزہ کی آواز پر قدم جیسے زمین نے جکڑ لئے۔

'یہ کیا کہہ رہی ہے ونیزہ؟' میں نے آہستگی سے ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ ونیزہ احتشام احمد کے سامنے بیٹھی بڑی سنجیدگی سے مشورہ دے رہی تھی۔

"ایک نارمل فرد اس طرح بی ہیو نہیں کرتا انکل! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا انکل! کہ یہ وہی شانزے ہے جسے میں بچپن سے جانتی ہوں۔ اسے تو میں نے کبھی معمولی سا غصہ کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر کل اسے اس حالت میں دیکھ کر میں سخت پریشان ہو گئی تھی۔ انکل! آپ جلد از جلد کسی سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کریں۔"

پردہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور میں دم بخود سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اور یہ ونیزہ تھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ جانتی ہے، سمجھتی ہے اور جس کا خیال ہے کہ مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔ میرے حلق میں پھندا سا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔

'اور اگر میں نے دل کی ساری بات تم سے کہہ دی ہوتی ونیزہ! تو شاید اس وقت میں کسی مینٹل

ہاسپٹل میں پہنچا دی گئی ہوتی۔' میں انہی قدموں واپس ہو لی تھی۔

'اور کیا ہوتا اگر آج میں سب کے اصرار پر "دارالاطفال' میں ہی رک گئی ہوتی، سر شام گھر نہ لوٹتی اور انجان ہی رہ جاتی، کچھ بھی نہ سن پاتی۔ کم از کم ونیزہ کی زبانی تو یہ سب نہ سن پاتی۔ اس ونیزہ کی زبانی جو مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ جانتی تھی، سمجھتی تھی۔'

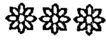
میں بے دم ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ غائب دماغی سے گاڑی چلاتے ہوئے میں نجانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بار پھر اس گوشۂ عافیت میں جا پہنچی تھی۔

"ارے تم گئی نہیں؟' شہرینہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ کاش نہ گئی ہوتی۔

"ہاں، گئی تھی۔ کوئی خاص کام نہیں تھا اس لئے دوبارہ آ گئی۔" میں پھیکی سی ہنسی ہنس دی تھی اور ایک بار پھر اسپیشل چلڈرن سیکشن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"شانزے کو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" خود کو کئی کاموں میں مشغول کر لینے کے باوجود میں اس ایک جملے سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکی تھی۔

'تو کیا میں واقعی ابنارمل ہو چکی ہوں؟' میں نے اپنی دُکھتی ہوئی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے سوچا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں آ بیٹھی تھی۔



"معلوم نہیں دارالاطفال میں قدم رکھتے ہی ایک طویل اور پُرسکون نیند کی خواہش دل میں ہمکنے کیوں لگتی ہے؟ اور کیا میں نہیں جانتا کہ ایسی کسی بھی خواہش کی تکمیل کم از کم اس جنم میں ممکن نہیں۔ اور بالفرض آواگون کے چکر میں، میں نیا جنم لے بھی لوں تو بھی مجھے یقین ہے کہ لاحاصل جستجو اور بے نام مسافت کے سوا میرے مقدر میں اور کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے تھکن زدہ بوجھل پلکیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آج کی رات کچھ زیادہ روشن نہیں تھی۔ فضا ایک غیر محسوس سی دُھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ تیسری تاریخ کا چاند مثال ابرو بڑے تفاخر سے چشم فلک پر تنا ہوا تھا۔ بھولی بھٹکی سرد ہوا کا جھونکا کبھی کبھار درختوں سے ٹکراتا تو پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کسی آہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ وسیع و عریض لان اس وقت نیم تاریکی کی زد میں تھا۔ نظریں یونہی گھماتے ہوئے وہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے بے حد حیرت سے نیم تاریکی میں ڈوبے اس وجود کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو گلزار خاں نے اسے اطلاع دی تھی کہ تمام ممبران جا چکے ہیں اور دیگر کمروں کو لاک کر دیا گیا ہے۔

'تو پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟' وہ ایک جھٹکے سے مڑا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا تھا۔

معلوم نہیں، اس کے قدموں کی آہٹ سنی نہ گئی تھی یا جان بوجھ کر سنتے ہوئے بھی نظر انداز
دی گئی تھی۔ بہرحال اس وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے لب بھینچے بغور اس سا
وجود کو دیکھتا رہا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سینے میں بند سانس خارج کی تھی۔ تنے ہو
عضلات قدرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"مس شانزے ایمان!" اس نے اپنے خیال کی تصدیق چاہی تھی۔ مخالف وجود میں ہلکی
جنبش ہوئی تھی مگر بیٹھنے کے انداز میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک دونوں ہا
گھٹنوں کے گرد لپیٹے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ شال کندھے سے ڈھلک کر آدھی بنچ پر اور آدھی گھا
پر لٹک رہی تھی۔ وہ دنیا سے ہی نہیں، خود سے بھی بے نیاز لگ رہی تھی۔

"آر یو آل رائٹ؟" اس نے قدرے جھک کر کہا۔ اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھا کر ا
دیکھا۔ اس تاریکی میں بھی کرب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

"آپ گھر نہیں گئیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"گھر۔" وہ یوں بولی تھی جیسے یہ لفظ اس کے لئے مکمل اجنبی ہو۔ "میرا کوئی گھر نہیں آفند
صاحب! میں تو ایک مکان میں رہتی ہوں اور بہت سی دیواروں، چھتوں، دالانوں، دہلیزوں
مکان، گھر تو نہیں بن جاتے نا؟" وہ بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پہ رکھا۔ جلتی ہوئی
پیشانی نے اس کے خیال کی مکمل تصدیق کی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر ہاتھ ہٹا لیا۔

"آیئے، میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے بہت نرمی سے کہا تھا۔

"میرا وہاں جانے کو دل نہیں چاہتا۔" اس کے لہجے سے بے بسی و بے چارگی عیاں تھی۔

"مس شانزے! پرندے ایک بار اپنا آشیاں چھوڑ دیں تو تپتا سورج تا عمر ان کے پروں پر چ
رہتا ہے۔ خود کو زرد دھوپ کے حوالے مت کیجئے۔" آفندی نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھانا چاہا

"گاڑی کی چابی کہاں ہے؟" آفندی نے اس کے اترے اترے چہرے کو غور سے دیکھا
اس نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جرسی کی جیب سے چابی نکال کر اس کے پھیلے ہو
ہاتھ پر رکھ دی تھی۔

"آیئے۔" وہ اسے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا تھا۔

'کاش میں جان سکتا کہ کون سا دکھ اس لڑکی کو ہر لمحہ گھائل کئے رکھتا ہے۔ پہلی بار اسے دیک
تھا، تب بھی اسے بچوں کی طرح ٹوٹ کر آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ اس کی ناراضگی میں بھی بچوں کی
سرکشی ہے۔ کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے بھیڑ میں کوئی بہت ہی عزیز شخص اس سے بچھڑ گیا ہو۔ جیسے

کسی میلے میں کوئی بچہ اپنی ماں سے جدا ہو جائے اور زندگی کے اس برتاؤ پر خفا ہونے کے ساتھ
ساتھ خوف زدہ بھی ہو۔'

اس نے مڑ کر اپنے برابر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا۔ پانیوں سے لبالب بھری آنکھیں باہر تاریکی
میں نہ جانے کیا کھوج رہی تھیں۔

'اداس کی رات کو پہلی بار سمندر میں ڈوبتے دیکھا ہے۔' اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا۔

"ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ منائیں تو؟" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مس شانزے! اپنا دکھ تو بس اپنا ہی ہوتا ہے نا؟ پھر ہم اس کی تشہیر کر کے دوسروں کو اپنا تمسخر
اڑانے کا موقع کیوں دیتے ہیں؟" اس نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ سختی سے
دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی مگر ضبط کی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تھی۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر روانی
سے بہہ نکلے تھے۔ وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

"زندگی اس طور نہیں گزرے گی جس طور آپ گزار رہی ہیں۔ اس لئے آپ میری ایک بات
مانیں شانزے!" اس نے گاڑی "شانزے ولا" کے سامنے روکی اور پھر پورے کا پورا اس کی طرف
متوجہ ہوا۔ "آپ یوں کیجئے کہ اپنے مقدر کے پیوند زدہ پیرہن کو تسلیم و رضا کے خوشنما لبادے سے
ڈھانپ دیجئے...... اپنی تلخی کو نرمی کا آنچل اوڑھا دیں...... اپنی نفرت کو محبت کے سمندر میں غرق کر
دیں۔ اور اپنے تمام تر احساسات کے گرد ایک سرد، آہنی حصار کھینچ دیں۔ یقین کیجئے اس طرح جینا
بہت سہل ہو جائے گا۔"

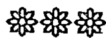
وہ اپنی بات مکمل کر کے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر اس کی طرف کا دروازہ
کھولتے ہوئے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی۔

"آئی ایم سوری، میری وجہ سے......" وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے
بمشکل بولی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں مس شانزے!"

"آپ واپس کیسے جائیں گے آفندی صاحب؟ گاڑی لے جایئے۔" اپنی پشت پر اس کی
آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار رک گیا تھا۔ پھر پلٹ کر بے اختیار اس کی طرف دو قدم بڑھ آیا۔

"ڈونٹ وری۔ میرے قدم اس زمین کے ساتھ ساتھ گردش کرتے ہیں۔ میں یونہی چلا
جاؤں گا۔" اس نے ایک نظر اس کے تپتے ہوئے چہرے اور سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا تھا اور
واپس پلٹ گیا تھا۔



"سنا ہے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے؟" دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ولید احتشام کی آواز سنا
دی تھی اور میں نے غیر ارادی طور پر ہی کروٹ بدل لی تھی۔

"ششش...... ولید بھائی! آپ کب واپس آئے؟ اور یہ شانزے آپ کی دشمن کب سے
گئی؟" ونیزہ نے غالباً میری ڈسٹربنس کے خیال سے پہلے اسے تنبیہ کی تھی اور پھر فوراً سوال
دیا تھا۔

"کل رات ہی واپسی ہوئی ہے۔ حماد بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا اور محترمہ! دشمنوں کا لفظ میں
نے محاورتاً استعمال کیا ہے۔ ویسے ہوا کیا ہے؟" ولید کا اشارہ میری طرف تھا۔

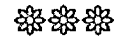
"ٹمپریچر تھا۔ احتشام انکل بتا رہے تھے کہ کل رات بہت دیر سے واپسی ہوئی تھی اور لا
میں صوفے پر ہی سو گئی تھی۔ شاید سردی کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔" ونیزہ نے بہت نیچی آواز
بتایا تھا۔

"ونیزہ! آپ دونوں کی تو بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ کیا آپ سے بھی کچھ شیئر نہیں کرتی
آئی مین کبھی اس نے کچھ کہا نہیں آپ سے ڈیڈی کے بارے میں یا......"

"میرا خیال ہے ہم لوگ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔" ونیزہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا
اور چند لمحوں بعد قدموں کی مدھم سی چاپ کے ساتھ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی د
میں نے دھیرے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

'اور کیا میں نہیں جانتی ونیزہ! تم باہر جا کر کیا کہو گی؟ یہی نا کہ شانزے کو کسی سائیکاٹرسٹ کی
ضرورت ہے۔' دو آنسو چپکے سے آنکھ کے گوشوں سے نکلے تھے اور بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

'اور جمشید آفندی! تم کہتے ہو کہ میں اپنے مقدر کے پیوند زدہ پیراہن کو تسلیم و رضا کے خوش
لبادے سے ڈھانپ دوں...... کیا بہت آسان سمجھ رکھا ہے تم نے تلخی کو نرمی کے آنچل میں سمیٹ
لینا اور نفرت کو محبت کے سمندر میں غرق کر دینا؟...... ہاں، یقیناً جینا بہت سہل ہو جائے گا مگر انسان
ہونے کے ناتے اپنے تمام تر احساسات کو کسی آہنی قلعے میں مقید کیسے کر دوں؟...... مگر تم نے ٹھیک
ہی کہا تھا...... زندگی اس طور ہرگز نہیں گزاری جا سکتی۔ سو تمہارے مشورے پر ایک بار عمل تو ضرور
کروں گی۔' میں نے آخری بار آنسوؤں کو کھل کر بہہ جانے دیا تھا۔



"ہیلو ایوری باڈی۔" میں نے بشاش لہجے میں کہا تو آفس میں بیٹھا ہر فرد اپنی جگہ پر چونک گیا
تھا۔

"آؤ آؤ بادشاہو!...... کہاں گم تھے اتنے دنوں سے؟" زوار شاہ نے اپنی ٹانگیں پیچھے ہٹاتے

ہوئے مجھے گزرنے کی جگہ دی۔

"عاصم بھائی! ہماری عینک کہاں ہے؟" رضا نے میز پر اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔

"بھائی! عینک آپ کی ناک پر رکھی ہے۔" عاصم نے جتایا۔

"اچھا ذرا غور تو کیجئے حاضرین! جو خاتون ابھی ابھی آئی ہیں، یہ اپنی شانزے کی ہم شکل نہیں
لگ رہی ہیں؟" اس نے عینک درست کرتے ہوئے بغور مجھے دیکھا۔

"میرا خیال ہے چھوٹو! تمہیں اپنی عینک کا نمبر بدلوا لینا چاہئے۔ میں شانزے ہی ہوں اور ذرا
یہ تو بتاؤ یہ خاتون کس کو کہا ہے تم نے؟" میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"بندہ اس گستاخی پر معافی چاہتا ہے۔ مگر یہ تو عرض کیجئے اتنا عرصہ کہاں گزارا؟"

"میں بیمار تھی اور زیادہ عرصہ نہیں، صرف ایک ہفتہ۔"

"واہ...... اگر بیماری انسان کو اتنا فریش کر دیتی ہے تو پھر مہینے میں ایک آدھ بار تو ہر بندے کو
بیمار ہونا چاہئے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے رضا۔ آج تم بہت فریش لگ رہی ہو۔" رحمہ نے ستائشی نظروں سے
میرے ڈارک براؤن اینڈ وائٹ فور پیس وول ڈریس کو دیکھا۔

"رحمہ جی صرف فریش نہیں پیاری بھی لگ رہی ہیں۔" رضا کے لہجے میں شرارت تھی۔

"چھوٹو! آئی تھنک تمہاری نظر ابھی تک میرے جوتوں پر نہیں پڑی۔" میں نے سنجیدہ لہجے
میں کہتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔

"نہیں آپا! تمہارے جوتے بھی بہت اچھے ہیں۔" رضا نے کھسیا کر اس طرح پینترا بدلا تھا
کہ سب لوگ بے اختیار ہنس دیئے تھے۔ عین اسی وقت دراوزہ کھول کر تیزی سے کوئی اندر آیا تھا اور
جمشید آفندی کو سامنے دیکھ کر سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سر کے اشارے سے بیٹھنے کا
کہتے ہوئے عاصم کی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"مسز روزی وائٹ سے بات ہو گئی ہے۔ وہ نیکسٹ ویک پاکستان پہنچ رہی ہیں۔" دونوں
ہاتھ ٹیبل کی سطح پر جمائے قدرے جھک کر وہ عاصم سے مخاطب ہوا تھا۔

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

میری نظریں سنہری روئیں والے مضبوط ہاتھوں پر جا کے ٹھہر گئی تھیں۔ گزشتہ کسی رات کا کوئی
لمحہ ایک دم سے روشن ہو گیا تھا۔

'کچھ لوگ روح کے مسیحا ہوتے ہیں اور یہ شخص بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔' میری

نظروں کا زاویہ بھی اس وقت بدلا تھا، جب اپنی بات مکمل کر کے اس نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی
جیبوں میں ڈالے اور دروازے کی طرف پلٹ گیا تھا۔

"اور ہاں۔" دروازے سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر سب کی توجہ اپنی جانب
مبذول کر لی تھی۔

"آپ لوگوں نے کبھی "انا اخمتووا" کو پڑھا ہے؟.....اس کا کہنا ہے۔" ہمارے آنسوؤں سے بے
نیاز غموں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں تفاخر اور سادگی ہے۔"

اس کی ساحرانہ آنکھیں ایک لمحے کے لئے میرے چہرے پر ٹکیں اور دوسرے لمحے وہ دروازے
سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر دروازے سے نظریں ہٹالی تھیں۔

"واہ! کتنی اچھی بات کہی ہے آفندی صاحب نے۔" رضا نے سر دُھنتے ہوئے کہا۔

"آفندی صاحب نے نہیں، اس نے کہی ہے۔" شہزرینہ نے اسے ٹوکا۔

"کس نے؟" رضا نے جان بوجھ کر کہا تو شہزرینہ کو گڑبڑاتے دیکھ کر میں نے فوراً بات بدل
دی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ میرے ذہن میں ایک زبردست آئیڈیا ہے، وہ سنو۔"

"سناؤ۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں نہ ہم سب بچوں کے ساتھ پکنک منانے چلیں۔"

"اوہ یس، گڈ آئیڈیا۔" رضا اپنی کرسی سے اچھل پڑا تھا۔ باقی سب بھی اس آئیڈیا سے پوری
طرح متفق تھے۔ لہٰذا آفندی صاحب سے اجازت اور تمام انتظامات عاصم کے سپرد کر کے ہم
سب لوگ بچوں کو خوشخبری سنانے بھاگے تھے۔ اور جب ایک روز موسم سرما کی نرم گرم دھوپ ہر...
کو بڑی محبت سے چھو رہی تھی، "دارالاطفال" کے مکین پکنک پر جانے کو تیار تھے۔ ننھے بچوں کے
لئے ہوم پکنک کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔

'اور اگر میں یہاں نہ آئی ہوتی تو شاید میرے اندر کی گھٹن مجھے کھل کر سانس بھی نہ لینے دیتی...
میں تو شاید انسانیت پر کبھی اعتبار ہی نہ کر پاتی۔' پارک میں آزاد پرندوں کی مانند اِدھر اُدھر بھا...
کھیلتے بچوں کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا۔ ان کے معصوم قہقہوں کی آوازیں لہروں کی صورت دل...
ہلچل مچا رہی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی شہزرینہ کے پاس آ بیٹھی تھی۔ زوار شاہ ا...
طرف کچھ بچوں کو ساتھ لئے انہیں پھولوں کی مختلف اقسام اور ان کے پارٹس کے بارے میں...
تھا۔ رضا یہاں بھی بچوں کو مارشل آرٹس کے داؤ پیچ سکھا رہا تھا۔ گلزار خان بھاگ بھاگ کر...
جانے والے شرارتی بچوں کو گھیر رہا تھا۔ بچے جان بوجھ کر اس کو تنگ کر رہے تھے اور وہ خوش...

تنگ ہو رہا تھا۔

"کتنے عجیب لوگ ہیں یہ۔ آج کل جب کہ انسانوں کا خون سفید ہوتا جا رہا ہے، یہ لوگ اپنا
پیار، اپنی چاہتیں، اپنی توجہ بالکل غیر بچوں میں اس طرح بانٹ رہے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے وجود
کا حصہ ہوں۔ ان لوگوں کے دل کتنے خوب صورت ہیں نا شہزرینہ!"

"ہوں۔" شہزرینہ نے ہنکارا دیا۔

"اور یہ اپنا زوار شاہ بالکل درویش ہے۔ سمندر جیسا دل ہے اس کا۔" میں نے کھدر کے
کرتے اور جینز میں ملبوس زوار شاہ کو دیکھا۔

"ہوں۔" شہزرینہ نے ایک بار پھر غائب دماغی سے ہنکارا بھرا تو میں محسوس کئے بغیر نہ رہ
سکی۔ اُلجھ کر میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ پر ٹھوڑی جما کے وہ میری طرف
بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ میں نے حیرت سے ایک نظر اسے اور پھر اس کے تعاقب میں عین سامنے
دیکھا تھا اور پھر بے اختیار چونک گئی تھی۔ کیونکہ مرکزِ نگاہ عاصم تھا۔ درخت سے ٹیک لگائے، دونوں
بازو سینے پر لپیٹے وہ انصر سے محوِ گفتگو تھا۔

بلیک پینٹ اور بلیک جرسی میں سلیقے سے جمے جمائے بالوں کے ساتھ وہ خاصا مہذب لگ رہا
تھا۔ چہرے پر ازلی طمانیت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مبہم سی مسکراہٹ بھی جھلک رہی تھی۔ میں
نے ایک بار پھر مڑ کر شہزرینہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عاصم کا عکس نمایاں تھا اور چہرے پہ محبت کا
ایسا خوب صورت تاثر اُبھرا ہوا تھا کہ پھر میں نے اسے کیف آگیں خیالات سے نکالنا مناسب نہیں
سمجھا تھا۔

"دیکھیں محترمہ! آپ خوامخواہ بدتمیزی کر رہی ہیں۔"

"کیا؟...... بدتمیزی میں کر رہی ہوں یا آپ؟ پہلے ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے، اب زبان بھی
چلانے لگے ہو۔ اور مجھے لگتا ہے، تمہارا دماغ بھی چل گیا ہے۔" رضا کی منمنائی آواز کے ساتھ
ایک تیز نسوانی آواز سن کر ہم سب لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

رضا بے چارہ گردن کھجاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور وہ پٹاخہ سی لڑکی دونوں ہاتھ کمر پہ
جمائے اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

"آج تو بری طرح پھنسا ہے رضا۔" اس لڑکی کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے شہزرینہ نے کہا
تھا۔ زوار شاہ، عاصم اور انصر حقیقت حال جاننے کے لئے فوراً اس طرف بڑھ گئے تھے۔

"دیکھیں محترمہ! آپ خوامخواہ بات بڑھانے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ آپ کو کوئی چوٹ
ووٹ بھی نہیں آئی۔ اور میں ہاتھ پاؤں چلاؤں یا زبان، آپ کو اس سے مطلب؟ اور آخری بات

یہ کہ میرا دماغ چلتا نہیں، گھومتا ہے۔ اور جب گھوم جائے تو پھر میں سامنے والے بندے کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور یوں بھی آپ کے لئے تو میرا ایک پنچ ہی کافی ہوگا۔" آخری جملہ بہت فخریہ انداز میں مکا لہراتے ہوئے کہا گیا تھا۔

"کیا؟" مارے صدمے کے لڑکی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ زور پھسکڑا مار کر رونا شروع کرتی، عاصم نے قصہ دریافت کرلیا تھا۔

"دیکھیں بھائی صاحب! یہ پارک ہے۔ کوئی جوڈو کراٹے کا کلب تو نہیں۔" وہ فوراً سے شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔

"میری بال اس طرف آ گئی تھی۔ میں جونہی اٹھانے کے لئے اس طرف آئی، یہ صاحب جھٹ سے فلائنگ کک لگانے کو اچھلے۔ وہ تو میں ہی عقلمند تھی کہ جھٹ سے نیچے بیٹھ گئی اور یہ اُڑتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گئے۔ ورنہ میرے ہونے والے ہزبینڈ تو شادی سے پہلے بیوہ ہو جاتے۔" بات کے اختتام پر لڑکی کا لہجہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"سفید جھوٹ ہے یہ۔" رضا تڑپ اٹھا تھا۔

"عاصم بھائی! میں تو بچوں کو فلائنگ کک کا داؤ سکھا رہا تھا۔ اور میرا نشانہ یہ سامنے درخت تھا۔ یہ محترمہ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑیں بیچ میں۔" رضا نے جل کر کہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ لڑکی کوئی جوابی حملہ کرتی، عاصم نے بڑے سبھاؤ سے دونوں کو خاموش کروا کر، بڑے ... ہوئے انداز میں اس لڑکی سے معذرت کر لی تھی۔ معذرت قبول کرنے کے بعد وہ ... نظروں ہی نظروں میں رضا کو کچا چباتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔ رضا نے طویل سانس کھینچ کر ... ہاتھ بلند کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور اس کے شرمندہ و برہم موڈ کو درست کرنے کے لئے رحمہ نے فوراً دسترخوان بچھانا شروع کر دیا تھا۔

پکنک سے واپسی پر تمام بچوں کو "دارالاطفال" پہنچا کر جب گھر جانے کی باری آئی تو ... زوار شاہ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تھی، جسے بخوشی نبھا کر جب میں گھر ... احتشام احمد متفکر انداز میں کوریڈور میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر کے میں ... بڑھ گئی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی ان کے لب کچھ کہنے کے لئے بے اختیار ... تھے مگر پھر فوراً ہی انہوں نے لب بھینچ لئے تھے اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ... دیکھا وہ سر جھکائے اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول رہے تھے۔

"تو گویا میرے انتظار میں جاگنے کا ناٹک ہو رہا تھا۔" میں استہزائیہ انداز میں دل ہی دل ان پر ہنستی سونے کے لئے بستر پہ آ گئی تھی۔ تھکن اور نیند کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ میں جلد ہی ہو گئی تھی۔



کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ بچے قطار در قطار عمارت کے رہائشی حصے کی طرف جا رہے تھے اور میں شاویز اور فانی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے درحقیقت شہزینہ کی منتظر تھی جو مجھے صرف دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی اور اب پورے پندرہ منٹ کے بعد بھی وہ عاصم کے آفس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ شاویز اور فانی بھی رخصت ہو گئے اور میں پلر سے ٹیک لگائے یونہی آسمان پر ڈولتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔ تبھی پیچھے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میں شہزینہ کی توقع میں مڑ کر دیکھنے لگی۔ مگر دروازہ آفندی کے آفس کا کھلا تھا۔

"آپ ابھی تک گئی نہیں؟" مجھے دیکھ کر وہ ادھر آ گیا تھا۔ ہاتھ میں کی رنگ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ اس وقت کہیں جانے کے لئے نکلا ہے۔

"مجھے شہزینہ کا انتظار ہے۔ کہہ رہی تھی کہ میں اسے ڈراپ کر دوں۔" میں نے اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "آفندی صاحب! کل آپ ہمارے ساتھ پکنک پہ کیوں نہیں گئے؟ سچ ہم نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"ہم سے مراد؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں گڑبڑا گئی۔ "یہ سوال میں نے اس لئے کیا ہے کہ باقی سب لوگ میری غیر موجودگی کے عادی ہیں۔ وہ کبھی ایسی تفریحات میں مجھے مس نہیں کرتے۔"

"لیکن آفندی صاحب! مجھے تو آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی تھی۔" میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا تو اس کی آنکھیں مجھ پر ایک لمحے کے لئے ٹھہر گئی تھیں۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرایا تھا۔ مگر اس لمحے یہ بھلی سی مسکراہٹ مجھے اس کے چہرے پہ اجنبی سی لگی تھی۔

"ان فیکٹ مصروفیت بہت ہوتی ہے۔ میں بہت کم دنوں کے لئے یہاں آتا ہوں، اس لئے کوشش کرتا ہوں کہ کم وقت میں زیادہ کام نمٹا سکوں۔" اس نے پکنک میں شمولیت نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

"کام کرنا اچھی بات ہے آفندی صاحب! لیکن جسمانی و ذہنی تندرستی کے لئے ایسی تفریحات میں حصہ لیتے رہنا چاہئے۔ اور خاص طور پر آپ جیسے انسان کو کہ جس پر بہت سے لوگوں کی خوشیوں کا دارومدار ہو۔"

"ارے لگتا ہے، آپ کی کشتی بھنور سے نکل کر کنارے تک آ پہنچی ہے۔ اب آپ مشورہ لینے

نہیں، دینے لگی ہیں۔" اس نے خوشگوار حیرت سے کہا تھا۔

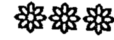
"نہیں، میری کشتی جس طوفان کا شکار ہوئی تھی، اس کے بعد کنارے کی توقع ہی عبث ہے۔ وہ تو کب کی اپنے مسافر سمیت ڈوب چکی۔ میں تو آپ کے مجرب نسخے کی بدولت اس قابل ہوئی ہوں کہ خود کو زندوں میں شمار کر سکوں۔ وہ کسی نے کہا ہے نا کہ......

ہم نے یہ سوچ کے ہنسنے کا ہنر سیکھ لیا
درد رکھنا ہے تو پھر دیدۂ تر کیا رکھنا"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں اُداسی گھل گئی تھی، جسے غالباً وہ محسوس کرتے ہوئے بھی نظرانداز کر گیا تھا۔

"دیٹس لائک آ گڈ گرل۔ زندہ رہنے کے لئے یہ اصول بہترین ہے۔" اس نے نارمل لہجے میں کہا اور پھر آستین قدرے اونچی کر کے وقت دیکھا۔

"اوکے، میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ اس لئے مجھے چلنا چاہئے۔" اس نے جیسے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر پلٹ گیا تھا۔



میں نے کروٹ بدل کر گھڑی پہ نظر ڈالی تو گھنٹے کی سُوئی بارہ کے ہندسے پر لرز رہی تھی۔

"اوگاڈ!" میں نے جھنجلا کر تکیہ دوبارہ منہ پر رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک وقت تھا جب میں یونیورسٹی سے واپسی پر جی بھر کے سویا کرتی تھی اور رات کے اس پہر جب میری آنکھ کھلتی تھی تو میں فوراً بستر چھوڑ دیا کرتی تھی۔ پاپا اپنی تمام کاروباری مصروفیات اس وقت تک نمٹا لیا کرتے تھے یا پھر کل تک ملتوی کر دیا کرتے تھے۔ اور چونکہ اس وقت تک ملازمین اپنے کوارٹرز میں جا چکے ہوتے تھے، س لئے میں اور پاپا لاؤنج میں بیٹھا کرتے تھے۔ اور پھر اس دوران ہم ڈھیروں ڈھیر باتیں کیا کرتے تھے، ہر موضوع پر۔ میں اپنے سارے دن کی روداد انہیں سناتی اور وہ اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کیا کرتے تھے۔ اور ان کے بعد یہ وقت کس قدر مشکل سے گزرتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی روٹین بدل لی تھی۔ اور آج تو محض تھوڑی دیر آرام کی خاطر میں بستر پہ لیٹی تھی، نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ نیند کا آنا محال تھا اس لئے میں اُٹھ بیٹھی تھی۔

بال سمیٹتے ہوئے میں نے یونہی کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ سیاہ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور کتنے دنوں بعد یہ منظر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ورنہ تو سرمئی بادل آسمان کو ذاتی جاگیر سمجھ کر ڈیرا ڈالے رکھتے تھے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے یونہی کھڑے کھڑے پورے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کیا، کیا جائے؟' میوزک سننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے اسٹیریو کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ کتابوں کو عرصہ ہوا ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی پاپا کے بغیر کچھ نیا پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ وڈیو گیم کھیل کھیل کر میں سخت بور ہو چکی تھی۔ آخر میں میری نظر کمپیوٹر پہ جا کر ٹھہر گئی تھی۔ پاپا نے اپنی زندگی میں ہی انٹرنیٹ کنکشن لے رکھا تھا تو اس وقت یہی دلچسپ کام لگا تھا مجھے فریش ہونے کے لئے۔ اس وقت چائے یا کافی ضروری تھی۔ سو کرسی سنبھالنے سے پہلے میں اس مقصد کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سیڑھیوں پر روشنی کا راستہ سا بن گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت مکمل اندھیرا تھا۔ البتہ ٹی وی لاؤنج کی لائٹس آن تھی۔ میں اطمینان سے چلتی ہوئی اس طرف آئی تھی۔

"میرا اک سپنا ہے
میں دیکھوں تجھے سپنوں میں
تو مانے نہ مانے
ہے تو ہی میرے اپنوں میں"

میرے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی کوئی گنگنایا تھا اور جہاں میں بری طرح چونکی تھی، وہاں ناگواری کی ایک تیز لہر بھی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

معلوم نہیں وہ میری آمد سے انجان تھا یا انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفے پر دراز، ایک کشن سر کے نیچے اور دوسرا سینے پہ رکھے آنکھیں بند کیے وہ گنگنا رہا تھا۔ پاؤں مسلسل حرکت میں تھا اور چہرے پر بے خبری مسکراہٹ جو اس وقت مجھے زہر لگی تھی۔

'معلوم نہیں کہاں کہاں سے لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں اس گھر میں۔' دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی میں کچن میں آ گئی۔

'اچھا خاصا ڈرا کے رکھ دیا تھا اس اسٹوپڈ نے۔' میں برنر آن کر کے فریج کی طرف آ گئی تھی۔

"میرے لئے کافی ود شوگر اینڈ کریم۔" میرے ہاتھ سے ملک پیک چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ میں نے لاؤنج کی سمت دیکھا اور پھر وہیں اسٹول پر ڈھے گئی۔

لہجہ بھی مختلف تھا اور الفاظ بھی مگر دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا۔ جسم میں دوڑتے خون کی گردش ایک لمحے کے لئے تیز ہو گئی تھی۔

'اور مجھے لگا پاپا! جیسے آپ نے پکارا ہو' گہرا سانس لے کر میں دل کو تھپکتی اُٹھ گئی تھی جو نہ جانے کیوں ایسی ان ہونیوں پر چونک چونک جاتا تھا۔

"کیا بنا رہی ہیں؟" اب کے آواز دروازے سے اُبھری تھی۔

"آر یو بلائنڈ مسٹر ولید احتشام؟" میں نے ٹی بیگ نکالتے ہوئے بہت مناسب انداز میں پوچھا تھا۔

"ناٹ...... آئی ایم ناٹ...... مگر کیا کروں؟ آپ کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔" لہجہ حد درجہ معصوم تھا مگر مجھے تاؤ دلا گیا تھا۔ یہ تلخی کو نرمی میں بدلنے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ یوں سر پہ چڑھ آ رہا تھا۔

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنا کام مکمل کئے بغیر یہاں سے چلی جاؤں؟" میں نے لہجے میں کہا تو اس نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ بخوشی اپنا کام کریں۔ آئندہ آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا...... ویسے بائے دے وے......" چندلمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔ "یونیورسٹی سے اتنی چھٹیاں کیوں کی جا رہی ہیں؟"

برنر آف کرتے ہوئے میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی سے ڈھیر ساری چھٹیاں کرنے والے بچے کی کلاس لے رہا ہو۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" اس نے فریج سے کنڈینسڈ ملک نکالتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"آپ میری جاسوسی کس خوشی میں کر رہے ہیں؟"

"ارے اس غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ مجھے جاسوسی فلموں کا ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں۔ ہاں، البتہ فون آیا تھا آپ کی مس ونیزہ داؤد کا۔ اتفاق سے میں نے ریسیو کیا تھا۔ بتا رہی تھیں کہ آپ کی Leave لگواتے لگواتے تھک گئی ہیں اور امتحان بے حد قریب آ چکے ہیں مگر اس کے باوجود آپ یونیورسٹی کا منہ دیکھنے پر رضامند نہیں۔" اس نے کافی پھینٹتے ہوئے کہا تھا۔ "ویسے ہوم ورک کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کے باقی سب کاموں کو خدا حافظ کہہ دیا جائے۔ آپ کو اسٹڈیز پر بھی توجہ دینی چاہئے۔" بہت لاپروا سے انداز میں اس نے کہا تھا۔

"مشورے کا شکریہ۔ مگر یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہئے کہ اگلے بندے کو اس کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں۔" میں چائے کا کپ اٹھا کر طنزیہ لہجے میں کہتی کچن سے باہر آ گئی تھی۔ اور جب اپنے کمرے میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر پاور کا بٹن پش کیا تو وقت گزرنے کا احساس ہی باقی نہ رہا تھا۔ اور جب میں وہاں سے اٹھی تھی تو چار بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔

بستر پہ جانے سے پہلے میں نے گلاس ونڈو سے باہر کا جائزہ لیا تو سرد رات دھیرے دھیرے کھسک رہی تھی۔ اور لان کی گھاس پہ شبنم اپنا ڈیرہ جما رہی تھی۔ بے اختیار ہی میرا دل چاہا کہ

ٹھنڈی گھاس پہ ننگے پاؤں چلوں اور یہ خواہش کچھ اس قدر شدید تھی کہ میں گرم شال اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر باہر آ گئی تھی۔

'اور اگر کوئی مجھے اس وقت یہاں چہل قدمی کرتے دیکھ لے تو فوراً میرے پاگل پن پہ مہر لگا دے۔' میں دل ہی دل میں ہنسی تھی اور پھر کپکپاتے ہوئے میں کتنی ہی دیر تک اپنی اس احمقانہ خواہش کی تکمیل کے لئے لان میں ٹہلتی رہی تھی۔



رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بھی دیر سے ہی کھلی تھی۔ اور ابھی میں غنودگی میں ہی تھی، جب اپنے ماتھے پر نرم گرم انگلیوں کا لمس محسوس کر کے میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"شانزے جانو! کب تک سوتی رہو گی؟" پھپھو کے مسکراتے چہرے کے ساتھ ان کی شفیق آواز نے مجھے پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔

"ارے......" میں بے اختیار ہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد پھپھو نے ہماری طرف آنا بہت کم کر دیا تھا۔

"کب آئیں آپ؟" میں نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"ابھی ابھی...... جب تم سو رہی تھیں۔ تم نے تو بھلا ہی دیا ہے ہمیں۔ اس لئے میں نے سوچا، میں خود جا کر دیکھ آتی ہوں۔"

'کہ شانزے کس حد تک پاگل ہو چکی ہے۔' میں نے دل ہی دل میں ان کی بات مکمل کی۔

"اچھا کیا آپ نے۔ اسی بہانے آپ آئیں تو سہی۔" میں اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"آج کل کہاں مصروف رہتی ہو شان؟ یونیورسٹی سے بھی بہت دنوں سے غیر حاضر ہو۔ ونیزہ بے چاری الگ پریشان رہتی ہے۔ کتنی بار تمہیں فون کر چکی ہے۔ موبائل تمہارا ہر وقت آف رہتا ہے۔ کل تو وہ بری طرح رو دی تھی۔ کہنے لگی، شانزے مجھ سے ناراض ہے۔ جبھی کوئی کانٹیکٹ نہیں کر رہی۔" پھپھو چائے پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ تم دونوں کے تعلق میں ناراضگی کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ یقیناً کہیں مصروف ہو گی۔" پھپھو بتا رہی تھیں اور مجھے دل ہی دل میں احساس ہو رہا تھا کہ میں ونیزہ کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔

'اس میں اس بے چاری کا کیا قصور تھا؟...... نہ جانے میں غصے میں اس کے سامنے کیا کچھ کہہ گئی تھی جو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں ایک سائیکک کیس بن چکی ہوں۔' اپنی جذباتیت میں

"ہیلو!" میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بھئی کہاں رہیں آج سارا دن؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا تھا۔

"یونیورسٹی چلی گئی تھی۔" میں نے مختصراً بتایا۔

"محترمہ! جس روز یونیورسٹی جانا ہو، بتا کر جایا کریں۔ رضا کا تو سمجھو آج سورج ہی طلوع نہیں ہوا۔ یوں بھی آفس آتے ہی تمہیں دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر کوئی آنے کے بعد تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔" اس نے کتاب میں بال پن پھنسا کر کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو زوار شاہ! اب میں ایسی بھی اہم ہستی نہیں۔" میں نے اس کی بات کو محض مذاق سمجھتے ہوئے فوراً ٹالا اور بات بدلنے کے لئے عاصم کو پوچھنے لگی۔

"وہ آفندی صاحب کو سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گیا ہے۔" اس نے عام سے انداز میں بتایا تھا اور میں ٹھٹک گئی تھی۔

"آفندی صاحب کو سی آف کرنے؟ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"امریکہ گئے ہیں۔"

"کمال ہے۔ کل شام ہی تو انہوں نے مجھے گھر ڈراپ کیا تھا مگر ایسا کوئی ذکر انہوں نے نہیں کیا۔" میں بے ساختہ ہی کہہ گئی تھی اور زوار شاہ نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔

'اور کیا اسے ایسا کوئی ذکر مجھ سے کرنا چاہئے تھا؟' زوار شاہ سے پہلے میرے دل نے ہی سوال داغ دیا تھا اور میں گڑبڑا گئی تھی۔

"کوئی کام تھا کیا؟" زوار شاہ نے میرے ایک دم خاموش ہو جانے پر سادہ سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"ہاں۔" میں ذرا سا چونکی۔ "ہاں، کام ہی تھا۔ مگر کچھ ایسا خاص بھی نہیں۔ ان کی واپسی کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔" میں نے بروقت خود کو سنبھالا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ ویسے بھی انہیں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ دو ہفتے بعد "دارالاطفال" کی سالانہ تقریب ہے۔ جس میں شرکت کے لئے انہیں جلدی لوٹنا پڑے گا۔"

"ہوں، اچھا پھر میں ذرا اپنی کلاس دیکھ لوں۔" میں جلد ہی وہاں سے نکل آئی تھی۔

'کس قدر بے وقوف ہوں میں بھی۔ بھلا وہ مجھے اپنے جانے کی اطلاع کیوں دیتا؟ کہیں بھی آنا جانا اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اور اپنے ذاتی معاملات میں وہ مجھ سے کیوں ڈسکس کرنے لگا؟' میں نے خود کو بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ اور یہ بات کہ "دارالاطفال" کی سفید عمارت پہ اتری گلابی شام مجھے اس لمحے بے حد اُداس لگی تھی۔



میں بہت دنوں بعد اسٹڈی روم میں آئی تھی۔ اپنے تمام نوٹس اور کتابیں بھی یہیں اٹھا لائی تھی تاکہ یکسو ہو کر پڑھ سکوں۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے میں نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے طائرانہ نظر اپنے اطراف میں ڈالی۔ ان گنت کتابوں سے شیلف بھرے ہوئے تھے۔ پاپا کو شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ ملکی شاعروں کے علاوہ ان کے پاس شیلے، کیٹس، انگر کرسٹن سن، بیرا گوڈی، اوپ اور گارسیا لورکا جیسے غیر ملکی شاعروں کی بھی بہترین کتابیں موجود تھیں۔ اور اب یہ ساری کتابیں جوں کی توں بند پڑی تھی۔ ان کو ہمہ وقت چھونے والی نظریں اب کہیں نہیں رہی تھیں۔ دل میں ہوک سی اٹھی تھی اور کرسی کی پشت پہ رکھی میری انگلیاں کپکپا سی گئی تھیں۔

یہ وہی اسٹڈی روم تھا، جہاں میں نے اپنے ہر ایگزام کی تیاری پاپا کے ساتھ مل کر کی تھی۔ جہاں کسی بات کی سمجھ نہ آتی میں فوراً پاپا کے پاس جا پہنچتی اور میرے بار بار ڈسٹرب کرنے کے باوجود کبھی ان کی تیوری پر بل نہیں پڑتا تھا۔ کبھی ان کی مسکراہٹ بیزاری میں اور خوشدلی جھنجلاہٹ میں نہ بدلتی تھی۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ ذہن میں ارتعاش پیدا کرنے لگا تھا اور میں غیر ارادی طور پر ہر چیز کو چھو چھو کر پاپا کے گمشدہ لمس کو ڈھونڈنے لگی تھی۔

ان کا اسٹڈی ٹیبل، ان کی چیئر، ان کا لیمپ، گولڈن فریم کا نہایت خوب صورت اور نفیس چشمہ، صندل کی لکڑی سے بنا قلم۔

اور

ان کی پرسنل ڈائری جو پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک خالی تھی۔ حالانکہ یہ ڈائری ہر روز میں ان کے سامنے کھلی دیکھتی تھی۔

'اور نہ جانے وہ کون سی باتیں تھیں پاپا! جو آپ نوکِ قلم پر لانے کی جرأت نہ کر سکے۔'

میں نم آنکھوں کو رگڑ کر اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ کارپٹ پر کشن رکھ کر میں نے نشست سنبھالتے ہوئے دوبارہ پاپا کی مخصوص چیئر کی طرف دیکھا تھا جو کسی ماں کی اُجڑی گود کی طرح خالی اور ویران لگ رہی تھی۔ شفقت و اپنائیت کے محبت بھرے لمس سے عاری فضا میں سناٹا سا اتر آیا تھا اور میں نے اپنی ناکام نظروں کو سفید کاغذ پر بکھرے سیاہ لفظوں میں گم کر لیا تھا۔

چونکہ بہت دنوں بعد کتابوں سے رشتہ جوڑا تھا، اس لئے ابتدا میں پڑھنے میں کافی دقت ہوئی تھی۔ مگر جب ذہن آمادہ ہوا تو پھر میں صفحات پلٹتی چلی گئی۔ اور جب ساڑھے تین گھنٹے مسلسل پڑھنے کے بعد میں نے کتاب بند کی تھی، تب ملازمہ دروازہ ناک کر کے اندر چلی آئی تھی۔

"جی کھانا لگا دوں ٹیبل پر یا یہیں لے آؤں؟"

ونیزہ کو دکھ پہنچانے پر میں گلٹی فیل کر رہی تھی۔

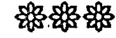
''نہیں پھپھو! میں ناراض نہیں ہوں۔ ونیزہ سے کہیے گا، میں صبح یونیورسٹی آؤں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو پھپھو کا چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا۔

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے کپ رکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں اب چلتی ہوں۔ تم کسی روز گھر پہ بھی چکر لگا لینا۔ تمہارے انکل بہت یاد کر رہے تھے تمہیں۔ اور ہاں۔'' وہ جاتے جاتے پلٹی تھیں۔ ''رات کو جلدی گھر آیا کرو اور کھانا وغیرہ وقت پر کھایا کرو۔ کل فصیحہ نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔ بہت فکر مند تھی تمہارے بارے میں۔ اس کا خیال رکھا کرو۔ آخر کو ماں کا دل ہے، پریشانی تو ہوتی ہو گی نا اس کو بھی تمہاری اس بدلی ہوئی روٹین سے۔'' انہوں نے پیار سے مجھے سمجھایا تھا۔

''ویری اسٹرینج پھپھو! کہ وہ میرے بارے میں فکر مند رہتی ہیں۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق تو ان کے سینے میں دل ہے ہی نہیں کجا کہ ماں کا دل۔'' میں نے کندھے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا۔

''اونہوں..... بری بات ہے۔ یوں نہیں کہتے۔'' انہوں نے سرزنش کی اور پھر ساڑھی کا پلو سمیٹتی باہر نکل گئی تھیں۔



''ایک طرف انسان بڑے طنطنے سے اشرف المخلوقات کا تاج سر پہ سجائے پھرتا ہے تو دوسری طرف یہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بستی دیکھ رہی ہیں مس شانزے ایمان! یہاں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ یہاں انسان مفلسی کی گود میں آنکھ کھولتا ہے اور بھوک کی گود میں جا سوتا ہے۔ یہاں غربت ماں کی گود ہے اور افلاس باپ کی شفقت۔ یہاں کوئی بہن، بھائی، دوستی کے رشتے کو نہیں ترستا۔ یہاں سب ''روٹی'' کو ترستے ہیں۔ ہماری بھری ہوئی تجوریوں میں سے اپنا حصہ چاہتے ہیں، اپنی محنت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب اپنی محنت کا معاوضہ بھی وصول نہیں کر پاتے تو اپنے مقدر کو بیچ دینا چاہتے ہیں۔

آپ جانتی ہیں مس شانزے! یہاں اگر کسی ماں سے اس کا بچہ گود لینے کی خواہش کی جائے تو وہ اسے خوشی خوشی ہمارے حوالے کر دیتی ہے۔ اپنے کلیجے پہ بھاری پتھر کی سل رکھ کر وہ اس احساس سے اطمینان کشید کرتی ہے کہ اس کا بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھائے گا، چاہے کسی کی گود میں بھی رہے اور ہم...... ہم مغرور و متکبر لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔ ہم نے کبھی آنکھیں کھول کر دیکھا ہی نہیں تو ہمیں معلوم کیسے ہو کہ کون بھوکا ہے؟ کس کے

تن پہ کپڑا نہیں اور کون سائبان کو ترس رہا ہے؟...... کس نے تپتی سڑکوں پہ لوٹتے ہوئے جان دے دی ہے اور کون سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا۔''

لمحہ بھر کے لئے وہ خاموش ہوا تو میں نے گھاس پر سے نظریں ہٹا کر اس شخص کو دیکھا، جس کا لہجہ حد درجہ تلخ تھا اور بالکل اجنبی لوگوں کا دکھ قطرہ قطرہ اس کی سبز آنکھوں کو بھگو رہا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر خانہ بدوشوں کی اس بستی پر ڈالی۔

اور ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ اس وقت سردی کے شدید موسم میں، جب کہ میں سویٹر، ہائی نیک، جرسی اور اس پر لیدر کی جیکٹ پہنے ہوئے تھی، اس بستی کے بچے نیکروں اور پھٹی پرانی پوشاکوں میں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے چہرے پہ چھائی بے بسی، مردنی، زندگی سے بیزاری کی واضح علامت تھی۔ اور یہ سب میرے لئے نیا ہی تو تھا، زندگی کا یہ روپ میں نے اس سے پہلے کب دیکھا تھا؟ اور یہ محض اتفاق ہی تو تھا کہ آج میں اس شخص کے ساتھ یہاں چلی آئی تھی۔

''دارالاطفال'' سے نکل کر کچھ دور جا کر جب پٹرول ختم ہونے پر میں جھنجلائی ہوئی، ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی تھی، تب ایک گاڑی میرے نزدیک آ رکی تھی اور اپنے سامنے جمشید آفندی کو دیکھ کر میں نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا۔ اور جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شہری آبادی سے دور ایک خانہ بدوش بستی میں ضرورت کی کچھ اشیاء پہنچانے جا رہا ہے تو میں نے بے اختیار ہی ساتھ جانے کی فرمائش کر ڈالی تھی، محض ایک ایڈونچر کے شوق میں۔ اور یہ تو مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا تھا کہ یہ ایڈونچر نہیں، ایک تلخ اور بھیانک حقیقت ہے۔ روح کو جھنجھوڑ دینے والی۔

اور جب ''دارالاطفال'' کا ملازم افضل تمام چیزیں لوگوں میں تقسیم کر چکا تھا، تب ہم لوگ دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو لوگ چلتے ہوئے سڑک تک آ گئے تھے۔ اور پھر جب تک گاڑی موڑ نہیں مڑ گئی تھی، میں بیک ویو مرر سے ان لوگوں کو دیکھتی رہی تھی جو دونوں ہاتھ اٹھائے اس اجنبی انسان کو دعائیں دے رہے تھے جو ان کے درد کا درماں بن کر آیا تھا اور گھڑی بھر میں لوٹ گیا تھا۔ وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ رعونت بھری بے نیازی سے وہ سڑک پر نظریں جمائے گاڑی چلا رہا تھا۔ کھڑکی سے آتی سرد ہوا نے اس کے چہرے پہ سرخی سی پھیلا دی تھی۔

''ہاں بھئی، یہ رعونت اس پر جچتی بھی ہے کہ وہ صرف باتوں کا ہی نہیں، کردار کا بھی دھنی ہے۔'' میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر ونڈ اسکرین پر جما دی تھیں۔



''ارے یہ کون ہے؟''

''لگتا ہے، اسے پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔''

''پوچھ لو کہیں راستہ بھول کر تو ادھر نہیں آ نکلیں؟''

''شاید میری نظریں دھوکا کھا گئی ہیں۔''

''ارے کیا یہ واقعی تم ہو؟''

یونیورسٹی میں میری آمد پر اس اس طرح سے حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ میں بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

''بس بھی کرو یار! تم لوگ تو خوامخواہ ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' آصف نے ڈپٹ کر سب سے کہا تو میری خلاصی ہوئی۔

''ٹھیک ہے آصف بھائی! ہم اس کی غلطی معاف کر دیں گے مگر جرمانہ لازم ہے۔'' نوید دو دو کرسیاں پھلانگتا ہوا قریب آ گیا۔

''ہوں...... مگر پہلے یہ بتایا جائے کہ جرمانے کی نوعیت کیا ہو گی؟ تا کہ ہم اس پر غور فرمانے کی زحمت کر سکیں۔'' میں نے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں مادام! بس کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں معمولی سا لنچ۔'' نوید نے فرمائش بھی یوں کی تھی جیسے دو روپے کی ریوڑیاں لینے کی خواہش ہو۔

''ویسے تو تمہیں بگے پہلوان کا چھپر والا ہوٹل ہی سوٹ کرتا ہے۔ مگر خیر، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔'' میں نے اپنے کالر سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے کہا اور پھر کلاسز آف ہونے پر ہم سب لوگ گاڑیوں میں پھنس پھنس کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں اپنی چیخم دھاڑ اور بے تکی حرکات سے لوگوں کو محظوظ کرنے اور انتظامیہ کو زچ کرنے کے بعد ہم لوگ باہر آئے تو ونیزہ اصرار کرتے ہوئے مجھے اپنی طرف لے گئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں نے واپسی کا قصد کیا تو اس نے ڈھیر سارے نوٹس میرے حوالے کر دیئے تھے۔

''پوزیشن لینا تو محال ہے لیکن اگر یہ ڈیڑھ ماہ بھی تم ڈٹ کر تیاری کرو تو بہت اچھے مارکس سے پریویس کلیئر کر لو گی۔'' اس کے کہنے پر میں دل ہی دل میں خود کو پڑھنے پر آمادہ کرتے ہوئے نوٹس سمیت کر اٹھ گئی تھی جو اس پورے عرصے میں ونیزہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کر رکھے تھے۔ گھر پہنچ کر نوٹس رکھنے اور ڈریس چینج کرنے کے بعد میں ''دارالاطفال'' آ گئی تھی۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے میں نے عادتاً عاصم کے آفس میں جھانکا تھا۔ عاصم کی سیٹ خالی تھی البتہ زوار شاہ تنہا بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا۔

''کون کون ہے کھانے پر؟'' میں نے ایک لمحہ سوچ کر پوچھا تھا۔

''کوئی بھی نہیں۔ اس وقت تو گھر میں آپ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر ٹیبل پہ ہی لگا دو۔ میں آ رہی ہوں۔'' میرے جواب پر اس نے تاسف سے مجھے دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اسے یقیناً اس بات پر حیرت و افسوس ہوا تھا کہ میں گھر والوں کی موجودگی میں ہمیشہ اپنے کمرے میں کھانا کھاتی تھی اور اب سب کی غیر موجودگی میں ٹیبل تک جا رہی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر ابھی میں نے پہلا نوالا ہی منہ میں ڈالا تھا جب اچانک بیرونی دروازے پر ہلچل سی مچ گئی تھی۔ باتوں اور قہقہوں کی آواز نے مجھے خاصا حیران کر ڈالا تھا۔ بے اختیار ہی پلٹ کر میں نے آوازوں کی سمت دیکھا تھا۔ اور جب آنے والوں کو دیکھ کر میں سیدھی ہوئی تھی تو میرا منہ حلق تک کڑوا ہو چکا تھا۔

''ہیلو شانزے ڈیئر!'' مما کی پُرجوش آواز عقب میں اُبھری تھی۔ وہ دو ہفتے پشاور میں اپنی کسی دوست کے پاس گزار کر آئی تھیں اور شاید ان کے خیال میں، میں ان کے بغیر بہت اُداس ہو گئی تھی۔ جبھی تو بھرپور لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگایا تھا مگر مجھے ان کے وجود سے ایسی وحشت ہوئی تھی کہ میں نے فوراً ہی خود کو ان کی گرفت سے آزاد کروا لیا تھا۔ مما نے تحیر آمیز برہمی سے مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پہ رقم ناگواری کے تاثرات یقیناً انہوں نے بہت آسانی سے پڑھ لئے تھے۔ مگر احتشام احمد اور ولید احتشام کی موجودگی کی بنا پر وہ میری اس بدتمیزی کو نظر انداز کر گئی تھیں اور فوراً ماسی نذیراں کو پکار کر کھانے کا کہنے لگی تھیں۔ اس نے چند لمحوں میں ہی کھانا سرو کر دیا تھا۔ میرے عین سامنے مما بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے دائیں طرف احتشام احمد اور بائیں طرف ولید احتشام تھا۔ مما نہ جانے کون سا قصہ شروع کئے بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے اور اس ٹرائی اینگل میں مجھے اپنا آپ ایک دم نہایت فضول اور بہت ہی غیر اہم سا لگا تھا۔ تب ہی مما کی نظر مجھ پہ پڑی تھی۔

''کیا بات ہے جانو! تم ٹھیک طرح سے کھا کیوں نہیں رہیں؟'' وہ کچھ دیر پہلے کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے محبت کے اسی انداز میں بولی تھیں۔

'اور اگر یہ نظر ایک ماں کی ہوتی تو تب آپ یقیناً یہ دیکھ سکتیں کہ میں تو ٹھیک طرح سے سانس بھی نہیں لے رہی۔'

میرے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا تھا۔ سو خاموشی سے پانی پی کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''شانزے بیٹا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میں چلتے چلتے ٹھہری سی گئی تھی۔ احتشام احمد کا

لہجہ متفکر تھا اور چہرے پہ بے پناہ نرمی۔

'شاید یہ شخص بہت بڑا اداکار ہے۔' میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا اور ان تیز
سوالیہ نظروں کو نظر انداز کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

''یہ شانزے کو کیا ہوا ہے؟'' احتشام احمد نے فوراً مما کو میری بجھی بجھی کیفیت کی طرف متوجہ
کیا تھا۔

''ہونا کیا ہے۔ ایمان حسن کی طرح اس کو بھی عادت ہے ہر وقت بسورتے رہنے کی۔
چھوڑیں آپ اس کو۔ یہ چکن لیں۔ ہاں ولید! میں کیا کہہ رہی تھی تم سے؟'' وہ دوبارہ سے اپنا
لے بیٹھی تھیں اور میں نے مرے مرے قدموں سے آخری سیڑھی بھی پار کر لی تھی۔ بیڈروم میں
داخل ہونے سے پہلے میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے کوئی بات کر رہی
تھیں۔ فانوس کی تیز روشنی میں ان کی سفید رنگت دمک رہی تھی۔ چہرے پر سرخی سی پھیل رہی تھی۔
ڈارک لپ اسٹک سے مزین ہونٹ اور سفید ہموار موتیوں جیسے دانت۔ سفید لباس میں ان کا حسن
کس قدر مکمل تھا۔ روشن اور شاداب چہرے پر خوشیوں کا جھلملاتا عکس۔

'آپ تو آج بھی اتنی ہی خوش حال، اتنی ہی مطمئن ہیں مما! ایک طرف من پسند ہم سفر
دوسری طرف بیٹے کا مضبوط سہارا۔ محرومیاں تو صرف میرے حصے میں آئی ہیں۔ سب کچھ چھین لیا
آپ نے مجھ سے۔ باپ، دوست، دکھ شناس، ہر طرح سے تہی داماں کر دیا آپ نے مجھے۔ اور اس
کے باوجود بھی آپ اتنی مطمئن و پُرسکون ہیں، جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔' میں نے غور سے ان کا چہرہ
دیکھا جہاں دکھ کی کوئی لکیر بھی ثبت نہ تھی۔

'کیا پچھتاوے کے لہراتے، بل کھاتے سانپ نے کبھی ان کے سینے پہ ڈنک نہیں مارا ہوگا؟

اور

کیا اتنے ڈھیر سارے دنوں میں کوئی ایسا لمحہ نہ آیا ہوگا جو انہیں احساسِ زیاں سے دوچار کر
گیا ہو؟

کوئی احساسِ جرم، جس نے ان کی راتوں کی نیند اُڑا دی ہو؟

بیتی رفاقتوں کا کوئی ایسا لمحہ جو یاد بن کر دل میں کھب گیا ہو اور پھر ضبط کا کوئی یارا نہ رہا ہو،
اپنے فعل پر کوئی دکھ، کوئی ندامت...... جس نے سانس لینا دوبھر کر دیا ہو۔'

میں نے ہر زاویے سے ان کے چہرے کو کھوجا تھا مگر وہاں بھولے سے بھی کوئی ایسا تاثر
اُبھر رہا تھا۔ وہاں تو خوشی تھی، مسکراہٹ تھی، روشنی تھی۔

'تو گویا میرا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ اس عورت کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں۔' میرے

مجھے دل میں نفرت کی تیز لہر ایک بار پھر انگڑائیاں لینے لگی تھی۔



''دارالاطفال'' کے سالانہ فنکشن کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ ہر فرد بڑے جوش و خروش
سے اس تقریب کو یادگار بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ رضا ہر روز ایک آدھ گھنٹے کے لئے آتا
اور پھر دوڑ دھوپ کر واپس چلا جاتا۔ کیونکہ اپنے بی ایس سی کے ایگزام کی وجہ سے وہ ان تیاریوں میں
بھرپور شرکت نہ کر پا رہا تھا۔ اس روز بھی میں یونیورسٹی میں چند اہم کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد
دارالاطفال آ گئی تھی اور جب یہاں سے باہر نکلی تھی تو اندھیرا ہر سُو پھیل چکا تھا۔

'اور آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے آفندی صاحب کو گئے ہوئے۔' ریڈ سگنل پر گاڑی روکتے
ہوئے میں نے سوچا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں ہر روز آفس کے بند دروازے کو میں نے ایک لمحے
کے لئے رک کر دیکھا۔ لاشعوری طور پر یہ خواہش دل میں اُبھرتی رہی تھی کہ آفس کا دروازہ لاک نہ
ہو اور ہر دفعہ ہی یہ بند دروازہ مجھے چڑا کر رکھ دیتا تھا۔

'اور اس اجنبی سرزمین، اجنبی لوگوں اور اجنبی فضاؤں میں سانس لیتے اس شخص کے وہم و
گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس لمحے کوئی اسے کتنا مس کر رہا ہے۔' گرین سگنل پر میں نے گاڑی
آگے بڑھاتے ہوئے وقت دیکھا۔ آج یونیورسٹی میں ونیزہ نے کوئی گھنٹہ بھر میرے کان کھانے
کے بعد مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ آج میں ڈنر ونیزہ اور حماد کے ساتھ کروں گی۔

''یار! تم خوامخواہ مجھے کباب میں ہڈی بنوا رہی ہو۔'' میں نے جھلا کر اسے باز رکھنے کی کوشش
کی تھی۔ مگر اس کا کہنا تھا کہ حماد نے خاص طور پر یہ ڈنر میرے لئے ارینج کیا ہے۔ اس لئے کباب
میں ہڈی والا محاورہ یہاں درست نہیں بیٹھتا۔ اور جب یہ ہی بات حماد نے فون پر مجھ سے کہی تھی تو
پھر میں انکار نہ کر سکی تھی۔

ونیزہ نے مجھے آٹھ بجے ہوٹل پہنچنے کا کہا تھا اور اس میں ابھی پونا گھنٹہ باقی تھا۔ سو یہ پونا گھنٹہ
میں نے بے کار و بے مقصد گاڑی کو سڑکوں پر دوڑاتے ہوئے گزارا تھا۔ کیونکہ آج کل موسم میں وہ
مخصوص نمی نہ تھی اور نہ ہی آسمان پر گھنے بادلوں کا ڈیرہ تھا۔ سو اس وقت اطراف میں خوب رونق اور
ہلچل تھی۔ اور جب میری کلائی پر بندھی گھڑی نے آٹھ بجنے پر اپنا مخصوص الارم بجایا تھا، تب میں
نے گاڑی کا رخ موڑ دیا تھا۔

''فائیو ویز'' کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے میں نیچے اتری تو عین اسی لمحے کوئی
گاڑی میرے برابر آ رکی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے یونہی سرسری نظر ہنڈا اسوک سے
اُترتے شخص پر ڈالی تھی اور ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ سرسری سی نظر ایک بھرپور اور گہری

نگاہ میں بدل گئی تھی۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات دل میں ہلچل سی مچا گئے تھے۔

'اور کیا بے دھیانی میں کی گئی دعائیں یوں بھی مستجاب ہوتی ہیں؟'

میں نے اپنا رخ پوری طرح اس کی طرف موڑ دیا تھا اور اسے پکارنے کے لئے ابھی میرے لب وا ہی ہوئے تھے جب اچانک اس کی طائرانہ نظریں مجھ سے آملی تھیں۔ اور ابھی میں مسکرا ہیلو بھی نہ کہہ پائی تھی جب وہ نگاہیں اپنی تمام تر اجنبیت اور سرد و سپاٹ تاثر سمیت میرے چہرے سے ہٹ گئی تھیں۔ میرے پھیلے ہوئے ہونٹ ایک دم ہی سکڑ گئے تھے اور میں ششدر سی اپنی جگہ کھڑی اس کی چوڑی پشت کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ حد درجہ بیگانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ غیر ملکی عورت کے ساتھ جا چکا تھا اور میں دم بخود سی اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ اور ابھی میں اس کے اس رویے کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی، جب اچانک کسی نے زور سے میرا بازو ہلایا۔ میں بری طرح چونک کر دیکھا۔ وئیزہ ہنستے مسکراتے چہرے سمیت میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

''کہاں گم ہیں محترمہ! ہم لوگ آ چکے ہیں۔'' اس کے پیچھے حماد کو دیکھ کر میں نے بہ دقت اپنے چہرے پہ مسکراہٹ سجالی۔

''ہاں، میں آپ ہی لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔''

''تو پھر جلدی چلو نا۔ میرا تو سردی سے دم نکلا جا رہا ہے۔'' وئیزہ نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے کہا تو میں نے آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد میں ایک ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ کسی اور ہوٹل میں چلیں؟'' میں نے پلٹ کر ان دونوں سے کہا۔

''کسی اور ہوٹل میں...... کیوں، خیریت؟'' حماد نے حیران سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں خیریت ہی ہے مگر......'' میں الجھ سی گئی تھی۔ ''میرا مطلب ہے...... ڈنر ہی کرنا ہے تو کسی اور جگہ سہی۔'' میری اس بے تکی بات پر حماد نے حیرت سے وئیزہ کو دیکھا تھا اور معلوم نہیں وئیزہ نے اسے اشارہ کیا تھا یا حماد نے خود ہی اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا اسی لئے فوراً ہی خوش دلی سے اس نے کہہ دیا۔

''او کے بھئی۔ ایز یو وِش۔ بتاؤ کہاں جانا چاہو گی؟''

''میرا خیال ہے ''شایان'' میں چلتے ہیں۔ وہ یہاں سے کافی نزدیک ہے۔'' میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا اور وہ دونوں راضی برضا ایک مرتبہ پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس وقت بری طرح ڈسٹرب ہو چکی تھی اور اگر ان دونوں کا خیال نہ ہوتا تو فوراً ہی سے بھاگ نکلتی۔ مگر اب صرف ان کی خاطر میں ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر خود کو نارمل کرنے

تھی۔ اور ''شایان ریسٹورنٹ'' تک پہنچتے پہنچتے میں خود پر اس حد تک قابو پا چکی تھی کہ سردی سے بچنے کے لئے حماد کے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتی وئیزہ میرے جملوں پر بری طرح بلش ہوتی جا رہی تھی۔



دل جس کو دیکھنے کی تمنا میں گم رہا
کل یوں ملا تھا جیسے ہمیں جانتا نہیں

کتنا مختصر تھا وہ لمحہ جو ہم دونوں کے بیچ آیا تھا اور چپ چاپ سرک گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود دل کی بے کلی اس طرح سے بڑھی تھی کہ رات کے اس پہر بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان سبز آنکھوں کو اپنے چہرے کو چھوتے اور پھر بے انتہا اجنبیت سمیت پلٹتے میں اس لمحے بھی محسوس کر رہی تھی اور جوں جوں ان آنکھوں کا اجنبی تاثر میرے دل میں واضح ہو رہا تھا، توں توں بے عزتی کا احساس دل میں بڑھتا جا رہا تھا۔ نہ دیکھنا اور بات تھی اور دیکھ کر اس طرح نظرانداز کر دینا مجھے کسی طرح ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

'آخر کیوں کیا اس نے ایسا؟ کیا میں اتنی ہی گئی گزری تھی کہ وہ مجھے ہیلو تک نہ کہہ سکتا تھا اور اس غیر ملکی عورت کے ساتھ چلتا بنا۔' میں نے بے چینی سے کمبل دور پھینکا اور اٹھ بیٹھی تھی۔ کتنا سوچا تھا میں نے اس شخص کے بارے میں پچھلے سات دنوں میں بے وجہ ہی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے۔

کاپی پہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے۔

دار الاطفال کے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے۔

کسی مستحق فرد کو سو سو کے کئی نوٹ تھماتے ہوئے۔

کسی بچے کے آنسو صاف کرتے ہوئے۔

اس کا سحر انگیز سراپا جیسے زبردستی آنکھوں میں گھسا چلا آیا تھا۔ اور آج جب مجسم میرے سامنے آیا تھا تو اس کا گریز مجھے خود سے بھی شرمندہ کر گیا تھا۔

'ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس عورت کے سامنے مجھ سے مخاطب نہ ہونا چاہتا ہو۔' دل نے توجیہہ پیش کی تھی اور مجھے وہ عورت یاد آ گئی تھی، جس کی چال میں بہت تیزی اور بے باک سا اعتماد تھا۔

'مگر میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں، جس کی دوسروں کے سامنے تشہیر کرنا ممکن نہ ہو۔ کون نہیں جانتا کہ وہ ''دار الاطفال'' جیسے ادارے کا مالک جمشید آفندی ہے اور جس ادارے

میں بیسیوں ورکرز اس کے تحت کام کرتے ہوں، وہاں کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ کوئی ورکر ان
ٹکرا سکتا ہے۔ پھر مسکرا کر وِش کرنے میں آخر حرج ہی کیا تھا؟'

سیاہ آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے میں نے اُلجھ کر سوچا تھا۔ مگر بہت کوشش کے باوجود
سرا میرے ہاتھ میں نہ آیا تھا۔ حتیٰ کہ کھڑکی سے آتی سرد سرسراتی ہوا سے میرے رونگٹے کھڑے
ہونے لگے تھے۔ تب میں کھڑکی بند کر کے دوبارہ بستر پہ آ گئی تھی اور سونے سے ایک لمحہ قبل
سبز اجنبی آنکھیں میرے دماغ میں گھومتی رہی تھیں۔



رات دیر سے سونے کے باوجود صبح میری آنکھ جلد ہی کھل گئی تھی۔ یونیورسٹی بند تھی
کوشش کے باوجود خود کو "دارالاطفال" جانے پر آمادہ نہیں کر سکی تھی اور اس وقت میں ناشتہ
کر رہی تھی جب احتشام احمد جاگنگ سے واپس آئے تھے۔ میری یہاں موجودگی پر وہ ٹھٹکے
ہوں گے کیونکہ اس وقت تک میں اپنی گاڑی سمیت گھر سے نکل گئی ہوتی تھی یا پھر اپنے بیڈروم
ابھی تک بستر پہ پڑی ہوتی تھی۔ بہرحال وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے
تھے۔ اور جب وہ سوٹڈ بوٹڈ آفس جانے کے لئے کمرے سے باہر آئے تو ٹی وی لاؤنج میں میرے
پاس آ کر قدرے رک سے گئے تھے۔

"شانزے بیٹا!...... بہت دنوں بعد گھر میں دیکھا ہے تمہیں اور بہت اچھا لگ رہا ہے!
اگر فارغ ہو تو چلو، آج اپنے آفس کا چکر لگا لو۔"

"نو تھینکس۔" ان کے نرم لہجے کے جواب میں، میں نے قدرے رُکھائی سے کہہ کر ٹی وی پر
نظریں جما دی تھیں۔

"او کے، انجوائے یور سیلف۔" انہوں نے ہولے سے میرا سر تھپتھپایا تھا اور پلٹ گئے
جبکہ میں دل ہی دل میں تاؤ کھا کر رہ گئی تھی۔ ٹی وی پہ متحرک تصویریں بور کرنے لگیں تو میں
باہر لان میں آ گئی۔ موسم سرما کی نرم گرم، معصوم اور الہڑ سی دھوپ لان کی دیواروں سے اتر
گھاس پہ آ ٹھہری تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پرندوں کے پنجرے کے پاس آ گئی
کی شدت سے بے زار آسٹریلین پیرٹ دھوپ میں پَر پھیلائے جیسے اپنے وجود میں جمی
ٹھنڈک کو پگھلا رہے تھے اور خاصے پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ چائنیز ڈو، پروں کو مخصوص انداز
حرکت دیتے ہوئے رقص میں مصروف تھی۔ اور ابھی میں نہ جانے کتنی دیر تک ان کی حرکتوں
محظوظ ہوتی کہ ملازم نے کارڈلیس میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ دوسری طرف عاصم تھا
مخصوص پُرتکلف مگر اپنائیت بھرے انداز میں مجھے آج شام میں ہونے والی میٹنگ کی اطلاع
رہا تھا۔

"آفندی صاحب آ چکے ہیں، انہوں نے ہی میٹنگ کال کی ہے۔" وہ بتا رہا تھا۔

"پھر آپ پہنچ رہی ہیں شام کو؟" اس کے پوچھنے پر میں کسی خیال سے چونکی۔

"ہاں آؤں گی۔" میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا تھا اور پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے
کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

شام کو میں مقررہ وقت پر ہی "دارالاطفال" پہنچی تھی۔ اور اس وقت میٹنگ روم میں رضا اپنے
مخصوص لاابالی انداز میں "چیٹنگ" کے آزمودہ نسخے مجھے ازبر کروا رہا تھا۔ جب میٹنگ روم کا
دروازہ کھلا تھا اور پہلے جمشید آفندی اور اس کے بعد عاصم کا چہرہ نظر آیا تھا۔ اپنی نشست سنبھالتے
ہوئے اس نے بڑے سادہ سے لہجے میں سب لوگوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا تھا اور اس کے بعد آئندہ
چند دنوں میں ہونے والی تقریب کے متعلق بات شروع کی تھی۔ میں نے یونہی میز کی سطح سے نظریں
اٹھا کر سب کے چہروں کو دیکھنا شروع کیا۔ ہر کوئی بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ میں
نے بھی ان کی تقلید میں نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں اور دوسرے معنوں میں اجنبیت و
بیگانگی کے اس تاثر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جس سے کل مجھے سابقہ پڑا تھا۔ مگر اس وقت ایسا
کوئی تاثر مجھے دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ وہ اپنی بات میں پوری طرح محو و مگن تھا۔ میٹنگ ہال میں اس کی
آواز گونج رہی تھی اور باقی سب لوگ جیسے مٹی کے مادھو بنے اپنی نظریں اور سماعتیں اس پر گاڑے
بیٹھے تھے۔

'اس کی شخصیت میں کوئی ایسا سحر ہے ضرور جو دوسروں کو مبہوت کر دیتا ہے۔'

میں نے اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا۔ اور میں
اپنی انہی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسی وقت چونکی جب میٹنگ کے اختتام پر رحمہ نے مجھے ٹہوکا
دیا تھا۔ میٹنگ کے بعد ڈنر کا پروگرام تھا اور موڈ نہ ہونے کے باعث میں ضروری کام کا بہانہ کرتے
ہوئے اُٹھ گئی تھی۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے جرسی کی جیبیں ٹٹول کر چابی ڈھونڈنے کی کوشش
کی اور اس کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے اپنا شولڈر بیگ کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔

"اُفوہ، کہاں چلی گئی؟" میں نے چڑ کر بیگ کی ساری چیزیں اُلٹ دیں مگر چابی یہاں سے
بھی برآمد نہ ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر ادھر دیکھا جہاں سے میں آئی تھی اور اب وہاں اچھی خاصی
محفل جم چکی تھی۔ دوبارہ جا کر چابی کی تلاش میں سب کو ڈسٹرب کرنا مجھے بہت آکورڈ لگا تھا۔
میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ کچھ زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کوئی بھی سواری آسانی
سے مل سکتی تھی اس لئے میں یونہی گیٹ سے باہر آ گئی تھی۔ اس روڈ پہ کوئی خاص رش نہیں تھا۔

اِکا دُکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا سائیکل سوار بھی پاس سے گزر جاتا۔ آسمان پہ پورا چاند اس حد تک روشن اور قریب محسوس ہو رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ بادلوں سے انکھیلیاں کرتی سرد ہوا، کپکپاہٹ کے باوجود بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے آنکھوں کے پپوٹے ایک لمحے کے لئے بند کر کے ان کی ساری ٹھنڈک کو اپنے اندر جذب کیا اور ہاتھوں کی سرد پوروں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ تبھی کوئی پتھر پاؤں کی ٹھوکر کی زد میں آ کر میرے سامنے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں بے ساختہ سی ہنس دی تھی۔ اور پھر اس پتھر کو لگنے والی دوسری اور تیسری ٹھوکر شعوری تھی۔

میرے دل تُو ہے مسافر

زندگی اِک سفر ہے

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے ایک لمحے کو میرا دل چاہا، میں پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگوں اور اپنے اس خیال پہ میں خود ہی زور سے ہنس دی تھی۔

”لگتا ہے کسی دیوانی کی روح مجھ میں آسمائی ہے جو اس سرد اور جامد سناٹے سے پوری طرح محظوظ ہونا چاہتی ہے۔“ میں خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

تبھی پاس سے گزرتے سائیکل سوار نے غالباً میری بڑبڑاہٹ سن کر پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔

”اے بھائی! مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“ میں نے اسے پکارا۔ وہ کوئی نوعمر لڑکا تھا۔ میرے کہنے پر اس کی آنکھیں تحیر آمیز خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں اس کے چہرے پہ واضح بوکھلاہٹ مجھے نظر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے آگے کو جھک کر زور سے پاؤں پیڈل پر مارے اور چند لمحوں میں ہی یہ جا وہ جا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے زیادہ سردی میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ تبھی ایک گاڑی میرے بالکل نزدیک آ کر رکی تھی۔ اور ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ میں نے چونکا نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو دیکھا اور پھر کچھ لمحے سوچ میں پڑی

”آیئے مس شانزے!“ اس کے پکارنے پر میں نے دائیں بائیں دیکھا اور کسی سواری کو نہ پا کر میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

”آپ بعض اوقات بہت بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہیں مس شانزے!“ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے پوری سنجیدگی سے کہہ ڈالا تھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اس وقت یوں سڑک کے کنارے ٹہلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میری جگہ اگر کوئی غنڈہ

اوباش انسان ہوتا تو......؟“

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ سبز آنکھوں میں برہمی تھی اور لہجے میں غصے کی آمیزش۔ نہ جانے کیوں میں بے اختیار ہنس دی تھی۔

”کمال ہے آفندی صاحب! کہاں تو آپ ہمیں پہچان نہیں پائے تھے اور کہاں ہماری حفاظت کے لئے اتنا تردّد۔ بائے دا وے آفندی صاحب! آپ ہمیں دیکھ نہیں پائے تھے یا پھر دیکھ کر پہچان نہ سکے تھے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا مگر جواباً وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ ہونٹ بھینچے خاموشی سے اسٹیئرنگ گھماتا رہا تھا اور جب وہ بولا تھا تو لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

”بعض اوقات یوں ہوتا ہے مس شانزے ایمان! کہ لمحے انسان کی دسترس میں نہیں رہتے بلکہ انسان لمحوں کی دسترس میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کی ہر حرکت ان لمحوں کے تابع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ مجھے معلوم ہے، آپ میرے کل کے روّیے پر ناراض ہیں۔ اپنا نظرانداز کیا جانا آپ کو بے حد گراں گزرا ہوگا۔ مگر بس اتنا سمجھ لیجئے کہ اس وقت میں بھی کسی ایسے ہی لمحے کی زد میں تھا۔“

اس کا لہجہ بہت بکھرا ہوا تھا اور بے تحاشا جگمگاتی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کے لفظوں پر غور کرنے کے باوجود بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر اسے مضمحل سا دیکھ کر میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک خاموشی کی دیوار ہم دونوں کے مابین کھڑی رہی۔ اپنے اپنے خیالات میں ہم اس طرح غرق تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا کب گاڑی ”شانزے ولا“ کے سامنے جا رکی۔

”مس شانزے! چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔ خوش رہا کریں۔“

میں گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک سی گئی۔ میں نے یونہی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ پہ جمی تھیں۔ اس کے چہرے پہ ایک یاسیت بھری اُداسی تھی۔

”آفندی صاحب! آپ گھر نہیں چلیں گے؟“ میں نے اسے اپنی جگہ جمے دیکھ کر پوچھا تو وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکا تھا۔ نظروں کا زاویہ بدل کر اس نے ایک نظر پُرشکوہ ”شانزے ولا“ کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں اب چلوں گا۔“ اس کے کہنے پر میں گاڑی سے اُتر آئی تھی اور میرے دیکھتے ہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ مگر اس کے وجود سے پھوٹتی مخصوص مردانہ پرفیوم کی خوشبو نے بیڈ روم تک میرا پیچھا کیا تھا۔

”کتنی اپنائیت تھی اس شخص کے قرب میں۔“ میں نے بیڈ پر گرتے ہوئے سوچا۔

'نظریں ملیں تو لگتا ہے، ہم دونوں کے بیچ کبھی کوئی فاصلہ ہے ہی نہیں۔

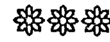
خاموش رہوں تو لگتا ہے یہ شخص زینہ بہ زینہ میری ذات میں اُترتا جا رہا ہے۔

بولنے لگوں تو لگتا ہے سب کچھ پہلے سے ہی جانتا ہے۔

ولایت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر ولی سے کم بھی نہیں۔ ویسا ہی پاکیزہ، کانچ کی طرح شفاف، فرشتوں کی طرح معصوم۔ اندر سے بھی ویسا ہی خوب صورت جیسا باہر سے، دوسروں کے آنسو مقدس موتیوں کی طرح اپنے دل کی سیپ میں بند کر لینے والا۔ مگر معلوم نہیں اپنی ذات میں کیسے اسرار لئے پھرتا ہے وہ۔ اور آج اس کے چہرے پہ کیسی حسرت تھی مگر صرف لمحہ بھر کے لئے۔ کبھی کبھار تو مجھے اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ نظر آتا ہے مگر وہ بھی گھڑی بھر میں معدوم ہو جاتا ہے۔ اور مجھے تو لگتا ہے، اس کی چٹان جیسی مضبوط شخصیت کے اندر ایک اور ہی جہاں آباد ہوگا، جس کے اندر جھانکنے کی جرأت آج تک کوئی کر ہی نہ سکا ہوگا۔'

اس رات میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور سونے سے ایک لمحہ قبل تک میرے آس پاس ایک ہی جملے کی گردان ہوتی رہی تھی کہ۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔ خوش رہا کریں۔"



بادلو! دھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اِک ردا بن کے بکھر جاؤ میری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے، ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، سیم وزر کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اِک کو بھی محسوس نہ ہو
ہمسفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر وسیم کی تقسیم کا یہ جرم، فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ اُتر آؤ میری دنیا پر

لیلیٰ سفید لباس میں کوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔ چہرے پہ حزن و ملال کا تاثر تھا اور جس میں نمی نے نظم کے حُسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ ہال میں سکوت سا چھا گیا تھا اور میں دونوں ہاتھ دعا کے سے انداز میں سینے پر رکھے گویا سانس روکے کھڑی تھی۔ بصارت سے محروم یہ پیاری سی لیلیٰ جب

حساس اور زود رنج بچی تھی اور اس نے کتنا کہا تھا۔

"آئی کانٹ ڈو اِٹ شان!" وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

"آئی ایم شیور لیلیٰ جانو! یو کین ڈو اِٹ۔" میں نے اسے پوری طرح تسلی دی تھی۔ اور اب اس نے اتنے خوب صورت انداز میں یہ نظم پڑھی تھی کہ جب وہ اس کے اختتام پر اسٹیج سے اُتری تھی تو ہال میں بہت دیر تک تالیوں کا شور رہا تھا۔ خود میرے ہاتھ تالیاں پیٹ پیٹ کر سرخ ہو گئے تھے۔

"ویلڈن لیلیٰ!" اس کے قریب آنے پر میں نے بے اختیار اس کا منہ چوم لیا تھا۔ لوگوں کے ستائشی کلمات پر جیسے میری ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں خود بھی کافی پریشان تھی۔ وہ پہلی مرتبہ اسٹیج پر گئی تھی۔ ایسی صورت میں اگر وہ کوئی گڑبڑ کر دیتی تو سارا امپریشن خراب ہو جاتا تھا۔

آج "دارالاطفال" کا سالانہ فنکشن تھا اور اس کی تیاری کے لئے ہم لوگوں نے دن رات ایک کر رکھا تھا۔ دیگر سماجی اداروں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ کچھ پریس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ سارا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بچے رنگ برنگے کپڑے پہنے تتلیوں کی مانند اِدھر سے اُدھر جھومتے پھر رہے تھے۔

لیلیٰ کی نظم سے اس تقریب کا اختتام ہو گیا تھا اور اب کچھ معززین اسٹیج پر آ کر ادارے کی اس کاوش کو سراہ رہے تھے۔ میری نظریں بے اختیار ہی اس شخص کو کھوجنے لگی تھیں جس کی بدولت یہ سب ممکن ہوا تھا اور پھر پہلی رو کی تیسری کرسی پر جا کر میری نظریں ٹھہر سی گئی تھیں۔ سیاہ پینٹ کوٹ میں اس کا وجیہہ و دلکش سراپا کس قدر نمایاں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ مکمل سنجیدگی طاری تھی اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت دھیان سے اس کے چہرے پہ خوشی کی وہ رمق تلاش کرنی چاہی جو آج کے اس کامیاب فنکشن کے اختتام پر ہونی چاہئے تھی۔ مگر وہاں اس خوشی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

'آخر کیوں؟' میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ اور جب عاصم نے الوداعی کلمات کے لئے اسے اسٹیج پر پکارا تھا تو وہ ایک دم چونک گیا تھا۔

'تو گویا ذہنی طور پر یہاں موجود ہی نہ تھا' میں نے اسے مضبوط قدموں سے ڈائس کی طرف جاتے دیکھا۔

اس کا سر کچھ لمحوں کے لئے جھکا رہا تھا، پھر اس نے ڈائس پہ دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے پورے ہال پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ اس کی مقناطیسی شخصیت کا سحر پورے ماحول کو پوری گرفت

میں لے رہا تھا۔ ہر طرف ایک گمبھیر سی خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے بہت شستہ لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا تو اسے سننے کے لئے میری دھڑکنیں تک تھم گئی تھیں۔

بچے بڑی محبت سے اپنے آفندی پاپا کو دیکھ رہے تھے اور باقی سب لوگ اس عظیم انسان کو اپنی توصیفی نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھے جس نے ان پھولوں کی آبیاری کے لئے دن رات کا فرق مٹا دیا تھا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ایک ٹک اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ پہلے سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اطمینان و سکون سے عاری تھا۔ اس کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی مگر میں اس کے الفاظ سن نہیں پا رہی تھی۔ میں تو اسے صرف دیکھ رہی تھی۔ آج بہت مضطرب تھا، بہت بے چین۔ مگر کیوں؟ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ مضطربانہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو بار بار کھول رہا تھا، بند کر رہا تھا۔ اس کے جاندار لہجے میں تھکن پنہاں تھی۔ اس کے چہرے کے تنے تنے مغرور نقوش میں کوئی دکھ اتر رہا تھا۔ اس کی جھیلوں جیسی آنکھوں میں سمندروں کی سی نمی تھی۔

اس کے عنابی ہونٹوں کو جیسے کبھی مسکراہٹ نے چھوا تک نہ تھا۔ اور ہونٹوں کے بالکل برابر سہما ہوا سیاہ تل۔

مجھے لگا میں اس شخص کے بہت قریب جا چکی ہوں اور شاید اس کے وجود کی گہرائیوں میں اتر جانے والی ہوں۔ اس کی چٹان جیسی شخصیت کی دراڑیں مجھ پر کھلنے والی ہیں۔ مگر عین اسی لمحے کسی نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔

"کہاں کھو گئی ہو؟ میں کب سے تمہیں بلا رہی ہوں۔" یہ شہزرینہ تھی۔ میں گہری سانس لے کر اس کی طرف پلٹی اور تب ہال سے باہر نکلتے لوگوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اب سے پہلے جو لمحے گزرے ہیں ان میں میرے اور اس شخص کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

سب مہمان ریفریشمنٹ کے لئے باہر جا چکے تھے اور ریفریشمنٹ کے دوران رضا کی حرکات اور زوار شاہ کے نپے تلے جملے بھی مجھے متاثر نہ کر سکے تھے۔ ذہنی رو بھٹک بھٹک کر اس تک جا رہی تھی جس کے سامنے کافی کا مگ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دیگر لوازمات سے بھری پلیٹ جوں کی توں پڑی تھی۔ تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ملازمین تمام چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ کافی کا آخری گھونٹ لے کر خالی مگ میز پر رکھ کر میں بے اختیار ہی اس طرف بڑھ گئی تھی۔

"آفندی صاحب!" میں نے انگلیوں سے ٹیبل بجاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکا تھا۔

"شانزے......!" اس نے سر اٹھا کر مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میرے ساتھ چلو گی؟" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کہاں؟" اور "کیوں؟" جیسے سوالات میرے لبوں پر آ کے دم توڑ گئے تھے۔ اثبات میں سر ہلا کر میں اس کے ساتھ چل دی تھی۔ وہ اس وقت کسی بچے کی طرح مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اور جب اس نے گاڑی قطعی ایک غیر معروف، انجان، ویران سڑک کی طرف موڑی تو آج کا سورج سڑک کے کنارے پر اپنی الوداعی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے اس خاموش اور ساکت وجود کو دیکھا۔

اس زرد شام کی تمام تر اُداسی ان آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہے۔

'کم از کم مجھے تو معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔' اس سنسان سڑک پر آ کے میں نے لمحہ بھر کے لئے سوچا تھا۔ گاڑی جو پہلے فل سپیڈ پر بھاگی جا رہی تھی، اب قدرے آہستہ ہو گئی تھی۔ اور پھر سڑک کے دائیں طرف جا کر رک گئی تھی۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ ارد گرد کوئی جگہ بھی تو ایسی نہ تھی جسے مطلوبہ مقام سمجھ کر گاڑی روک دی گئی تھی۔

"شانزے! تم نے کبھی مستان شاہ کو دیکھا ہے؟" آدھے گھنٹے کی اس مسافت میں وہ پہلی بار گویا ہوا تھا۔

"مستان شاہ۔" میں نے زیر لب نام دہرایا۔

میں نے یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا تھا اس لئے دیکھنے یا ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہاں، کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ اسے صرف میں نے دیکھا ہے۔ صرف میں ملا ہوں اس سے۔ اور شانزے! میں تو اب بھی ہر روز اس سے ملتا ہوں۔ اس صدیوں پرانے درخت کے نیچے۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بول رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اس درخت کو دیکھا۔ انتہائی قدیم ترین درخت تھا اور اس قدر گھنا کہ اس کے آس پاس کی زمین پر سورج کی کوئی کرن بھی نظر نہ آ رہی تھی۔

"میں اس سے ملنے ہر روز یہاں تک آتا ہوں اور معلوم ہے اگر میں نہ آ سکوں تو پھر وہ مجھ سے ملنے چلا آتا ہے خواہ اس وقت میں کہیں بھی ہوں۔ اس ملک سے باہر ہوں یا اس خطے سے، دن ہو یا رات، میں سو رہا ہوں یا کام میں مشغول۔ وہ خود بخود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ لوگ کہتے ہیں آج سے اٹھائیس سال قبل وہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے مر گیا تھا۔ اسی صدیوں پرانے

درخت کے نیچے۔''

میں نے حیرت سے اچھل کر اسے دیکھا۔ کیسی عجیب بات کہہ رہا تھا وہ۔

''اور مجھے تو اس کے گھنگھروؤں تک کی آواز سنائی دیتی ہے اس کے آنے سے پہلے اور اس کے جانے کے بعد بھی، پھر لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مستان شاہ اٹھائیس سال پہلے مر چکا ہے۔'' اس نے نڈھال ہو کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شکستگی تھی۔ ''اور میں تو اسے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔'' وہ مجھ سے زیادہ خود سے مخاطب تھا۔ ''اس کے گھنگھروؤں کی آواز مجھے بخوبی سنائی دے رہی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو نا شائزے! وہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اور ان کی جڑوں میں گھاس اتنی لمبی اُگی ہوئی تھی کہ ایک انسان اپنے پورے قد کے ساتھ اس میں سما سکتا تھا۔ عین سامنے یہ پتلی سی سڑک بہت دور تک جا کر درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ریل کی پٹڑی...... میں نے الجھ کر اس کی سمت دیکھا مگر وہ تو شاید بند آنکھوں سمیت سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

''وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا ہے...... اس کے لمبے بال لٹوں کی صورت اس کے گلے میں جھول رہے ہیں۔ اس کے لبادے پر رنگ برنگے پیوند ہیں اور پاؤں میں بھاری گھنگھرو۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہے جسے وہ متواتر زمین پر مارتا چلا آ رہا ہے۔ اور تم دیکھ رہی ہو اس کے پیچھے ایک بچہ چلا آ رہا ہے، بمشکل سات آٹھ سال کا بچہ۔ پٹڑی کے آس پاس بکھرے پتھر اس کے ننگے پاؤں میں مسلسل چبھ رہے ہیں۔ وہ بھاگ بھاگ کر مستان شاہ کے بڑے بڑے اُٹھتے قدموں کا ساتھ دینے میں ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ اور اب وہ لوگ درختوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر مڑ رہے ہیں۔''

میں حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کو تھی۔ وہ خود میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے پکارنے تک کی ہمت نہ کر سکی تھی۔

''اب وہ لوگ پگڈنڈی کے خاتمے پر اس سڑک کے کنارے نمودار ہو رہے ہیں۔ مستان شاہ کے قدموں میں تیزی آ گئی ہے۔ اب وہ اس صدیوں پرانے درخت کے نیچے بنے چبوترے پر کھڑا ہے۔ اس کے پاؤں ایک مخصوص تال سے زمین پر پڑ رہے ہیں۔ وہ گول گول گھوم رہا ہے اور ایک لے میں گا رہا ہے۔

نا الکھ جگا سنسار میں جب ماں کی کوکھ ہٹی

نا پستک کھولی باپ نے جب میری ناف کٹی
نا عمل کیا رمال نے نا دھن خیرات بٹی
نا بڑوں نے منتر تان کے کوئی پاک زبان رٹی
میں آپ ہوں اپنا زائچہ، میں آپ ستارا ہوں
میں آپ سمندر ذات کا، میں آپ کنارا ہوں''

میں ششدر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس شخص کو جھنجوڑ ڈالوں یا خود یہاں سے بھاگ نکلوں۔ پُراسرار ماحول اور اس کا ناقابل فہم رویہ مجھے بری طرح خوف زدہ کر رہا تھا۔ مگر وہ تو جیسے آپ میں ہی نہیں تھا۔ رواں لہجے میں وہ آنکھیں بند کئے کہے جا رہا تھا۔

''او دھرتی کھول ہتھیلیاں، میں پاؤں سے کھینچوں ریکھ
میرے کٹے پھٹے پاپوش ہیں پر نقش نگاری دیکھ
میں کنڈلی ہوں تاریخ کی، میں جنم جنم کا لیکھ
میں بانجھ زمیں کا سنبلہ، میں زرد رُتوں کا میکھ
اِک خیرہ خیرہ روشنی میری چھاؤں میں ہوتی ہے
یہ دنیا جس کا نام ہے، میرے پاؤں میں ہوتی ہے

اور دیکھو، وہ کوئی تھکا ہارا مسافر چلا آ رہا ہے۔ وہ مستان شاہ کے ہونٹوں سے ادا ہوتے لفظوں پر جھوم رہا ہے۔ اور اب اس نے اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا تھا۔ اس کی جیب کا واحد، آخری نوٹ۔ مستان شاہ کے پاس کھڑے بچے کے ہاتھ میں ایک کشکول ہے اور وہ نوٹ اس کشکول میں منتقل ہو چکا ہے۔ بچے کی آنکھ جھک گئی ہے اور ماتھے پہ پسینے کے چند قطرے ہیں۔ مستان شاہ کی دھیمی پڑتی تان، پچاس کا نوٹ دیکھ کر پھر سے بلند ہونے لگی ہے۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش سے گھوم رہا ہے۔ اس کے قدموں کی دھمک سے زمین بھی لرزنے لگی ہے۔ گھنگھروؤں کی آواز پر اس ویرانے کی ہر چیز جھومنے لگی ہے۔

او مانگ بھری میری کامنی! میرے ساتھ جوانی چکھ
یہ جگ تیری جاگیر ہے، تُو کھل کے پاؤں رکھ
اس ورق ورق سنسار کو تو کھول پھرول پرکھ
رہیں سدا یہ دشت نوردیاں ہے جیون نقش الکھ
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں آ ہوا ہتھیلی پر
آ اسم سم پھونک دیں اس جنم پہیلی پر

آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں ، آ ہوا ہتھیلی پر
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں ، آ ہوا ہتھیلی پر
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں ، آ ہوا ہتھیلی پر''

اس جملے کی تکرار ہونے لگی تھی اور مجھے یہ آواز اپنے چہار جانب سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سانس روکے اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھی۔ میری آنکھ گویا پتھرا گئی تھی۔ عجب عالم بے یقینی تھا۔ میں پوری پوری اس شخص کی طرف گھوم گئی تھی جو عالمِ بے خودی میں ایک ہی جملے کی تکرار کئے جا رہا تھا۔

''آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں ، آ ہوا ہتھیلی پر''

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر اس سختی سے جمے ہوئے تھے کہ سبز رگیں ہاتھوں سے باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ چہرے پہ عجیب وحشت طاری تھی اور تنفس تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس سردی میں چہرے پہ پسینہ بہہ رہا تھا اور کنپٹی کی رگیں تن کر اُبھر آئی تھیں۔ اس کی از حد خراب حالت پر میں نے متوحش ہو کر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''آفندی صاحب! کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

میرے ایک دم جھنجوڑنے پر اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ یوں متحیر و متعجب مجھ پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا کہ میں گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''آر یو آل رائٹ آفندی صاحب؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا اور اس کے بازو پہ رکھا ہاتھ آہستگی سے ہٹا لیا۔ درحقیقت اس کی کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ ابھی تک بے یقینی سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا وہ میرے وجود سے بالکل بے خبر تھا اور اتنی دیر سے وہ مجھ سے نہیں، خود سے مخاطب تھا۔ اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور گاڑی کی چھت پہ بازو رکھ کر اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

میں نے اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

'کیا ہوا ہے؟

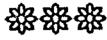
ابھی جو آفندی صاحب نے کہا تھا، وہ کیا ہے؟

اور مستان شاہ کون ہے؟'

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پر ختم، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن جیسے خلا میں قلابازیاں لگا رہا تھا۔ نہ جانے کتنے لمحے یونہی بیت گئے تھے۔

تب گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر میں نے سر اٹھایا۔ اس نے موڑ کاٹ کر گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے کی غایت درجہ سرد مہری نے مجھے کچھ نہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے گویا کبھی جدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ میں لاشعوری طور پر اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اندر ہی اندر اُلجھتی رہی تھی، اور اسی اُلجھن، پریشانی و تفکر میں مجھے معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ کب گاڑی ان ویران راستوں سے نکل کر شہر کی ہنگامہ خیز سڑکوں پر دوڑنے لگی تھی۔ اور جب ''شانزے ولا'' کے سامنے گاڑی کے پہیئے چرچرائے تب میں بری طرح چونک گئی تھی۔

دروازہ کھولتے ہوئے میں نے مڑ کر ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا۔ وہ رُخ موڑے کھڑکی کے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں اسی خاموشی سے گاڑی سے اتر آئی تھی اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔



صبح میری آنکھ کھلی تو ملگجا سا اُجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی کسلمندی سے بازوؤں میں سر دیئے لیٹی رہی۔ رات بھر عجیب و غریب چہرے خواب میں آ آ کر مجھے ڈراتے رہے تھے۔ کبھی غنودگی میں گھنگھروؤں کی آواز سنائی دیتی اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی۔ پھر ذرا نیند کا غلبہ ہوتا تو چہار جانب سے ایک ہی لے میں مختلف آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

او مانگ بھری میری کامنی
آ پاؤں پہ مٹی باندھ لیں
آ ہوا ہتھیلی پر

اور نہ جانے کون کون سے فقرے مستقل مجھے ڈسٹرب کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت سر میں شدید درد ہونے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھی بھری ہوئی تھی۔ بھاری پپوٹوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے میں نے وقت دیکھا اور پھر انٹر کام پر ملازمہ کو چائے لانے کی ہدایت کرتے ہوئے میں بستر سے اٹھ گئی تھی۔

بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے میں گلاس ونڈو تک آئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ رات بھر کھڑکیوں پہ ہونے والی دستک جو مجھے خوف زدہ کرتی رہی، وہ دراصل یہ اس بارش کی شرارت تھی جو اس وقت بھی بہت باریک اور نرم پھوار کی صورت زمین پہ گر رہی تھی۔ آسمان پہ گھرے سیاہ بادلوں نے جانے کب قبضہ جمایا تھا اور اب بڑی مستقل مزاجی سے روشنی کے دیوتا کو پابند کیے ہوئے تھے کہ آٹھ بجنے کے باوجود بھرپور اُجالا نظروں سے اوجھل تھا۔

میں دروازہ کھول کر ٹیرس پہ چلی آئی۔ خنک ہوا نے بڑی دیدہ دلیری سے مجھے اپنی بانہوں

میں قید کرلیا تھا۔ ماحول کی ہر چیز اس وقت ایک عجیب سے سکوت میں ڈھکی ہوئی تھی۔ کن من کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ چشم برگ سے بارش کے قطرے صورت ٹوٹ کر گرتے تو سبز گھاس بڑے شوق سے اس قطرۂ آب کو اپنی زلفوں میں نے ذرا سا آگے کو جھک کر دیکھا، اردگرد کے گھروں میں بھی ہر روز کی چہل پہل نہ تھی۔ جاتے موسم نے پلٹ کر ایک مرتبہ پھر لوگوں کو ان کے گھروں میں قید کر دیا تھا۔

تبھی ایک سفید گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے یونہی ٹیرس کی گرل پہ گاڑی کے اندر بیٹھے شخص کو دیکھنا چاہا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں گئی تھی اور اندر سے برآمد ہونے شخص یقیناً ولید احتشام ہی تھا۔ پورچ سے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا تھا اور اس قدر اچانک اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا کہ میں بے خیالی میں اس پر نظریں ہٹا بھی نہ سکی تھی۔

اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بڑے اسٹائل سے ہاتھ ہلا کر غالباً ہیلو کہا تھا اور پھر نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں سر جھٹک کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ چائے پی کر ذہن کچھ سوچنے قابل ہوا تو کل شام کا واقعہ ایک بار پھر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری آنکھوں میں گھوم گیا اور رات بھر میں سینکڑوں مرتبہ سوچے گئے سوال ایک مرتبہ پھر شعور کی سطح پر نوکیلے کانٹوں کی طرح اُگنے لگے تھے۔

'آخر ایسی کون سی بات تھی جو پتھریلے اعصاب کے مالک جمشید آفندی کو اس حد تک متاثر کر گئی تھی۔' اس کی غیر حالت میرے لئے باعثِ تعجب تھی۔

'اور وہ مستان شاہ کون تھا؟ اور یہ بات بذاتِ خود کتنی عجیب ہے کہ مستان شاہ اٹھائیس سال قبل مر چکا ہے اور آفندی کہتا ہے کہ وہ آج بھی اس سے ملنے کے لئے آتا ہے..... یا خدا.....'

میں بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔

سالانہ تقریب کے بعد "دارالاطفال" دو روز کے لئے بند رہنا تھا۔ اس لئے دو دن انتظار کوفت مجھے مجبوراً اُٹھانی پڑی تھی۔ اور جب تیسرے روز وہاں پہنچنے پر عاصم کی زبانی مجھے یہ ہوا تھا کہ وہ اپنا بزنس ٹور ادھورا چھوڑ کر صرف تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے اور پھر شام دوبارہ امریکہ روانہ ہو گئے تھے تو میں نے ایک طویل سانس لے کر اس پر سے نظریں ہٹا درختوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا جو اس وقت بالکل گم صم کھڑے تھے۔ ایسی ہی کوئی اداسی مجھے اپنے وجود پہ گرتی محسوس ہو رہی تھی۔ تب میں چپ چاپ واپس گھر لوٹ آئی تھی جہاں کڑے تیوروں کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔

"حد ہوتی ہے یار بے وقوفی کی بھی۔ یہ کوئی موسم ہے گھر سے باہر نکلنے کا؟ اور پھر سیر و تفریح کے لئے تو وقت ہے ہی نہیں۔ کچھ معلوم ہے، ڈیٹ شیٹ آ چکی ہے۔" اس نے اپنی دانست میں مجھے ڈرانا چاہا تھا مگر میں اپنی سوچوں میں گم اسے تمام نوٹس اور کتابیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"بہت ڈھیل دے چکی ہوں میں تمہیں۔ مگر اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" اس نے کسی سخت گیر استاد کی طرح مجھے گھورتے ہوئے اُٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بغیر کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ چل دی تھی۔ اور پھر نہ صرف ایگزام شروع ہونے سے پہلے بلکہ بعد میں بھی میری اس طرح سے مدد کی تھی کہ بسا اوقات میں خود سے شرمندہ ہو جایا کرتی تھی۔ اپنا پیپر وہ ہمیشہ وقت سے پہلے مکمل کر لیا کرتی تھی۔ اور پھر سب سے نظر بچا کر وہ بغیر میری مزاحمت کا نوٹس لئے میری شیٹ اپنے قبضے میں لے کر بڑی روانی سے وہ سوال حل کیا کرتی تھی جو میں نہ کر سکتی تھی۔

بچپن سے ایک ساتھ قلم پکڑنا اور ایک ساتھ لکھنا سیکھا تھا۔ سو رائٹنگ میں اُنیس بیس کا ہی فرق تھا۔

آخری پیپر والے دن جب میں لمبی تان کر سونے اور ونیزہ، حماد کے ساتھ آؤٹنگ پر جانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی کہ اتنے روز سے اس نے حماد کو صاف منع کر دیا تھا کہ وہ فون کرنے گھر اور خواب میں آنے کی زحمت نہ کرے۔ تبھی داور انکل نے آفس سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ جرمنی جانے کے لئے ونیزہ کی کل کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے اور یہ خبر پا کر ونیزہ بے چارگی سے مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے تایا مستقل طور پر جرمنی میں مقیم تھے اور ایک عرصے سے ونیزہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے جو ونیزہ نے اب آ کر قبول تو کر لی تھی مگر اتنی جلدی جانے پر رضامند بھی نہ تھی۔

بہرحال اب اپنے اپنے پروگرام ملتوی کرتے ہوئے ہم نے وہ دن شاپنگ میں گزارا اور رات پیکنگ کرتے ہوئے اور پھر اس کی ڈھیروں نصیحتیں سمیٹتے ہوئے میں اس وقت ایئرپورٹ سے باہر نکلی تھی جب پی آئی اے کا مسافر بردار طیارہ آسمان کی وسعتوں میں ایک نقطے کی شکل میں معدوم ہو گیا تھا۔ انکل داور اور پھپھو کو خدا حافظ کہہ کر میں گھر کی طرف روانہ ہوئی تو تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے بیڈروم کے لئے بے طرح اُداس ہوں۔ پیپرز کے دوران سونے کا وقت کہاں ملتا تھا۔ سو اب بھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ گرم پانی سے شاور لے کر اس وقت تک سوتی رہوں گی جب تک جاگنے کی شدید خواہش نہ ہو گی۔ اور اس کے بعد۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا اور وہ اپنے پورے قد سمیت میرے سامنے آ کھڑا ہوا

تھا۔ تب مجھے یاد آیا۔ چند روز قبل عاصم نے فون پر گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ وہ ایک دو روز میں وطن لوٹنے والا ہے۔ اور فون پر ہونے والی بات چیت کے بعد ہی ونیزہ نے سرسری انداز میں مجھ سے جمشید آفندی کے متعلق پوچھا تھا۔ کچھ لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد میں نے کہا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میں اس شخص کو لفظوں میں ڈھال سکتی ہوں۔ اس سے متعارف ہونے کے لئے تمہیں خود اس سے ملنا ہوگا۔''

''رئیلی، کیا ایسی ہی سپر چیز ہے وہ؟'' ونیزہ نے حد درجہ حیرت سے پوچھا تھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''یس، ہی از اونلی ون۔''

''اوہ...... تمہارے مزاج کی یہ تبدیلی اسی کی مرہون منت تو نہیں؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا تھا۔

''ہاں یہ درست ہے کہ زندگی گزارنے کا ڈھنگ میں نے اسی سے سیکھا ہے۔ اور اگر سر راہ وہ مجھے نہ مل جاتا تو شاید میں ان گرد آلود راستوں میں اپنا آپ کھو چکی ہوتی۔'' اور میں نے دیکھا تھا کہ ونیزہ نے بہت عجیب سے انداز میں مجھے دیکھ کر اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اور تب میں نے اسے پکار کر کہا تھا۔

''سنو! اسے کوئی محبت وجبت کا چکر مت سمجھ لینا۔ وہ ایک مسیحا ہے اور مسیحا سے محبت نہیں، عقیدت کی جاتی ہے۔''

گیٹ کھولتے ہوئے چوکیدار نے اس زوردار طریقے سے سلام جھاڑا تھا کہ میں یکلخت ہی اپنے خیالات سے نکل آئی تھی۔

'تو گویا دوسرا اہم ترین کام ''دارالاطفال'' میں حاضری کا ہے۔' میں دل ہی دل میں سوچتے ہوئے بھرپور نیند کی خواہش لئے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھی تھی۔ مگر پاپا کے لاکڈ بیڈ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک گئی تھی۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد سے اس کمرے کی چابی میرے پاس تھی۔ اور اس تمام عرصے میں میرے سوا کبھی کوئی اس بیڈ روم میں نہیں جاتا تھا۔ بلکہ میں نے کسی کو اتنی اجازت دی ہی نہیں تھی۔ مگر اب اندر سے آتی آوازوں اور اٹھا پٹخ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کمرے کو نہ صرف کھول دیا گیا ہے بلکہ اندر ایک سے زیادہ افراد موجود بھی ہیں۔

حیران ہوتے ہوئے میں چند قدم پیچھے پلٹ کر آئی تھی اور دروازہ کھولنے کے بعد میں نے کمرے کی جو حالت دیکھی تھی، اس نے چند لمحوں کے لئے ساکت کر دیا تھا۔ عجیب بے ترتیبی کا پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی پاپا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر

جو ''خوش آمدید'' کہتے ہوئے محسوس ہوا کرتی تھی، اس وقت اپنے مخصوص مقام سے غائب تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل تمام چیزوں سے عاری تھا۔ حتیٰ کی خالی درازیں یونہی کھلی پڑی تھیں۔ ٹیبل لیمپ آڑا ترچھا زمین پہ گرا ہوا تھا۔ پاپا کے تمام ملبوسات بیڈ پر ڈھیر کر دیئے گئے تھے اور ملازم وارڈروب کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ششدر سی اپنی جگہ کھڑی کمرے کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی ایک ملازم کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''شانزے بی بی! آپ۔'' اس کے لہجے اور چہرے پر اتنی حیرت تھی کہ جیسے میرا یہاں آنا ان کے لئے انتہائی غیر متوقع ہو۔ یقیناً انہیں میری غیر موجودگی میں یہ سب کرنے کا حکم دیا گیا ہوگا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے خادم حسین؟'' میں شدید دکھ کے عالم میں بولی تھی۔

''بڑی بیگم صاحبہ کا حکم ہے جی کہ یہ کمرہ خالی کر دیں اور چیزیں سٹور روم میں رکھوا دیں۔'' اس نے سر جھکا کر آہستگی سے بتایا تھا۔

''کیا؟...... دماغ خراب ہو گیا ہے تمہاری بیگم صاحبہ کا؟ اور...... اور تم لوگ یہ سب چیزیں سٹور روم میں رکھنے جا رہے تھے؟'' شدید غم و غصے سے میری حالت ابتر ہو گئی تھی۔

''ہم تو ایسا نہیں چاہتے تھے بی بی! مگر بڑی بیگم کا حکم تھا، اس لئے۔''

''شٹ اپ خادم حسین! جہنم میں گئیں تمہاری بیگم صاحبہ اور بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔ آخر تم لوگوں کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ بھی لگاؤ۔ اتنا ارزاں سمجھا ہے تم لوگوں نے ان چیزوں کو کہ انہیں سٹور روم میں رکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔'' میرے جسم میں دوڑتے خون کی گردش بے حد تیز ہو گئی تھی۔

''نن...... نہیں جی۔'' ملازم نے بے حد گھبرا کر وضاحت کرنی چاہی تھی۔

''شٹ اپ خادم حسین! اینڈ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔'' میں دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر پوری قوت سے چیخی تھی اور وہ دونوں ملازم میری حالت کے پیش نظر فوراً سے پیشتر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔

''آئندہ اگر کسی نے اس کمرے میں قدم بھی رکھا تو یاد رکھو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ خبردار اگر آج کے بعد تمہارے ناپاک ہاتھوں نے اس کمرے کی کسی چیز کو چھونے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گی۔ کیا سمجھا ہے تم لوگوں نے، یوں ایمان حسن کو دربدر کر دو گے؟ اس کی ہر نشانی کو مٹا دو گے؟ مگر ابھی میں زندہ ہوں۔ شانزے ایمان کے جیتے جی تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں ان کے پیچھے دھاڑی تھی۔ کوئی سرخ رنگ کی آگ تھی، جس نے سر سے پاؤں تک مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جسم کا سارا خون جیسے کنپٹیوں میں جمع ہو کر دھڑک رہا تھا اور میرا بس نہیں

چل رہا تھا کہ میں کیا کر ڈالوں۔ کچھ لمحوں بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ میں کمرے میں تنہا کھڑی [illegible]
رہی ہوں۔ ملازم نہ جانے کب کے وہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ تب میں نے کمرے کو ایک [illegible]
دوبارہ دیکھا۔ شدید غصے میں میری سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے [illegible]
دھند تھی کہ کمرے کا منظر بھی مجھ پہ واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں یونہی کمرے کا دروازہ بند کر کے
نکلی اور قریبی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ میرا دل اس وقت جیسے سلگ رہا [illegible]
'یہ عورت پاپا کا ایک ایک نقش مٹا دینا چاہتی ہے۔ مگر میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گی [illegible]
میرے خون میں ایک بار پھر اُبال آنے لگا تھا۔

''ہیلو شانزے ڈارلنگ!'' وہی کانوں میں گھستی ہوئی شاطر آواز میرے عقب میں اُبھری [illegible]
اور میں نے لاشعوری طور پر دونوں جبڑے سختی سے ایک دوسرے پہ جما دیئے تھے۔

دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اوپر اٹھا کر میں ابھی انہیں پلٹ کر دیکھ بھی نہ پائی تھی جب [illegible]
پیچھے سے ہی دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر جما کر جھکی تھیں اور اپنے چہرے پہ ان کے ہونٹوں کا [illegible]
محسوس کرنے سے پہلے ہی میں تڑپ کر ان کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔ ان کا چہرہ ایک [illegible]
خفت سے سرخ ہو گیا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے شانزے؟'' انہوں نے غصے و ناراضگی سے مجھے گھورتے ہوئے کہا [illegible]
میں اپنے تیز ہوتے تنفس کے ساتھ بغیر کچھ کہے آگے بڑھی تھی اور ایک جھٹکے سے بیڈروم کا [illegible]
چوپٹ کھول دیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میرے لہجے و انداز پر وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑائی تھیں مگر جلد [illegible]
انہوں نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

''ہاں، وہ میری ایک فرینڈ آ رہی ہے۔ یہ کمرہ اس کے لئے سیٹ کرنا ہے۔'' نظریں [illegible]
ہوئے انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

''بیسیوں کمرے خالی پڑے ہیں اس محل نما کوٹھی میں۔ پھر یہی کمرہ کیوں؟'' میں اپنی [illegible]
آنکھوں سمیت ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''اور کیا آپ نہیں جانتی تھیں کہ یہ کمرہ [illegible]
کمرے کی ہر چیز مجھے کس قدر عزیز ہے۔'' میرا لہجہ حد درجہ تلخ تھا اور آنکھوں میں اس عورت [illegible]
لئے تنفر ہی تنفر تھا۔ میرا یہ بھرا ہوا انداز ان کے لئے نیا ہی نہیں، نا قابلِ قبول بھی تھا۔

''ڈونٹ بی سلی شانزے! تمہیں خوامخواہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ان کا لہجہ [illegible]

''ایک شخص اگر اس دنیا میں موجود ہی نہیں تو اس کی چیزیں سینت سینت کر رکھنے سے [illegible]
حاصل؟ اور تم یہ حقیقت کیوں تسلیم نہیں کر لیتی ہو کہ تمہارا باپ مر چکا ہے اور اس کی [illegible]

کپڑے، سامان محض کاٹھ کباڑ......''

''اسٹاپ اٹ......'' میرے صبر کا پیمانہ جیسے ایک دم چھلک گیا تھا۔ ''جھوٹ ہے یہ۔ سفید
جھوٹ ہے کہ میرا باپ مر گیا ہے۔ صرف میں ہی نہیں، آپ بھی جانتی ہیں کہ میرا باپ مرا نہیں بلکہ
اسے......''

''شٹ اپ شانزے!......آئی سے جسٹ شٹ اپ۔'' وہ اس قدر زور سے دھاڑی تھیں
کہ میرے الفاظ اس شور میں کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جیسے ایک دم خون اُتر آیا
تھا۔ چہرہ ایک لمحے کے لئے زرد ہوا تھا اور پھر جیسے ان کے جسم کا سارا خون ان کے چہرے پہ جمع ہو
گیا تھا۔

''اس کے بعد اگر تم ایک لفظ بھی بولیں شانزے! تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ
انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں میری طرف بڑھی تھیں۔

''سچ سننے کا حوصلہ نہیں اور مار دینے کی دھمکی دے رہی ہیں۔ کتنا آسان ہے آپ کے لئے
ایک جیتے جاگتے انسان......'' میں نے زہرخند لہجے میں کہنا چاہا تھا مگر انہوں نے وحشی انداز میں
میری بات کاٹ دی تھی۔

''شانزے! ڈونٹ میک می لوز مائی ٹیمپر۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کروں گی۔''

''برداشت کی حد تو میری ختم ہوئی ہے محترمہ! جو بات آپ میری زبان سے نہیں سن پا رہیں،
کل وہ آپ کو ساری دنیا سے سننی پڑے گی۔'' نہ جانے کب کا رُکا ہوا لاوا نکلا تھا جو سوچنے سمجھنے کی ہر
صلاحیت کو سلب کر کے ایک عجیب وحشت دل و دماغ پہ پھیلا گیا تھا۔

''تت......تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی شانزے!'' وہ عجیب ہسٹریائی انداز میں میری طرف
بڑھ رہی تھیں۔

''میں سب کو بتاؤں گی......ایک ایک کو بتاؤں گی کہ......'' میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا تھا کہ
ان کا پوری قوت سے مارا گیا تھپڑ میرے حواس مختل کر گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کر عقب میں دیوار کے
ساتھ جا لگی تھی۔ وہ کسی وحشی شیرنی کی طرح مجھ پر پل پڑی تھیں۔ میں اپنی جگہ سن سی ہو کر اس ویل
ایجوکیٹڈ، ویل مینرڈ، ایک کامیاب سوشل وومن کو ایک دیہاتی، لڑاکا عورت کے روپ میں بدلتے
دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے دونوں بازو دبوچے کف اُڑاتے، سیاہ پڑتے چہرے کے ساتھ چیخ چیخ کر
مجھے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کے اس روپ کو دیکھ رہی تھی
جو بچپن سے آج تک میری نظروں سے اوجھل رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کوئی حیرت بھری آواز نزدیک سے اُبھری تھی۔ ''فصیحہ! کیا کر رہی ہو؟

"چھوڑ و اسے۔ آر یو کریزی؟" اعتشام احمد نے ایک جھٹکے سے انہیں مجھ سے دور کیا تھا۔ مگر وہ اس وقت آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔

"چھوڑ دو مجھے اعتشام! آئی وِل کِل ہر۔" ان کی ہسٹریائی کیفیت نے اعتشام احمد کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"اعتشام صاحب! کرنے دیجیے انہیں جو یہ کرنا چاہتی ہیں۔ ہر مجرم سزا سے بچنے کے لیے جرم کا ہر ثبوت ختم کر دینا چاہتا ہے۔ انہیں بھی یہ کام کرنے دیں۔" میں نے بے خوف و خطر لہجے میں نفرت سے کہا تھا۔

"میں کہتی ہوں تم اپنی بکواس بند کرو۔" وہ پوری قوت سے دھاڑی تھی اور اعتشام احمد کی گرفت سے آزاد ہو کر مجھ پہ جھپٹی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پہ بازو رکھ کر اپنا بچاؤ نہ کیا ہوتا تو شاید ان کے لمبے ناخن میرے چہرے کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیتے۔

"فصیحہ! پاگل ہوئی ہو تم۔" اعتشام احمد نے اس دفعہ انہیں بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اور صوفے پہ گرا دیا تھا۔

"تم نہیں جانتے اعتشام! یہ میری بیٹی ہونے کے باوجود مجھے دنیا کی نظروں میں ذلیل کرانا چاہتی ہے۔ یہ میرے لئے دردِ سر بنتی جا رہی ہے۔ پہلے اس ایمان حسن نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اب اُس کی زبان اس کے منہ میں آ گئی ہے۔ وہ کمینہ، ذلیل شخص خود تو مر گیا مگر اپنا عذاب کو مستقل میرے سر ڈال گیا ہے۔"

"فصیحہ! ہوش میں آؤ۔ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ایک مرے ہوئے انسان کے بارے میں اس طرح کہنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔" اعتشام احمد ایک غیر انسان ہوتے ہوئے اس بات کو برداشت نہ کر سکا تو میں ایک بیٹی ہونے کے ناطے یہ سب کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دوں جس کی کوکھ سے جنم لینا میرے لئے شرمندگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر وہ تو جیسے خود پر اختیار کھو کر مغلظات پہ اُتر آئی تھیں۔ جو میرے لئے برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اعتشام احمد انہیں قابو نہ کر پا رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھی تھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

"شانزے بیٹا! رکو۔" اعتشام احمد میرے پیچھے لپکے تھے اور میں راستے میں لگنے والی ٹھوکر اور چھلے ہوئے انگوٹھے کی پروا کئے بغیر بھاگتی چلی گئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر طوفانی انداز میں گھر سے نکلنے کے بعد میں نے کتنا چاہا تھا کہ گاڑی کسی ہیوی ٹرک سے ٹکرا جائے یا کسی پول سے۔ مگر اپنی کوئی دانستہ کوشش بھی مجھے کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکی تھی۔ سمتوں کے تعین کا اندازہ و ارادہ کئے بغیر

گاڑی فل اسپیڈ پہ دوڑاتے ہوئے میں نے اندر کی ساری وحشت ان سڑکوں کو روندتے ہوئے نکالنی چاہی تھی۔ مگر کتنا وقت بیت گیا تھا۔ تبھی گاڑی ہلکے ہلکے جھٹکے کھاتے ہوئے رک گئی تھی۔ کیا ہوتا اگر آج اس وجود کے پرخچے اُڑ گئے ہوتے اور سانس کی ڈور ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی ہوتی۔ میں نے تھک کر اسٹیئرنگ پہ سر گرا دیا تھا۔ تنے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ بند آنکھوں سمیت کتنے ہی لمحے یوں چپکے سے گزر گئے تو میں نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔

آسمان کے کناروں پر سرمئی شام اپنا ڈیرہ جما رہی تھی۔ گاڑی میں سے پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنے منجمد وجود کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے باہر نکلی تھی۔ جس طرح انتہائی زوردار زلزلے کے بعد کوئی زمین یکلخت ساکت ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح کا سکوت میرے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے اطراف میں ڈالی۔ سارا ماحول مکمل اجنبی تھا۔ میں نے یونہی سر جھکا کر واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک گاڑی میرے برابر آ رکی تھی۔

"ایکسکیوزمی مس! وہ پیچھے جو گاڑی کھڑی ہے، آپ کی ہے؟" سوزوکی کار میں بیٹھے آدمی نے پوچھا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ یہاں دور دور تک آپ کو سواری نہیں ملے گی۔"

میں نے مرے مرے قدم روک کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ چور اچکا، لٹیرا، کوئی بھی اوباش انسان۔ مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ چند قدم پیدل چلنا بھی میرے لئے دشوار تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ نے؟" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد آدمی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے اپنے سوئے سوئے ذہن پہ پورا زور دیتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی تھی۔

"دارالاطفال۔" ایک اسی جگہ کا خیال آیا تھا سو میں نے اسے ایڈریس بتا دیا تھا۔ وہ نہ جانے کن کن راستوں سے ہوتا ہوا دارالاطفال تک آیا تھا، میں نے دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی یا پھر شاید میں اس پوزیشن میں نہیں تھی۔

"اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" وہ یقیناً کوئی بھلا آدمی تھا جو مطلوبہ مقام پر گاڑی روکتے ہوئے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ شاید اس نے میری غیر معمولی کیفیت کو نوٹ کر لیا تھا۔ میں نفی میں سر ہلا کر گاڑی سے اُتر آئی تھی اور باوجود کوشش کے اس شخص کو شکریہ کا لفظ نہ کہہ پائی تھی۔ اسے غالباً اس کی توقع بھی نہیں تھی، اسی لئے گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ کسی حد تک سنسان سڑک کراس کر کے میں 'دارالاطفال' کے سیاہ بلند و بانگ گیٹ کے سامنے پہنچی تھی۔

"کیا بات ہے جی۔ کدھر جا رہی ہیں آپ؟" کسی غیر مانوس آواز پر میں نے اپنا جھکا ہوا سر

اٹھایا۔ یہ کوئی باوردی پولیس ملازم تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے اپنے پیلے دانتوں کی
نمائش کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے اور اس کے پیچھے کھڑے دوسرے
پولیس مین کو دیکھا تھا اور ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا جب میری نظر سیاہ آہنی گیٹ پر بڑے
بڑے سے تالے پر پڑی تھی۔ میں نے حیرت سے پہلے بند گیٹ کو اور پھر پولیس والوں کی طرف
دیکھا تھا، جو ابھی تک سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"یہ......" میں بری طرح اُلجھ گئی تھی اور تبھی مجھے احساس ہوا تھا کہ گیٹ پر گلزار خاں کی جگہ
پولیس مین کھڑے تھے۔

"یہ بند کیوں ہے؟" ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر میں نے دوبارہ پوچھا تھا۔ ان
دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"لگتا ہے بی بی! آپ اخبار نہیں پڑھتیں۔" ایک نے غالباً میری لاعلمی کا مزہ لیتے ہوئے کہا
تھا۔

"کیا مطلب؟" انجانے خدشے میری آنکھوں کے سامنے اودھم مچانے لگے تھے۔

"اوہو، اس کا مطلب ہے آپ کو واقعی خبر نہیں۔ بتاؤ بھئی نیاز احمد! انہیں۔" اس نے خوامخواہ
ہی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے دوسرے سے کہا تھا۔ ان کے پراسرار لہجے پر میرا دل خوامخواہ ہی تیز
تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"وہ اس ادارے کے مالک ہیں نا محترم جمشید آفندی صاحب۔" اس کا لہجہ بے حد طنزیہ تھا۔
"وہ ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

"کیا؟" میرے حلق سے نکلنے والی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔ کوئی بم تھا جو میری سماعتوں کے
آس پاس پھٹا تھا۔ وجود پہ جما سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

"ہاں جی۔ شک تو بڑے عرصے سے ان پر کیا جا رہا تھا۔ مگر بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منا
سکتی تھی؟ دیکھ لیں، چھری تلے آ ہی گئی۔ اور آپ تو جانتی ہیں، قانون کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے
ہیں۔ کل مع ثبوت کے حراست میں لیا ہے۔ اب تو اس کا پورا گینگ مل کر بھی چاہے تو اسے چھڑا
نہیں سکتا۔" وہ چٹخارے لے لے کر بتا رہا تھا اور مجھے اس وقت اپنی سماعتیں دنیا کی ہر چیز سے
زیادہ بے اعتبار لگی تھیں۔

"بس جی نیکی کی آڑ میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ کالا روپیہ سفید کرنے کے بہانے ہیں
سب۔" وہ دونوں آپس میں اس دکھاوے کی نیکی پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ اور میری سانسیں
جیسے میرے ہی وجود میں گھٹنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو بہ دقت حرکت دی

پاؤں تلے زمین، ریت کی طرح سرکتی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہ رہی تھی۔

کیا ہوا؟

کس نے کیا کہا؟

سچ کہا یا جھوٹ؟

کچھ معلوم نہ تھا۔ ذہن تمام دروازے کھڑکیاں مقفل کر کے سوچ کا ہر راستہ مسدود کر چکا تھا۔

ایک چہرے کے پیچھے کتنے چہرے؟

کون سا اصل اور کون سا نقل؟

تہ در تہ، پرت در پرت...... اے زندگی! ابھی تیرے چہرے سے کتنے نقاب اُتریں گے۔

کیا ہے تیری اصلیت؟ کتنی گہرائی میں جا کر تجھے پا سکوں گی؟

میرے قدم اونچے نیچے راستوں پر بے ترتیبی سے پڑ رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے
اپنی آنکھوں پہ چھائی دبیز دھند کو ہٹانا چاہا۔

'میں کس راستے پر چل رہی ہوں؟' میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی مگر
کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ایک سیاہ، گھور، تاریک رات چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔
میں نے بے اختیار ہاتھ مارتے ہوئے اس کالی بلا کو اپنے سے دور ہٹانا چاہا جو مجھے نگل لینے کو بے
تاب ہو رہی تھی۔ اور اس سیاہ رات کی آغوش میں سے کتنے بھیانک چہرے مجھے ڈرا رہے تھے۔

"او مانگ بھری میری کامنی۔" کوئی مجھے اپنی گرفت میں لینے کو آگے بڑھ رہا تھا۔

"آئی وِل کِل یو......" بال بکھرائے، وحشت زدہ چہرہ میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے
ان سے بچنے کے لئے فوراً پیچھے ہٹنا چاہا تھا، تبھی زمین میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گئی تھی یا
شاید اس کی حد یہاں تک آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

میرے لبوں سے ایک تیز چیخ نکلی تھی۔ میں خلا کی بسیط گہرائی میں گرتی چلی جا رہی تھی۔ تب
اچانک مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے فوراً مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا جسے فوراً ہی کسی
نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"شانزے!...... شانزے!" کوئی بہت دور سے مجھے پکار رہا تھا۔ کوئی مانوس، جانی پہچانی آواز۔

"پلیز ہیلپ می۔" میں نے ٹوٹتی سانسوں کے درمیان کہنا چاہا تھا اور معلوم نہیں الفاظ میرے
ہونٹوں سے نکلے تھے یا نہیں۔

"شانزے! تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ سایہ میرے اوپر جھک آیا تھا اور میں نے کسی کھائی میں
گرنے سے بچنے کے لئے پوری قوت سے اس کا بازو تھاما تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے ناخنوں میں

خون کی چپچپاہٹ کا احساس ہوا تھا۔ مگر میری یہ کوشش بے سود ہی ثابت ہوئی تھی اور
مجھے نگلتی چلی گئی تھی۔



اماوس کی رات میں کوئی جگنو چمکا تھا جسے ہاتھ میں لینے کی خواہش کرتے ہوئے میں بے
اختیار اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر مجھے اپنے کندھوں پر بے تحاشا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ
بازو میں سُوئی کی تیز چبھن کا احساس ہوا تو میں کراہ کر رہ گئی تھی اور اسی چبھن نے لاشعور سے
تک کا رابطہ بحال کر دیا تھا۔

''کیا میں زندہ ہوں؟'' آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پہلا سوال میرے
ذہن میں اُبھرا تھا۔

''شانزے جانو! کیسی ہو تم؟...... میری آواز سن رہی ہو نا؟''

نرم، شیریں آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ ہی دو پتلی پتلی انگلیوں کا
مجھے اپنے بالوں میں محسوس ہوا تھا۔ میں نے اس دُھندلے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی اور
ذرا نقوش گہرے ہوئے تو وہ ملائم مسکراہٹ والا چہرہ ایک دم بہت بھیانک ہو گیا تھا۔

''آئی وِل کِل یو۔'' کوئی ہسٹریائی انداز میں میرے قریب چیخا تھا۔ بالوں کو سہلاتی انگلیاں
پتلے پتلے سانپ بن کر میری گردن سے لپٹنے لگی تھیں۔ خوف کی شدت سے بے حال ہوتے
میں نے ایک جھٹکے سے اپنے اوپر جھکے وجود کو ہٹانا چاہا تھا۔

''ڈیئر! میں تمہاری مما ہوں چندا! آنکھیں تو کھولو نا۔''

''پلیز ہٹاؤ اسے۔ کون ہے یہ؟ مجھے نفرت ہے اس سے۔'' میں چک پھیریاں کھاتے
کے ساتھ چلائی تھی۔

''ایسا مت کہو شان! یو آر مائی چائلڈ۔'' وہ کند چھری سے مجھے ذبح کر رہی تھیں۔

''مگر مجھے نفرت ہے تم سے، تمہاری آواز سے، تمہاری شکل سے۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ
یو۔'' میں پوری قوت سے چیخنا چاہ رہی تھی۔ مگر میرے بدن کی زائل ہوتی قوت میرا ساتھ نہ دے
سکتی تھی۔ میرے بازو تھک کر میرے پہلو میں جا گرے تھے اور ادھ کھلی آنکھیں بے دم ہو کر
تھیں۔ زبان سے نکلتے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادھ موئے ہو کر ہونٹوں پہ دم توڑ گئے تھے اور
ہزاروں فٹ نیچے کسی اندھی کھائی میں گرتا چلا گیا تھا۔



سرنخل جاں

کوئی رات اُتری ہے آگ سی
چاند، تاروں سے بے نیاز
روشنی سے ناآشنا
سلگتی، تپتی وہ رات سی
مجھے لے رہی ہے حصار میں
میں گھسٹ رہی ہوں پابرہنہ
اس ریتلے سے عذاب میں
کوئی آسمان!
کوئی آسماں بھی نہیں ہے
قرب وجوار میں
میری روح بھٹک رہی ہے
کوئی راستہ!
کوئی راستہ بھی نہیں ہے
نظر حدود میں
مجھے پانی دو
مجھے چند بوندیں نواز دو
میری سانسیں لاغر ہو رہی ہیں
آنسوؤں کے ہجوم میں
میں لمحہ لمحہ پگھل رہی ہوں
بے یقینی کی آگ میں



''شانزے!...... شانزے!'' کسی نے ایک دم مجھے جھنجوڑ کر اس خوفناک اور بھیانک خواب کی
قید سے آزاد کرایا تھا، جو نہ جانے کتنی دیر سے مجھے اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور زبان
خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی۔ حلق جیسے خار بن کر آتی جاتی سانسوں کو چیر رہا تھا۔ تبھی کسی نے
میرا سر ذرا سا اونچا کر کے پانی کا گلاس میرے خشک ہونٹوں سے لگا دیا جسے میں ایک ہی سانس
میں خالی کر گئی تھی۔

"اب ٹھیک ہو نا؟" انتہائی نرم، مہربان لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"شاید تم خواب میں ڈر گئی تھیں۔" وہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔ مگر میں نے بغیر کوئی جواب دیئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ لمحوں بعد سانس بحال ہوا تو میں نے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ہاسپٹل کی سفید دیواروں کی بجائے لائٹ پنک دیواروں پر نظر پڑی تو اپنے بیڈروم میں ہونے کا احساس مجھے یک گونہ تسکین دے گیا تھا۔

میں پچھلے پندرہ دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی تھی اور ان پندرہ دنوں میں میری حالت اس قدر دگرگوں ہو چکی تھی کہ میری عیادت کو آنے والے لوگ حیرت و تاسف کا اظہار کرتے اور ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ میری حالت کے پیش نظر مجھے زیادہ وقت مسکن ادویات کے زیر اثر رکھا گیا تھا مگر مجھے کسی طور چین نہ تھا۔ مدہوشی میں عجیب و غریب چہرے مجھے ڈراتے رہتے۔ ہوش میں آتی تو ان دو سبز آنکھوں کا کانچ میری پلکوں میں چبھنے لگتا۔

"بتاؤ بھلا ایسے حسین، خوب صورت چہرے ایسے بھیانک اور بدنما بھی ہو سکتے ہیں۔

وہ جو کانچ جیسا تھا، صاف اور شفاف۔

وہ جو فرشتوں جیسا تھا پاکیزہ مصفا۔

وہ جس کی آنکھیں دوسروں کے دکھ پر بھیگ جایا کرتی تھیں۔

وہ جس کی آنکھوں میں دوسروں کو خوش دیکھ کر ہزاروں دیپ ایک ساتھ جل اُٹھتے تھے، بھلا وہ اس زہر کی سوغات بانٹ کر اندھیرے کس طرح تقسیم کر سکتا ہے؟ وہ تو مسیحا تھا۔ پھر گھاؤ کیسے لگا سکتا تھا وہ۔ بتاؤ بھلا ایسا ہو سکتا ہے؟...... ایسا ہوا ہے کبھی؟"

میں دیوانہ وار چیخ چیخ کر اپنے سامنے آنے والے ہر فرد سے پوچھتی۔ ڈاکٹرز سے سوال کرتی جو میرے ہر سوال سے نظریں چرا لیتے۔ نرسوں سے سوال کرتی جن کی آنکھوں میں میرے لئے صرف اور صرف رحم تھا، ترس تھا۔ مگر میرے کسی سوال کا کسی کے پاس جواب نہ تھا سوائے "ریلیکس...... ٹیک اِٹ اِیزی" اور ٹرنکولائزر کے۔ اور بالآخر میں نڈھال ہو کر تکیے پہ سر پٹخ پٹخ کر رو دیتی۔ روتے روتے بے حال ہو جاتی اور پھر مدہوش ہو کر چہروں کے اس جنگل میں جا نکلتی جہاں ہر چہرے پہ ایک نقاب تھا۔ تب پھر اس آنکھ مچولی سے تھک کر میں نے چپ سادھ لی۔ خود کو مکمل طور پر مُردہ تصور کر کے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور بالآخر ہاسپٹل کی سفید دیواروں والے پرائیویٹ روم سے اپنے بیڈروم میں منتقل ہو گئی۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر ولید احتشام کو دیکھا جو پُرسوچ نظریں مجھ پر جمائے بیٹھا تھا۔

"تین بجے ہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"رات کے؟" میری نظریں بے اختیار کھڑکی کی طرف گئیں جو ہمیشہ مجھے بیڈروم کے باہر کے موسموں کا پتہ دیا کرتی تھی۔ مگر اس وقت پردے برابر ہونے کے باعث مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا تھا۔

"ہاں...... پردہ ہٹا دوں؟" اس نے میری نظروں کو جانچ لیا تھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ملگجا لباس، تھکن زدہ وجود، بے خوابی کی شکایت کرتی سرخ آنکھیں اور پیشانی پہ بکھرے بے ترتیب بال۔

اور نہ جانے کیوں اس شخص کو یہاں دیکھ کر مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ یہ گزشتہ کئی دنوں سے سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ ہاسپٹل کا کمرہ تھا یا یہ بیڈروم جس لمحہ بھی میری آنکھ کھلی تھی، میں نے اسے پریشان و متفکر اپنے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ اور کیا وجہ ہے کہ رات کے اس پہر بھی یہ اتنی ہی مستعدی اور اتنی ہی مستقل مزاجی سے مجھے لک آفٹر کرنے کو یہاں موجود ہے۔

میں نے ایک نظر اسے دیکھ کر سوچا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہی ہو شانزے؟" اس نے نزدیکی کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔ چہرے کے برعکس ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ بہت فریش تھی۔

"بہتر ہوں۔" میں نے مختصر کہہ کر نظریں کھڑکی سے باہر مکمل اندھیرے پہ جما دی تھیں۔

"سنو! تم نے اپنے چہرے پہ کتنے نقاب چڑھا رکھے ہیں؟" میں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔

"آپ کو یہ شک کیونکر ہوا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے جوابی سوال داغ دیا تھا۔

"شک نہیں...... اب تو یقین ہو چلا ہے...... ایسے ایسے چہروں کو بے نقاب ہوتے دیکھا ہے کہ خود پر سے بھی اعتبار اُٹھنے لگا ہے۔"

"نہیں شانزے جی! چہرے دھوکا نہیں دیتے۔ ہم خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ دوسروں کے دیکھنے کے لئے ہماری نظر کا زاویہ ہی غلط ہو تو اس میں ہمارا قصور ہوا نہ کہ چہرے کا۔" اس نے بڑی نرمی سے گویا میری غلطی کی نشاندہی کی تھی۔

تو گویا سارا قصور، ساری غلطی میری ہی ٹھہری تھی۔ میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس کی شدید مخالفت کرتی مگر اب میں نے ہارے ہوئے انسان کی طرح بڑی آسانی سے دوسروں کی غلطیاں بھی اپنے کھاتے میں ڈال دی تھیں اور شاید میرے لہجے کی تھکن اس نے بھی محسوس کی تھی اسی لئے اس نے بات بدل دی تھی اور مجھ سے جوس کے متعلق پوچھنے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر گردن موڑتے ہوئے دوسری طرف ایزی چیئر پہ

اونگھتی نرس کو دیکھا۔

"ان فیکٹ مجھے نیند نہیں آرہی تھی، اس لئے میں کتاب سمیت یہاں چلا آیا۔ اور غالباً میری موجودگی نے ہی سسٹر کو غافل کر دیا ہے۔" اس نے جوس کا گلاس میری طرف بڑھایا جسے میں نے بغیر کچھ کہے تھام لیا تھا۔ پھر کچھ لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں یونہی خالی الذہنی سے کھڑکی سے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھتی رہی۔

"ولید! کیا واقعی آفندی صاحب......؟" میں کوشش کے باوجود جملہ مکمل نہ کر سکی تھی۔

"میرا خیال ہے، اس ٹاپک پر پھر کبھی بات کریں گے۔" اس نے ٹالنا چاہا تھا۔

"پلیز......" میں نے ملتجی ہو کر اصرار کیا۔

"ہاں، حالات اور شہادتیں تو کچھ ایسا ہی بتاتے ہیں۔" اس نے بنظر غائر مجھے دیکھتے ہوئے بتایا تھا اور میرے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس لرز گیا تھا۔

"الزام ثابت ہو چکا ہے؟" میں اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔

"مال سمیت اریسٹ کیا گیا ہے اس کو مگر بہر حال کیس تو چلے گا۔" بہت ضبط کرنے کے باوجود اندر کہیں زلزلہ سا آیا تھا۔ چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا اور کرچیاں بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا اور خود گھٹنوں پہ سر رکھ کر اپنے جھٹکے کھاتے وجود کو نارمل کرنا چاہا تھا۔ ایک دم عجیب وحشت سی محسوس ہوئی تو میں کمبل ہٹا کر بیڈ سے نیچے اترنے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے گلاس فوراً میز پہ رکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ کھٹکے سے نرس کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ وہ فوراً ہی اپنی پیشہ ورانہ مستعدی لئے میری طرف بڑھی تھی۔

"میڈم! کہاں جانا ہے؟"

"باہر۔" میں نے بیڈ کے پاس پڑی چپل میں پاؤں گھسائے۔

"مگر باہر بہت سردی ہے میڈم!" اس نے فوراً مجھے کاندھوں سے تھام کر روکنا چاہا۔

"اندر بہت گھٹن ہے۔ مجھے باہر جانا ہے۔" میں سختی سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے کھڑی ہوئی تو ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی۔

"پلیز آپ بیٹھ جائیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کر ایک بار پھر زور دیا تو میں اس کی ضد پہ اکتا کر ولید کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے گویا میری نظروں کا مفہوم جان لیا تھا جبھی وہ دو قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

"او کے...... آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف چل دیا

تب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس وقت مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔ نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر بھی حتیٰ کہ میں یہ فیصلہ بھی نہ کر پا رہی تھی کہ آیا مجھے اس شخص کا سہارا لینا بھی چاہئے کہ نہیں۔ یونہی میکانکی انداز میں اس کے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے میں پاپا کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ تب اس نے ایک دم سارا دروازہ کھول دیا تھا۔

"یہ کمرہ تمہیں اسی طرح پسند ہے نا؟ دیکھ لو، ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ جبکہ میری نظریں پاپا کی فریم شدہ تصویر پہ جم گئی تھیں جو اپنے مخصوص مقام پر آویزاں تھی۔

"پاپا! کہاں چلے گئے ہیں آپ......؟" میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی تصویر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آ جائیے نا...... مجھے آپ کی بے حد ضرورت ہے۔" میں نے کپکپاتی انگلیوں سے تصویر کے نقوش کو چھوا۔ "دیکھئے...... میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک طوفان ہلکورے لے رہا ہے۔ میں یہ سارے آنسو آپ کے ساتھ مل کر بہا دینا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں دکھ کنڈلی مارے بیٹھا ہے...... پاپا! میں آپ کے بغیر اسے شکست نہیں دے پاؤں گی۔ مجھے آپ کا سہارا چاہئے۔ پلیز لوٹ آئیے نا۔"

میرے دل سے ہوک اُٹھ رہی تھی اور اس لمحے میرے دل نے کتنی شدت سے خواہش کی تھی کہ یہ بے جان تصویر سانس لینے لگے۔ پاپا میری درد بھری پکار پر کانچ کے اس حصار سے آزاد ہو جائیں۔ ان کے ملبوس سے اُٹھتی مہک میرے اردگرد پھیل جائے اور میں ان کے سینے پہ سر رکھ کر وہ سب کچھ کہہ ڈالوں جو میرے وجود کو اندر ہی اندر گھن بن کر کھوکھلا کر گیا تھا۔ مگر ہوا کیا تھا؟

میری خواہش حسرت بن کر رات کے سینے میں گڑ گئی تھی اور میں بھربھری مٹی کی مانند زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"شانزے!" عقب میں کھڑے ولید احتشام نے سراسیمہ ہو کر مجھے پکارا تھا۔

"پاپا!...... مجھے آج احساس ہوا ہے کہ آپ مر چکے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں، آپ کی آنکھیں میرے دکھ میں بالکل بھی نم نہیں ہوئیں۔ آپ کے ہونٹوں پر میرے لئے کوئی دلاسا نہیں۔ آپ کے بازو مجھے اپنی پُرشفقت آغوش میں پناہ دینے کے لئے وا نہیں ہوتے۔ پاپا! آپ نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے...... بالکل تنہا۔" میں دل ہی دل میں شکوہ کناں تھی۔

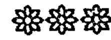
"شانزے! تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ چلو تمہیں بیڈ روم تک لے چلوں۔" وہ میرے بے حال ہوتے وجود کو سہارا دے رہا تھا۔

"ولید!" میں نے جیسے سمندر میں ڈوبتے ہوئے تنکے کا آسرا لینا چاہا تھا۔ "ولید! میں مرنا چاہتی ہوں۔" میری آواز آنسوؤں میں گھل گئی تھی اور لہجے میں حد درجہ بے بسی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا تھا اور پھر مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تم جتنا رونا چاہتی ہو رو لو شانزے! مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں تمہارے آنسوؤں کو اپنے دل میں سمیٹ سکوں۔"

اس کے دوست نواز ہمدرد لہجے نے میرے ضبط کی آخری فصیلیں بھی گرا دی تھیں اور پھر اس کے ہی بازوؤں میں سر چھپا کر روتے ہوئے میں نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جسے جھٹلانے اور چھپانے کی کوشش میں اس زندگی نے چین، سکون، آرام اور اعتبار کے سب دروازے مجھ پر بند کر دیئے تھے۔



"کہا جاتا ہے کہ فطری طور پر بچہ باپ کی نسبت ماں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مگر میرے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میری پیدائش میں اگر کسی فرد کی خواہش اور خوشی شامل تھی تو وہ صرف میرے پاپا تھے۔ مما کا خیال تھا کہ بچے کی آمد کی وجہ سے ان کی سوشل لائف بالکل ڈل ہو کر رہ جائے گی لہٰذا ادھر اس دنیا میں میری آمد ہوئی ادھر انہوں نے مستقل طور پر ایک آیا کا بندوبست کر دیا۔ پاپا کا خیال تھا کہ میری اچھی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ مما مجھے اپنا دودھ پلائیں مگر وہ بے وقوف نہ تھیں کہ اپنا فگر خراب کرتیں۔ یہاں انہوں نے میرا سب سے پہلا حق غصب کیا تھا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری ہو گیا تھا۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو پیار، محبت، شفقت، چاہت، خلوص و ہمدردی اور ہر رشتے کو اپنے پاپا کی شکل میں پایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ماں کے فرائض کیا ہوتے ہیں، ممتا کا لمس کیا ہوتا ہے۔ جس جس چیز کی مجھے ضرورت تھی، وہ میں نے اپنے باپ سے وصول کی تھی۔ میں صبح اٹھتی تو ان کی صورت دیکھنا چاہتی۔ رات کو جب تک وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر لوری نہ سناتے، مجھے نیند نہ آتی۔ ذرا بڑی ہوئی تو آیا کے ہاتھ سے ناشتہ کرنا مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ میں فوراً پاپا کی گود میں سوار ہو جاتی اور کبھی کبھی نہ جانے کیوں میں چاہتی کہ پاپا آج میرے ساتھ رہیں۔ ایک پل کے لئے میری نظروں کے سامنے سے اوجھل نہ ہوں۔ تب میں زور زور سے رونے لگتی، بے تحاشا روتی تو پاپا ضروری سے ضروری میٹنگ بھی کینسل کر دیتے، خواہ انہیں کروڑوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔

چند سال مزید گزرے تو اپنی اس عادت پر میں نے خود ہی قابو پا لیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اس طرح پاپا بری طرح اپ سیٹ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ میری آنکھ میں ہلکی سی نمی بھی برداشت نہ

کر پاتے تھے۔ انہی دنوں ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے بری طرح ہراساں کر دیا تھا۔ رات کا کوئی وقت تھا جب میں اپنے کمرے میں کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ آیا اکتائے اکتائے لہجے میں کئی بار مجھے سونے کے لئے کہہ چکی تھی مگر مجھے پاپا کا انتظار تھا۔ اسی دوران ایک دم لائٹ آف ہو گئی۔ کھلونوں میں مصروف میرے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ آیا کو پکارنا چاہا تو جواب میں اس کے زوردار خراٹوں نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے جنگل میں کوئی بھیڑیا میری گھات میں بیٹھا غرا رہا ہے۔ کمرے میں موجود تمام اشیاء مجھے بھوت بن کر ڈرانے لگی تھیں۔ میں اس لمحے بے حد خوف زدہ ہو چکی تھی۔ میرا جسم کانپنے لگا تھا اور سانس رکنے لگی تھی۔ مگر میں نے ایک مرتبہ پھر آیا کو پکارنے کی کوشش کی مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

نہ جانے کب تک میں یونہی ہراساں و سراسیمہ، گھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھی رہی تھی کہ مجھے باہر سے پاپا کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے میرے متعلق پوچھ رہے تھے۔ ان کی آواز نے جیسے مجھے طاقت بخشی اور میں پوری قوت سے اٹھ کر اس اندھیر نگری سے نکل بھاگی تھی۔ خوف و دہشت کی وجہ سے میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔ سو بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور میں سب سے اوپر والی سیڑھی سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری تھی۔ میری زوردار چیخ پر پاپا میری طرف دیوانہ وار لپکے تھے۔ میری پیشانی سے بہتے خون نے جیسے انہیں پاگل کر دیا تھا۔ آیا اور ملازمین کی جو درگت بنی سو بنی، رات گئے جب مما کسی پارٹی سے واپس آئیں تو پاپا غیض و غضب سے بے حال ہو کر ان پر الٹ پڑے تھے۔ میں نے اس سے پہلے پاپا کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مما کو یہ احساس دلا رہے تھے کہ میں ان کی اولین ذمے داری ہوں اور وہ اپنے فرائض سے غفلت برت رہی ہیں۔ مگر مما کسی طرح اپنی غلطی تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھیں۔

ان کے درمیان چھڑی دھواں دھار جنگ نے مجھے مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بھاگ کر پاپا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور رو رو کر انہیں خاموش ہو جانے کا کہہ رہی تھی۔ تب پاپا نے مجھے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ وہ مجھے لئے دوسرے کمرے میں آ گئے تھے اور مجھے بے تحاشا پیار کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے۔

"میں چاہتا تھا کہ جو محرومیاں میری زندگی میں مجھے ملی تھیں، وہ تمہارا مقدر نہ بنیں۔ مگر مجھے لگتا ہے شان! تمہاری اور میری قسمت بالکل ایک سی ہے۔"

میں نے اپنے پلنگ سے پاپا کو یوں بری طرح روتے دیکھا تو اسی لمحے دل میں عہد کر لیا تھا

کہ آج کے بعد میں نہ اندھیرے سے ڈروں گی اور نہ روؤں گی تاکہ میری وجہ سے پاپا کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ اس کے بعد پاپا اکثر مجھے پھپھو کی طرف لے جاتے جہاں میری ہم عمر ونیزہ کے ساتھ میری گاڑھی چھنتی تھی۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں ماں کی محبت کو محرومی نہ بنا لوں سو وہ پھپھو کو خاص طور پر میرا خیال رکھنے کو کہتے۔

اگرچہ پھپھو بھی مکمل گھریلو خاتون نہ تھیں مگر ان کا لائف اسٹائل مما سے قدرے مختلف تھا۔ دن میں میرے اور ونیزہ کے لئے کچھ وقت ضرور نکالتی تھیں۔ پھر کئی سال تک یوں رہا کہ میں مہینوں ونیزہ کے گھر رہتی۔ پاپا سے ہر روز ملاقات ہوتی اور مما کا چہرہ دیکھے بھی کئی دن ہو جاتے۔ میں اور ونیزہ اپنی ہی دنیا میں مگن ہو گئے تھے۔ تبھی ایک دن میں گھر چلی آئی کیونکہ اس روز پاپا، پھپھو کی طرف نہیں آئے تھے۔ ملازم نے بتایا کہ پاپا آج سرِشام ہی لوٹ آئے تھے اور اس وقت گھر میں ہی موجود ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ پاپا گھر میں ہوں تو ہمیشہ اپنی مخصوص جگہ پر ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں دبے پاؤں وہاں چلی آئی تھی۔ پاپا ایزی چیئر پر بیٹھے تھے۔ کتاب ان کی گود میں کھلی پڑی تھی مگر نظریں گلاس وال سے باہر ڈوبتے سورج کا طواف کر رہی تھیں۔ تھکے ماندے آفتاب کی بوجھل نارنجی کرنیں لان میں بکھرے پھولوں اور درختوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں۔ بے حد زرد اور اُداس شام تھی۔ میں نے ذرا سا سامنے کی طرف آتے ہوئے پاپا کو دیکھا۔ ایسی ہی زرد اور اُداس شام ان کی سیاہ آنکھوں میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی۔ چہرے پہ شکستگی اور تھکاوٹ کے اثرات نمایاں تھے۔ وہ جیسے یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں موجود نہیں تھے۔

نہ جانے کیوں مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے پاپا کو بہت عرصے کے بعد دیکھا ہو۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ان کے سامنے کارپٹ پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی تھی مگر وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے بہت دور ہوں۔ میں نے گھبرا کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں پکارا۔ انہوں نے بغیر چونکے نظروں کا زاویہ بدل کر مجھے دیکھا تھا اور پھر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں کے تاثرات یکلخت بدل گئے تھے۔ ایک خوشگوار حیرت ان کی آنکھوں سے چھلکنے لگی تھی۔

''شانزے جانو! میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' انہوں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر کہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا، میری موجودگی پاپا کو کس طرح آسودہ کر دیتی تھی۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''پاپا! آپ اُداس تھے نا؟'' مجھے یقین تھا، پاپا انکار کر دیں گے مگر وہ شاید اپنی اس طویل تنہائی

سے بیزار ہو چکے تھے۔ میری صورت میں ایک غمگسار کو سامنے دیکھا تو اثبات میں سر ہلا گئے۔

''ہاں بیٹا! بہت اُداس تھا۔'' انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں اعتراف کیا تھا اور اپنے اسٹرونگ سے پاپا کی یہ کمزوری مجھ سے برداشت نہ ہو سکی تھی۔ میں جان گئی تھی کہ میری عدم موجودگی پاپا کو اُداس کر دیتی ہے۔ سو اس دن کے بعد سے میں نے کالج کے سوا کہیں بھی جانا بند کر دیا تھا۔ ونیزہ ناراض ہوئی مگر میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اب پاپا کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس دن میں نے بچپن کی معصومیت سے، پختگی کی سنجیدگی میں قدم رکھا تھا اور اسی دن کے بعد سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مما کی روٹین آج بھی نہیں بدلی۔ انہیں اپنے شوہر، بچی اور گھر سے زیادہ وہ پارٹیز، وہ فنکشن زیادہ عزیز تھے جہاں ان کے حسین ترین سراپے کو سراہنے کے لئے ہزاروں نظریں بیک وقت ان کے گرد گھیرا ڈالے رکھتی تھیں۔ انہیں پاپا کی پسند پر ہاؤس وائف بننا پسند نہیں تھا۔ پاپا کے ہر اعتراض کے جواب میں وہ اپنے تنے ہوئے ابرو اچکا کر کہا کرتیں۔

''ایمان حسن!...... میں تمہارے اشاروں پر ناچنے کے لئے یہاں نہیں آئی تھی۔ میرا اپنا لائف اسٹائل ہے۔ سو مجھے میری زندگی جینے دو۔ ہاں اگر تمہیں پتی ورتا ٹائپ بیوی کی ضرورت ہے تو جان لو کہ میرا انتخاب کر کے تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اور اگر تم کوئی نیا انتخاب کرنا چاہو اپنی پسند کے مطابق تو تمہیں میری طرف سے اجازت ہے، تم جب چاہو اپنا راستہ الگ کر سکتے ہو۔'' وہ بڑی نزاکت سے کندھے جھٹک کر اپنے مرمریں بازو میں پہنے جگمگاتے بریسلٹ کو گھماتیں اور زہر میں بجھے تیر پاپا کی طرف اُچھال کر آگے بڑھ جاتیں۔ انہیں معلوم تھا، ایمان حسن آج انہیں آزاد کر دے تو ہزاروں ہاتھ انہیں تھامنے کے لئے آگے بڑھ آئیں گے۔ پاپا زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تو میں نظریں جھکا کر رہ جاتی۔

''صرف تمہاری خاطر میں ہمیشہ اس عورت کو برداشت کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔'' وہ میری خاطر بے بس ہو جاتے اور کبھی جو میں ان کی خاطر مما کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ وہ کچھ وقت گھر کو دیا کریں تو وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگتیں۔

''ڈونٹ بی سلی شان! زندگی اس طرح نہیں گزاری جا سکتی جس طرح تم اور ایمان حسن گزار رہے ہو اور تم کیوں سارا دن گھر میں گھسی رہتی ہو؟ بھئی باہر نکلو، دنیا دیکھو، لائف انجوائے کرو۔ اور نہیں تو کوئی کلب ہی جوائن کر لو۔ تمہاری عمر میں تو لڑکیاں......''

وہ چہرے کا مساج کرتے ہوئے میرا مضحکہ اُڑانے لگتیں تو میں وہاں سے چڑ کر اُٹھ جاتی۔ پھر ممی اور پاپا ایک دوسرے کی ذات میں اس حد تک گم ہوتے گئے کہ کسی تیسرے کی پروا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اپنا ہر دکھ سکھ ہم ایک دوسرے سے شیئر کر لیتے۔ رات گئے تک چائے اور کافی کے ساتھ

اسٹڈی روم میں بیٹھے رہتے۔ دنیا کا کون سا ایسا موضوع تھا جو ہم دونوں کے درمیان ڈسکس نہ
تھا۔ شاعری، ڈرامہ، نثر، مصوری، سیاست، سیاحت، تصوف غرض بات سے بات نکلتی چلی جاتی اور
پھر کبھی آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ڈرائی فروٹ اُڑاتے ہوئے میں پاپا کو کالج کی ساری باتیں
سناتی تو میں محسوس کرتی کہ لکڑیاں چٹختاتی آگ پر نظریں جمائے پاپا کسی گہری سوچ میں ڈوبے
ہوئے ہیں۔ تب میں ان سے اصرار کرتی۔

''پاپا! بتائیں نا کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ پُرسوچ نظریں میرے چہرے پہ جمادیتے۔

''سوچ رہا ہوں، وہ کیسا لمحہ تھا جب میں نے تمہاری مما کو دادا کی عظیم الشان حویلی میں بارش
میں بھیگتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جھولا جھول رہی تھی جب میری لینڈ کروزر حویلی کی پتھریلی روش پر
رک گئی تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ یکایک بوندوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی اور فصیحہ نے
بارش سے بچنے کے لئے بھاگ کر برآمدے میں پناہ لی تھی۔ وہ مکمل گھریلو حلیے میں تھی۔ کسی بھی
آرائش سے بے نیاز چہرہ...... بے حد جاذب نظر تیکھے نقوش اور ان نقوش پر حاوی معصومیت (جو
اس کوٹھی میں آکر نجانے کہاں کھوگئی تھی) وہ گھر بھر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھی۔ اور تب میں
نے دل میں سوچا تھا کہ یہ ہی لڑکی میرے گھر میں اُجالا بن کر اُترے گی۔ والدین کی ناراضگی کی
پروا کئے بغیر میں نے اسے اپنایا تھا اور سمجھا تھا کہ میں جیت گیا ہوں مگر مجھے کہاں معلوم تھا کہ میں نے
اس لمحے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا تھا۔'' پاپا کا افسردہ لہجہ مجھے بری طرح دکھی کر
دیتا۔ مگر وہ دل کی ہر بات کہہ جاتے۔

''میری ماں ایک مشہور فیشن ڈیزائنر تھی اور باپ بزنس سرکل میں ''کنگ'' کے نام سے مشہور
تھا۔ مگر میں ساری عمر ان دونوں کو ترستا رہا۔ ماں کی گود میں سر رکھنے کی خواہش اور باپ سے فدا
کے بات منوانے کی آرزو میرے دل میں جنم لیتی اور توڑ دیتی۔ میرے دوسرے بہن بھائی مجھے
''مڈل کلاسیا'' کہا کرتے تھے۔ یہ تمام حسرتیں میرے ساتھ پل کر جوان ہوئی تھیں۔ اور میں جو ان
مڈل کلاس سے فصیحہ کو اپر کلاس میں لے کر آیا تو صرف اس لئے کہ میرے بچے ''ماں'' کے ہوتے
ہوئے بھی ''ماں'' کو ترستے نہ رہا کریں۔ مگر قسمت مجھے یہاں بھی دھوکا دے گئی۔ مجھے معلوم نہ
تھا کہ فصیحہ اُڑنے کی کوشش میں آسمان کو چھونے کی تمنا کرنے لگی۔

میں گھر کے سکون کی خاطر اسے ڈھیل دیتا رہا اور وہ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگی۔
بیٹا! تمہاری وجہ سے میں اس سے تعلق توڑ نہیں سکا۔ ماں جیسی بھی ہو، ماں ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا
تم اسے اپنی طرف متوجہ کر سکو گی۔ مگر نہ جانے کیسی نا تمام خواہشات اس کے دل میں پلتی رہی ہیں
کہ جنہیں تمام کرنے کی کوشش میں وہ تمہیں بھی بھول بیٹھی ہے۔''

تب میں پاپا کو تسلی دیتی۔ انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ میں جس حال میں بھی ہوں،
مطمئن ہوں۔ اور پھر ایک روز۔''

میں کچھ دیر سانس لینے کو رُکی تھی۔ ولید احتشام منتظر نظریں مجھ پر جمائے خاموشی سے بیٹھا
تھا۔ اس نے مجھے فوراً بولنے پر مجبور نہیں کیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں میری
زبان گنگ ہو جاتی ہے اور الفاظ چپ کی زنجیر میں بندھ جاتے ہیں۔ میں نے اندر ہی اندر اپنی
قوت بحال کی تھی۔ میں اس بوجھ کو ہر حال میں سینے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔

''اور پھر ایک روز گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔'' میں نے ہمت مجتمع کر کے پھر سے کہنا
شروع کیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس ہنگامے کا محرک کیا ہے۔ میں بس اتنا دیکھ پا رہی تھی کہ پاپا از حد
غصے میں تھے۔ انہیں غصہ بہت کم آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ ایک طوفان کی مانند بپھر جایا کرتے
تھے۔ اس وقت بھی ان کی یہی کیفیت تھی۔ جبکہ مما سلیوز لیس نائٹی پر مہین سا گاؤن پہنے بڑے
مطمئن انداز میں نیل پالش صاف کر رہی تھیں۔ گویا بھس میں چنگاری ڈال کر بھڑ بھڑ جلتی آگ
سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میں اسے روٹین کی کوئی چپقلش سمجھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ مگر
اس کے بعد دو دن تک پاپا اس حد تک ٹینس رہے کہ مجھے ان کی فکر لاحق ہوگئی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ
تھے اور ڈپریشن ان کے لئے سخت نقصان دہ تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے اصل بات
اُگلوانے کی کوشش کی مگر وہ پُرخیال نظروں سے مجھے بس دیکھتے رہے، کہا کچھ نہیں۔ مگر یہ عقدہ بھی
اس شام کھل ہی گیا۔ میں حسب عادت یونیورسٹی سے واپسی پر سو گئی تھی۔ رات کو جب میری آنکھ
کھلی تو پاپا کے بیڈ روم میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ دونوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ
رہی تھیں۔

'نہ جانے اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ اور یہ مما بھی کیسی ضدی ہیں۔ مجال ہے جو پاپا کی کوئی بات
مان جائیں۔'

میں نے اُکتا کر سوچا تھا اور پھر دبے پاؤں چلتی ہوئی بیڈ روم کے دروازے تک آئی تھی۔
فطری طور پر میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ آخر جھگڑا کس بات پر ہے۔

''آر یو میڈ فصیحہ؟ تم جانتی ہو تمہارے اس فیصلے کا شانزے پر کتنا برا اثر پڑے گا؟''

''شانزے دودھ پیتی بچی نہیں ہے، بڑی ہو چکی ہے۔ برا بھلا سمجھ سکتی ہے وہ۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ یہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ وہ اب بڑی ہو چکی ہے۔ ہم
دونوں کو اس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ تمہیں نہیں معلوم مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے کتنی

محبت کرتی ہے...... تمہارے اس فیصلے سے اسے کتنا دکھ ہوگا...... یہ سوچا ہے تم نے؟" پاپا کہہ رہے تھے۔

"ایمان حسن!...... میرے پاس تمہاری فضول باتیں سننے کا بالکل وقت نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے ڈائیوورس چاہئے۔ میں اب تمہارے ساتھ مزید گزارہ نہیں کر سکتی۔" مما نے مطمئن لہجے میں کہا تھا مگر میرے سامنے ہفت آسمان گھوم گئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں مما؟" میں ششدر سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

"مگر میرے جیتے جی یہ نہیں ہوگا۔" کچھ دیر خاموشی کے بعد پاپا کی سرد و سپاٹ آواز فیصلہ کن لہجے میں سنائی دی تھی۔ اس کے بعد مما نے نہ جانے کیا کہا تھا، میں منہ پہ ہاتھ رکھے لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ مما کے چیخنے چلّانے کی آوازوں نے کمرے تک میرا پیچھا کیا تھا۔ میں نے اپنے سائیں سائیں کرتے کانوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھیں۔ میرے اندر چھپی ہوئی بچی بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔

'کیوں کر رہی ہیں مما ایسا؟' میں نے بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ پھر باہر سے اُٹھنے والی آوازیں یکلخت معدوم ہو گئی تھیں۔ میں کچھ لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ تو پاپا اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو گئے ہوں گے یا مما گاڑی لے کر باہر نکل جائیں گی۔ گاڑی کی آواز نہ آئی تھی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر اسٹڈی روم کی طرف دیکھا، اس کا دروازہ ہوا تھا۔ گویا پاپا بھی بیڈروم میں ہی ہیں۔ اور یہ بات باعث تشویش ہی تو تھی کہ اگر دونوں کمرے میں موجود تھے تو پھر یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں فوراً بیڈروم کے دروازے تک گئی تھی اور ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تھا۔ میری پہلی نظر مما پر پڑی تھی۔ وہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب تھیں۔ اور مسکرا رہی تھیں اور ان کی مسکراہٹ اس قدر زہریلی اور پُراسرار تھی کہ میں نے بے ساختہ ہی مزید دروازہ کھول کر پاپا کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور اگلا لمحہ میرے لئے قیامت بن گیا تھا۔ پاپا درد سے بری طرح بے حال ہوتے ہوئے بیڈ پر جھکے جا رہے تھے۔ دایاں ہاتھ سینے پر تھا جبکہ بائیں ہاتھ سے انہوں نے بیڈشیٹ کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ گویا وہ بے حد اذیت میں ہوں۔ میں چیخ کر ان کی طرف بڑھی تھی۔

"پاپا! کیا ہو رہا ہے آپ کو؟" میں نے بمشکل انہیں کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا تھا۔ مما بھی چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی تھیں۔

"مما......!" میں نے جیسے مدد کے لئے انہیں پکارا تھا، وہ بھی گھبرا کر پاپا پر جھکی تھیں مگر ان کی گھبراہٹ اس قدر مصنوعی تھی کہ میں پریشانی کے اس لمحے میں بھی محسوس کئے بنا نہیں رہ سکی۔

پاپا کی خراب ہوتی حالت دیکھ کر میں نے فوراً سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر گولیوں کی وہ شیشی تلاش کرنی چاہی جو ایسے کسی بھی وقت کے لئے وہاں ہمیشہ موجود ہوتی تھی اور پاپا تکلیف محسوس کرنے پر وہ ٹیبلٹ زبان کے نیچے رکھ لیا کرتے تھے۔ دوسری، تیسری، چوتھی دراز بھی کھنگال لینے کے باوجود وہ شیشی مجھے نہ ملی تو میں ڈاکٹر کو کال کرنے کے لئے فون کی طرف لپکی تھی مگر جونہی میں مڑی تھی، پاپا نے میری قمیض کا بازو کھینچ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ جیسے ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے۔ میں نے ان کے زرد ہوتے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

"پاپا!...... میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں۔" میرا دل ان کو تکلیف میں دیکھ کر کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں کانپتی آواز میں ان کو تسلی دے کر اُٹھی تھی مگر میرے بازو پر ان کی گرفت ایک لمحے کے لئے بے حد مضبوط ہونے کے بعد اچانک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے انجانے خدشے سے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ مجھ پر جمی ان کی حسرت زدہ آنکھیں ساکت تھیں۔ ان میں ہر جذبہ، ہر احساس دم توڑ چکا تھا۔ بس ان کی آنکھ کے بیرونی گوشے پہ ٹھہرا آنسو اس لمحے ٹوٹ کر ان کے بالوں میں جذب ہوا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ ایسے ان سے زندگی کا ناتا بھی ٹوٹ گیا ہے۔

میں اپنی جگہ پتھر کی ہو گئی تھی۔ ایسی انہونی ہوئی تھی کہ یقین کا سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ میری موجودگی میں، اپنی شانزے کی موجودگی میں یوں زندگی سے رُوٹھ جاتے۔ مگر ایسا ہو چکا تھا...... میرے پاپا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ چکے تھے اور میں خشک آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ میں کچھ بھی نہ کر پائی ولید احتشام!...... کچھ بھی نہ کر سکی۔" وہ لمحات، وہ گھڑیاں یوں میری نظروں کے سامنے آئے تھے کہ ضبط کا یارا نہ رہا۔

میں یوں رو رہی تھی جیسے پاپا آج مرے ہوں۔ ان کی میت میرے سامنے پڑی ہو اور میری بے بسی کا احساس مجھے آج کچوکے لگا رہا ہو۔ ولید احتشام بت بنا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے غالباً اس وقت مجھے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"پاپا کی وفات کو کئی روز ہو گئے۔ نہ جانے دل کیسے پتھر ہوا تھا کہ میں رو بھی نہ سکی۔ وہ لمحے بار بار میری نظروں کے سامنے فلم کی مانند چلتے رہے۔ میں نے اتنے دن مما سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ان کی بے جا ضد کی وجہ سے ہی پاپا کی طبیعت اس حد تک خراب ہو گئی تھی۔ اور پھر انہی دنوں جب میں بار بار اس واقعے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی، کچھ سوال کانٹوں کی طرح ذہن کی سطح پر اُبھرے اور مسلسل مجھے تنگ کرتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس وقت جب پاپا کی حالت اس قدر تشویش ناک ہو رہی تھی، مما کھڑکی کے پاس کیوں

کھڑی تھیں؟ اور پھر وہ موقع مسکرانے کا تو نہیں تھا۔ جبکہ میں نے مما کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو بخوبی دیکھا تھا۔

اور پھر میرے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی جیسے انہوں نے واجبی سے طریقے سے پاپا کو ٹریٹ کیا تھا۔ نہ پانی کا گلاس لئے پاپا کی طرف بڑھیں، نہ ڈاکٹر کو فون کرنے کی کوشش کی، نہ کسی ملازم کو پکارا۔ یہ سب باتیں مجھے عجیب سے وہم میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اور یہ وہم ہی تو تھا جو ایک روز مجھے عقبی لان کی طرف کھینچ لے گیا تھا۔

پاپا کے بیڈ روم میں لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے عین نیچے کھڑے ہو کر میں نے پہاڑ پر موجود باڑھ کا جائزہ لیا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ اور یونہی باڑھ کی جڑوں میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتے ہوئے کوئی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی تھی۔ اور معلوم ہے ولید احتشام! وہاں سے کیا چیز برآمد ہوئی تھی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ وہی شیشی تھی، جس میں موجود ٹیبلٹس کی اس وقت پاپا کو ضرورت تھی۔ اور جو ہمیشہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں موجود رہتی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا تھا کہ مما کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی تھیں۔ وہم یقین میں بدلا تھا اور میرے پاؤں تلے سے زمین بھی سرک گئی تھی۔ شک و شبے کی گنجائش موجود نہ تھی۔ اس عورت نے اپنی خواہشات کی خاطر میرے پاپا کو مجھ سے چھین لیا۔ سن رہے ہو نا ولید! وہ بظاہر جو بے حد خوب صورت، اُجلے چہرے والی عورت ہے، اس کا دل اتنا کالا ہے کہ اس نے مجھ سے میرے پاپا کو چھین لیا۔'' میں نے پتھر بنے ولید احتشام کی بے یقین آنکھوں میں جھانک کر اس کو جھنجوڑ ڈالا۔

''وہ خود محبت کرنا نہیں جانتی تھی۔ مگر اُس نے اس شخص کو بھی مار ڈالا جو اس کائنات میں مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ مجھے دنیا کے ہر شخص سے زیادہ محبت دیتا تھا، اتنی محبت کہ آج تک کسی باپ نے اپنی بیٹی سے نہیں کی ہوگی۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے۔

''شانزے جان! تم نہیں جانتیں، تم میرے لئے کیا ہو۔ تم سورج کی اوّلین کرن ہو جو میرے دن کا آغاز کرتی ہو۔ چاند کی روپہلی کرنیں جو رات کی قبا پر ستارے ٹانک دیتی ہیں، وہ تم ہو۔ اور شانزے! بہار کی آمد پر گلشن میں کھلنے والا پہلا پھول بھی تم ہی ہو...... تم میرے روشنی ہو، خوشی ہو، مسکراہٹ ہو، زندگی بھی ہو۔''

''بتاؤ ولید احتشام! کبھی کسی نے اپنی اولاد سے اس حد تک بھی پیار کیا ہوگا؟ اور یہ پیار مجھ سے چھین لیا گیا۔ اور مجھ پر ظلم کرنے والا کوئی اور نہیں، میری اپنی ماں تھی۔ جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔ اور ماں تو بچے کے لئے دنیا میں بڑی سے بڑی قربانی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک چڑیا بھی اپنے بچوں کو موسموں کی آفت سے بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔ پھر یہ کیسی ماں تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں میرے سر سے آسمان کھینچ لیا۔ مجھے بڑی آسانی سے خزاں کی آغوش میں ڈالا اور خود بہار کی رنگینیوں میں کھو گئی۔''

روتے روتے میری آواز پھٹ گئی تھی۔ اور میں گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسک پڑی تھی۔ ولید احتشام اس انکشاف پر سانس روکے بیٹھا تھا۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر بعد اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔

''شانزے!...... میرا خیال ہے اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔'' اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''پھر اس کے بعد جب کائنات کی ہر شے پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا تھا، تب وہ سرِ راہ مجھے ملا تھا۔ سبز آنکھوں میں اُمید کے دیپ جلائے، کسی روشن صبح کی مانند تابناک...... اسے دیکھ کر بے یقینی کی دُھند رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ بے اعتباری کا موسم میرے وجود پر سے گزرتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے اردگرد بکھرے خود غرض لوگوں کے علاوہ کچھ ایسے جانثار بھی موجود ہیں جو ہنستے ہیں تو دوسروں کی خاطر، جو روتے ہیں تو دوسروں کے دکھ پر۔

وہ مجھے جینے کا ہنر سکھانے لگا۔ نم آنکھوں سمیت مسکرانے کا سلیقہ دیا۔ وہ مجھے کسی دیوتا کی طرح عظیم لگنے لگا تھا۔ جس کو دیکھنے کے لئے مجھے اپنا سر اونچا کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر یہ دیوتا اپنے اصل روپ کے ساتھ سامنے آیا تو میرے لئے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔'' میں نے طویل سانس لے کر ولید احتشام کو دیکھا۔

''ولید!...... کیوں کرتے ہیں لوگ ایسا؟...... اپنی ظاہری شخصیت میں جس قدر بلند نظر آتے ہیں، درحقیقت اتنے ہی پست کیوں ہوتے ہیں؟...... میری ماں اپنے حلقہ احباب میں ایک پُرخلوص عورت کے طور پر پہچانی جاتی ہے، اس نے تو ایک شخص کو قتل کیا ہے اور وہ...... جو سینکڑوں بچوں کا ''آفندی پاپا'' تھا، وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے۔ آخر ہم لوگ کیسے قتل کر دیتے ہیں انسانوں کو؟

کسی کی مسکراہٹ کو
دوسروں کی خوشیوں کو
اعتبار کو
مان بھرے رشتوں کو
دوسروں کی محبتوں کو

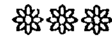
توقعات کو......

ولید احتشام! کیا مار ڈالنا، ختم کر دینا اتنا ہی آسان ہے؟''

میں نے ایک نا قابل فہم، نہ سمجھ میں آنے والا سوال اس کے سامنے رکھا تھا جس کا جواب شاید اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اسی لئے نظریں چرا کر طویل سانس لیتے ہوئے میرا ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔

''تم بہت تھک گئی ہو شانزے! اب تمہیں نیند کی ضرورت ہو گی۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس کیا تو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے بیڈروم میں آ گئی تھی۔ اور بہت دنوں بعد اس روز نیند کے دوران خوفناک چہرے مجھے ڈرانے نہیں آئے تھے۔



''تھینک گاڈ تم بستر سے تو اُٹھیں۔'' پھپھو کی خوشی سے معمور آواز سنائی دی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اس وقت لان میں بیٹھی ہوئی تھی جہاں نرم دھوپ اپنے سنہری پر پھیلائے ہوئے تھی۔ لیماس گراس کی خوشبو ہوا میں رچی بسی ہوئی تھی۔

اورنج ساڑھی میں پھپھو جاندار مسکراہٹ لئے میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

''میں تو بستر چھوڑ رہی تھی مگر بستر مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔'' میں نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ونیزہ کیسی ہے؟ اس کا فون نہیں آیا؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ فون بھی کئی مرتبہ کر چکی ہے۔ انجوائے کر رہی ہے وہاں پر۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر میں نے اسے یہ ہی کہا تھا کہ تم آج کل شہر سے باہر ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے نا وہ تم سے کتنی اٹیچ ہے۔ اگر ذرا سی خبر بھی ہو جاتی کہ تم بیمار ہو تو وہاں اس نے آسمان سر پر اٹھا لینا تھا۔ اور اب تم ٹھیک ہو تو خود اس سے بات کر لینا۔'' انہوں نے وضاحت سے بتایا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب تو تم ٹھیک ہو نا شانزے؟'' انہوں نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی پھپھو! ناؤ آئی ایم پرفیکٹ۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''چندا! تم کیوں اتنا ڈپریسڈ رہتی ہو؟ آخر وجہ کیا ہے......؟'' انہوں نے ہاتھ تھام کر ملائمت سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے تم ابھی تک ایمان حسن کی موت کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکیں۔ بلاشبہ وہ ایسا ہی انسان تھا مگر جانو! کہہ سن لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ فصیحہ سے نہیں کہنا چاہتیں تو

مجھ سے کہہ لیا کرو۔ آخر میں بھی تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔''

ہاسپٹل میں وہ مما کے ساتھ میرا نفرت بھرا گریز جان گئی تھیں، اسی لئے انہوں نے خود میرے دل میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔

ان کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لئے میں نے بات بدل دی تھی۔

''پھپھو! میں آپ کی طرف آنا چاہتی ہوں۔''

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر خوش دلی سے مسکرا دیں۔

''ٹھیک ہے، تم جب چاہو آ جانا۔ ونیزہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے گھر کافی سُونا ہو گیا ہے۔ تمہارے ساتھ ہمارا دل بھی بہلا رہے گا۔''

''میں آج ہی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔ مگر میں ذرا فصیحہ سے مل آؤں، گھر پر ہی ہے وہ؟''

''معلوم نہیں۔'' میں نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ جب کہ میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔

'بہت سے رشتے میرے اردگرد موجود تھے مگر میں دل کی بات کہنے سے گریز کرتی رہی۔ حتیٰ کہ ونیزہ سے بھی نہیں کہ جو بچپن سے میری سنگی ساتھی ہے۔ تو آخر میں نے کتھارسس کے لئے اس شخص کو ہی کیوں چنا، جس سے میرا کوئی خاص رشتہ نہیں، تعلق نہیں بلکہ کسی حد تک ناپسندیدگی کے زمرے میں ہی آتا تھا پھر......؟' میں نے گویا خود سے سوال کیا۔

'شاید اس وقت میں بہت زیادہ تھک گئی تھی، اس راز کو چھپانے کی کوشش میں نڈھال ہو کر رہ گئی تھی۔ اور کسی کمزور لمحے کی زد میں آ کر بکھرتی چلی گئی اور اس کے سامنے خود کو کھول کر رکھ دیا۔'

میں اپنے خیال سے اس وقت چونکی تھی، جب پھپھو نے قریب آ کر مجھے پکارا تھا۔ میں جھٹ کرسی سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لی تھی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی میری نظر اخبار پر پڑی تھی۔ غالباً داور انکل پڑھنے کے بعد گاڑی میں ہی چھوڑ گئے تھے۔ میں سرسری سی نظر فرنٹ پیج پہ ڈالنے کے بعد پلٹتی رہی تھی اور آخری صفحے پر خبر کے ساتھ لگی تصویر پہ میری نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ دل ایک دم سکڑ کر پھیلا تھا۔ پولیس کے نرغے میں عدالت کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے جمشید آفندی کی تصویر تھی۔ ہلکی سی شیو بڑھی ہوئی تھی اور سر جھکا ہوا تھا۔

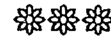
اور مجھے یاد آیا کہ اس کا سر تو ہمیشہ ہی جھکا رہتا تھا۔ میں نے کبھی اسے سر اٹھا کر چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظر ہمیشہ اس کے قدموں پر رہتی تھی۔ یوں جیسے وہ گن گن کر قدم اٹھا رہا ہو۔

'اور نہ جانے کیوں یہ سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود بھی مجھے لگتا ہے کہ تم بالکل بے گناہ ہو' میں نے اس کی تصویر پر ہلکا سا ہاتھ پھیرا تھا اور وہ آن کی آن میں اپنے ساحر سراپے سمیت میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''مس شانزے! چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔ خوش رہا کریں۔'' اس نے آخری مرتبہ تلقین کی تھی۔

'کیسے انسان تھے تم..... خوشیاں بھی جی بھر کر بانٹیں اور دکھ دینے میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔' میں نے دل ہی دل میں اس سے شکوہ کیا تھا۔

''کاش! میں صرف ایک بار تم سے مل سکتی۔ بہت کچھ پوچھنا تھا تم سے۔ ابھی بہت سے جواب تمہارے ذمے تھے۔ کاش!' میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا اور گاڑی سے باہر بھاگتی دوڑتی عمارتوں پر نظر ٹکا دی تھی۔



میں جوگرز پہن کر پھپھو کو بتا کر پیدل ہی گیٹ سے باہر آ گئی تھی۔ آج یونہی چہل قدمی کو دل چاہ رہا تھا سو دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میں کالونی کی سڑکوں پر ہی ٹہلنے لگی تھی۔ رہائشی علاقہ تھا سو رش وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ ایک دو مرتبہ پاس سے بھاگتے ہوئے بچے ہیلو کے انداز میں ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گئے تھے۔ میں یونہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہی تھی، جب اچانک کوئی میرے بالکل برابر آ گیا تھا۔ میں نے بے اختیار ہی گردن موڑ کر دیکھا۔

''ہیلو..... میں گھر گیا تو آنٹی نے بتایا، تم واک کرنے نکلی ہو۔ سو میں بھی پیچھے چلا آیا تھا۔'' یہ ولید احتشام تھا اپنے مخصوص انداز میں بولتا ہوا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھ کر نظروں کا زاویہ بدل دیا تھا۔

''ہاں، بس ایسے ہی باہر نکلنے کو دل چاہ رہا تھا اس لئے چلی آئی۔'' میں نے محسوس کیا تھا کہ اب پہلے کی طرح اس شخص کو نظر انداز کر دینا میرے لئے ممکن نہ رہا تھا کہ نادانستگی میں ہی سہی بہر حال وہ میرا راز دار بن چکا تھا۔

''گھر کب چل رہی ہو؟''

''فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' میں رک کر ایک کوٹھی کی دیوار سے باہر لٹکتے سنبل پھولوں کا گچھا توڑنے لگی تھی۔

''اچھا..... ویسے ڈیڈی بھی تمہیں مس کر رہے تھے۔ انہوں نے دانستہ خود کو اور مما کو تمہارے سامنے آنے سے روک رکھا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم انہیں ڈس لائیک کرتی ہو۔ مگر شانزے تم!

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ اتنے نائس مین کو ڈس لائیک کیسے کر سکتی ہیں؟''

''اگر میں اپنی ماں سے نفرت کر سکتی ہوں تو کسی دوسرے فرد کو ناپسند کرنا ناممکن بات تو نہیں۔'' پھول توڑنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے میں نے چڑ کر کہا۔

''ماں سے نفرت کا تو ایک ٹھوس جواز ہے۔ اگرچہ اس پر یقین کرنا کوئی آسان کام نہیں۔'' اس نے میرے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر ذرا سی کوشش کے بعد پھول توڑ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''مگر میرے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ بات تم نے کہی ہے۔ کیونکہ ماں کا رشتہ ایسا نہیں ہوتا کہ محض شک و شبے کی بنا پر اتنا بڑا الزام اس کے سر لگا دیا جائے۔ مگر ڈیڈی کے ساتھ تمہارا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''مسٹر ولید احتشام! یا تو آپ بہت معصوم ہیں یا پھر بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے قدرے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

''غالباً میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس روز جھگڑے کی بنیاد مما کا طلاق کا مطالبہ تھا۔ اور پاپا کی وفات کے محض چند ماہ بعد انہوں نے احتشام احمد سے شادی کر لی۔ گویا وہ ان کی وجہ سے پاپا سے طلاق چاہتی تھیں۔ اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پاپا کو مارنے کا پروگرام ان دونوں نے مل کر بنایا ہو۔''

میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے غالباً یہ بھول گئی تھی کہ میں اس شخص کے بیٹے سے مخاطب ہوں، جس پر قتل کا الزام لگا رہی ہوں۔

''واٹ..... اے جسٹ..... آفٹ۔'' وہ ایک دم میرے سامنے آ گیا تھا۔

''تم بہت غلط سوچ رہی ہو۔ اگر یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہوتی تو واقعے کی نوعیت کچھ اور ہوتی۔ جو کچھ تمہاری مما نے کیا وہ شدید غصے میں ایک اضطراری حرکت اور فوری ردعمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور میرا تو خیال ہے، شدید غصے میں ان کا دماغ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا ورنہ ڈائیورس عدالت کے ذریعے با آسانی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات ہے جو میرا خیال ہے وہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔'' وہ ایک گھر کے سامنے بنے گھاس کے سبز قطعے کی طرف بڑھا تو میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

''بات یہ ہے شانزے!'' وہ بہت اطمینان سے گھاس پر براجمان ہوا تھا۔ ''کہ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا تھا، جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ خاندان بھر نے ڈیڈی پر دوسری شادی کے لئے زور دیا مگر ڈیڈی نہ مانے اور مجھ سمیت اس ملک سے ہی نکل بھاگے۔ ایک طویل عرصے بعد جب ڈیڈی کو وطن اور اپنے لوگوں کی یاد آئی، تب ہم اپنا سارا بزنس وائنڈ اپ کر کے یہاں آ گئے اور

جب ہم لوگ یہاں آئے، اس وقت یہ خبر ہر طرف گردش کر رہی تھی کہ ''شان انڈسٹریز'' کے ایمان حسن وفات پا چکے ہیں۔ اور پھر پورے ایک ماہ بعد ایک رات انہوں نے مجھ سے کہا تھا مشہور بزنس مین ایمان حسن دو ماہ قبل وفات پا گئے تھے اور ان کا قابل اعتماد منیجر جو گزشتہ آٹھ سال سے ان کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس موقع پر کروڑوں روپے ہتھیا کر اپنے بیوی بچوں سمیت اس ملک سے فرار ہو چکا ہے۔ ایمان حسن کی بیوہ اور اس کی بیٹی اس وقت کرائسس میں ہیں۔ ڈیڈی نے کہا تھا، وہ فصیحہ بیگم اور ان کی بیٹی کو نہ صرف مالی بلکہ جذباتی سہارا بھی دینا چاہتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ تنہا رہنے کے بعد اگر ڈیڈی نے ایسی کوئی خواہش کی تھی تو ظاہر ہے مجھے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ سو میں نے ان کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اور اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تمہاری ماں نے جو کچھ کیا، اس میں ڈیڈی کسی طرح سے بھی انوالو نہیں تھے۔ انہوں نے تو بہت خلوص اور ایمانداری سے تم دونوں کا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔ کیا ہوا؟ کیا میری بات پر یقین نہیں آ رہا؟'' بات کے اختتام پر اس نے میری حیرت سے کھلی آنکھوں میں جھانکا۔

''اگر تمہیں میری کوئی بات ناقابل یقین لگے تو تم کسی سے بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہو۔ ونیزہ سے، آنٹی سے، داور انکل سے یا آفس کے کسی بھی ورکر سے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔''

اور میں کسی سے تصدیق کیا کرواتی؟ میرا تو یہ سن کر ہی سر جھک گیا تھا کہ جس دولت کو مما باپ کی کمائی سمجھ کر اُڑا رہی تھی، وہ درحقیقت اس شخص کی ہے، جس کی ہر محبت کے جواب میں مما نے نفرت جتائی تھی۔

''اور پلیز...... تم یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر کوئی احسان جتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنی اور ڈیڈی کی پوزیشن کلیئر کرنے کے لئے مجھے یہ فیکٹ تمہیں بتانا پڑا۔'' وہ ایک اچھے دوست کی طرح میری دلجوئی کر رہا تھا۔

''اب چلیں واپس؟'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مجھے چونکایا تو میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا بات ہے؟..... اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہو؟'' اس نے قدرے جھک کر میرا چہرہ کھوجا۔

''میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارا کاروبار بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا یا پھر مکمل طور پر ڈوب گیا تھا اور میرے ڈیڈی نے اسے کنارہ دیا تھا۔ بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ منیجر کروڑوں روپے لے کر بھاگ گیا تھا اور باقی جو کروڑوں روپیہ کاروبار میں لگا ہوا تھا، ڈیڈی نے اسی میں کچھ انویسٹمنٹ کی تھی۔ آج سارا کاروبار ففٹی ففٹی کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ اور اتنا ہی تمہارا ہے جتنا ہمارا۔'' اس نے دل میں گڑا آخری کانٹا بھی بڑے سبھاؤ سے نکالا تھا۔

''کوئی اور بات کھٹک رہی ہو تو بلا جھجک کہہ ڈالو۔ بیلیو می، میرے پاس تمہارے ہر سوال کا جواب موجود ہو گا۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا اور میں نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

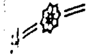
گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی میری نظر مما پر پڑی تھی جو پھپھو کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا مگر وہ فوراً اُٹھ کر میری طرف بڑھی تھیں۔

''شانزے ڈیئر!...... لسن می پلیز۔''

''ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتی۔'' میں نے ناگواری سے کہا تھا۔ ولید راستے میں ہی رک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ مگر وہ نظر انداز کر گئی تھیں۔ انہیں بے تابانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ اور پھر تقریباً بھاگ کر میں برآمدے سے ہوتی ہوئی کمرے میں آ کر بند ہو گئی تھی۔



پرندے لوٹ آئیں تو......
کسی دن پوچھنا ان سے
کہ اپنے گھونسلے سے برہنہ پا
اور ننگے سر نکلنے سے
اماں اور عافیت کا
کوئی اِک دروازہ کھلنے تک
کہو کتنے زمانے
اور کتنے فاصلے درپیش ہوتے ہیں
کبھی زخمی پروں والے پرندے
لوٹ آئیں تو
یہ ان سے پوچھنا
بولو!
ہوا کے سنگ دل دریا کی
خوں آشام لہروں میں
تم اپنے پنکھ چپو
کس طرح حرکت میں رکھتے تھے



کبھی یہ پوچھا ان سے
کہ جب تم آگ برساتے ہوئے سورج کی
تپتی زد پہ ہوتے تھے
تو پھر تم اپنے جسموں کو
لہو کی کون سی برفاب قوت کے سہارے
سرد رکھتے تھے
پرندے لوٹ آئیں تو
کسی دن پوچھنا ان سے
مگر ٹھہرو......
کسے معلوم، جانے والے اپنی واپسی پر
کس قدر مختار ہوتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ لوٹنے سے قبل
ان صابر پرندوں کا
کسی دم
خاک دخوں میں لوٹنا مقسوم ٹھہرا ہو
تو پھر سوچو
کہ تم یہ ساری باتیں
کس سے پوچھو گے؟

جمشید آفندی کا خط میرے سامنے کھلا پڑا ہے اور آنسو لکیر کی صورت میرے گالوں پر بہتے جا رہے ہیں۔ آج مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ چلتے ہوئے بھی اس کا سر جھکا کیوں رہتا تھا۔

جب لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر اسے دعائیں دیتے تھے تو سبز آنکھوں میں ایک اضطراب کیوں چھلکنے لگتا تھا۔

نیکی اور فلاح کے ڈھیروں کام کرنے کے باوجود وہ مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا۔
اور آج مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ مستان شاہ کون تھا؟ آفندی کا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا
اور مستان شاہ کے ساتھ برہنہ پا، ہاتھ میں کشکول لئے بھیک مانگنے والا بچہ کون تھا؟
میں نے خط دوبارہ پڑھنے کے بعد تہ کر لیا تھا اور اپنے آنسو ہتھیلی سے پونچھ ڈالے تھے۔

اور وہ بے گناہ ہی تو تھا...... نہ جانے کتنے جمشید آفندی اس سسٹم کا شکار ہو کر سزاوار ٹھہریں گے۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو عاصم آیا تھا۔ وہ بہت غمگین لگ رہا تھا۔

''اخبارات، آفندی صاحب کے خلاف زہر اُگل رہے ہیں۔ ہر کوئی اُنہیں تضحیک کا نشانہ بنا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں، ان کا دل آج بھی اتنا ہی خوب صورت ہے، میری نظر میں وہ آج بھی اتنے بلند ہیں جتنے پہلے تھے۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ اپنی معصومیت میں وہ ایک ایسی دلدل میں دھنس گئے تھے کہ اس سے نکلنے کی کوشش میں وہ مزید اندر دھنستے چلے گئے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں مس شانزے ایمان! کہ انہوں نے دوسروں کے لئے جو بھی کام کیا، اس میں ذرّہ بھر کھوٹ نہیں تھی۔'' دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کئے وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

''کیا ہم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے عاصم؟'' میں نے نہ جانے کس اُمید کے تحت اس سے پوچھا تھا۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا تھا۔

''نہیں مس شانزے! وہ اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقرار کر چکے ہیں۔ انہوں نے ہر اس فرد کو عیاں کیا ہے، جو اس کاروبار میں ان کے ساتھ شریک تھا اور جن پر ہاتھ ڈالنے سے قانون ڈرتا تھا۔''

''اور ''دارالاطفال''...... وہاں کے سب بچے؟'' میرا دل بھر آیا تھا اس بھرے پرے دارالاطفال کو یاد کر کے۔

''آپ بے فکر رہیے۔ اِنشاء اللہ بہت جلد پرندے اپنے آشیاں میں لوٹ آئیں گے۔'' اُس نے اُمید بھرے لہجے میں کہا تھا اور میں نے دل ہی دل میں پوری شدت سے ''آمین'' کہا تھا۔



ہال کمرے میں رنگ و نور کا ایک سیلاب سا اُمڈا ہوا تھا۔ فانوس کی تیز روشنی میں خواتین کے چہرے دمک رہے تھے۔ اپنی ذات و زیبائش کی نمائش میں ایک دوسرے کو مات دیتی ہوئی خواتین حُسن و نزاکت کے مجسموں کی صورت اپنی اپنی جگہ ایستادہ تھیں۔ باتوں کی بھنبھناہٹوں کے درمیان کبھی کبھار کوئی ہلکا سا نسوانی قہقہہ ماحول کے ہلکے پھلکے ارتعاش میں بہت نفیس سی ہلچل مچا دیتا تھا۔ مرد حضرات ایک دوسرے کی کاروباری مصروفیات کو جاننے اور ٹوہ لینے میں منہمک تھے۔ کون نئی انڈسٹری لگا رہا ہے؟ کس نے ٹیکس جمع کروایا؟ اور کس کا دھندا آج کل مندا جا رہا ہے؟

میں ہال کے ایک کونے میں کھڑی یہاں موجود ایک ایک فرد کا بھرپور جائزہ لے چکی تھی اور بوریت کی آخری منزل تک پہنچ چکی تھی۔

کتنا منع کیا تھا میں نے پھپھو کو مگر ان کی خواہش تھی کہ میرے صحت مند ہونے کی خوشی میں ایک زبردست قسم کی پارٹی دی جائے..... نتیجتاً چہرے پہ صحت مندی کا تاثر دیتی بھرپور مسکراہٹ سجاتے سجاتے میں تھک گئی تھی۔

کتنا مصنوعی پن تھا اس سارے کے سارے ماحول میں۔ میں نے چڑ کر بڑے سے بڑے دوپٹے کو بمشکل کندھے پر سیٹ کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

سرسراتے ہوئے ریشمی آنچل

کافی اور سگار کی ملی جلی خوشبو

طرح طرح کے پرفیومز

امپورٹڈ جیولری

اس سارے ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں باہر جانے کے لئے صوفوں کی عقبی سائیڈ سے گزر رہی تھی، جب اچانک مما میرے سامنے آگئی تھیں۔

''شانزے پلیز! کچھ دیر رُکو۔'' انہوں نے میرا بازو تھام کر مجھے روک لیا تھا۔

''آخر مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟'' میں نے سرسری سی نظر اطراف میں ڈالی اور کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔

''تم..... تم گھر کب آ رہی ہو؟..... دیکھو اتنے دن ہو گئے تمہیں یہاں آئے ہوئے۔ اور اصولاً تو یہ پارٹی بھی ہمیں اپنے گھر میں ارینج کرنی چاہئے تھی۔ آخر سب لوگ کیا سوچتے ہوں گے؟'' انہوں نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے انہیں غور سے دیکھا۔ انہوں نے آئی لائنر اور مسکارے سے سجی آنکھیں چرا لی تھیں۔

''میرا خیال ہے، ان لوگوں کے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا کہ وہ ان چھوٹی موٹی باتوں کی پروا کرتے پھریں۔ اور یوں بھی میں یہاں بہت خوش ہوں۔'' میں نے انہیں پیچھے ہٹا کر آگے بڑھنا چاہا مگر انہوں نے میرا بازو جیسے دبوچ لیا تھا۔

''احتشام!..... شامی!'' انہوں نے فوراً پلٹ کر احتشام احمد کو پکارا تو میں دانت پیس کر رہ گئی۔

''آپ خوامخواہ کیوں یہاں تماشا بنا رہی ہیں؟'' میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

''احتشام! اسے کہو نا، اب گھر واپس چلے۔'' انہوں نے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔ انہوں نے حیرت سے ایک نظر مما پر ڈالی اور دوسری مجھ پر، پھر خوش دلی سے مسکرا دیئے۔

''بھئی کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہماری بیٹی کا دل چاہے گا، تب آ جائے گی۔'' انہوں نے جیسے میرا موڈ درست کرنے کی کوشش کی اور پھر مما کو دوسری طرف متوجہ کیا۔ ''وہ دیکھئے! مسز شہریار آپ کو بلا رہی ہیں۔''

مما مجبوراً ہونٹ کاٹتی ہوئی اس طرف چل دی تھیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

''ان فیکٹ ہم دونوں تمہیں بہت مس کرتے ہیں..... گھر پہ تو تم پہلے بھی کم ہی نظر آتی تھیں مگر پھر بھی یہ احساس تو رہتا تھا کہ تم گئی ہو اور تمہیں لوٹ کر آنا بھی ہے۔ بہرحال میں مجبور نہیں کروں گا۔ جب دل چاہے، چلی آنا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ہولے سے میرا سر تھپتھپایا تھا اور میں نے شاید پہلی مرتبہ ان کے لہجے کی شفقت کو محسوس کیا تھا۔ جبھی میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور پھر ان کے قریب سے ہو کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔

''اُف.....'' باہر کے کھلے ماحول میں آ کر میں نے کھل کر سانس لیا تھا اور ہائی ہیل کے سینڈلز اُتار کر شبنمی گھاس پہ چلتی ہوئی لان کے بالکل آخری کونے میں آ گئی تھی۔

یہاں کا ماحول اندر کی نسبت بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ چاند کی چودھویں رات تھی اور بے حد اُجلی نکھری چاندنی میں گھاس پر پڑے شبنم کے قطرے موتیوں کی صورت چمک رہے تھے۔ ہوا میں سبز گھاس کی مہک اور بہت سے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ موسم بہت خوشگوار اور ہوشربا تھا۔ ہال کمرے میں باتوں اور مدھم موسیقی کی آواز مجھے یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ ٹیوب لائٹس کی سفید دودھیا روشنی شفاف دریچوں سے باہر آنے کو بے تاب تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس ماحول کو پوری طرح محسوس کرنا چاہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد قریب ہی کوئی آہٹ اُبھری تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مگ لئے اسی طرف آ رہا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں اس کا دراز قد خنک چاندنی میں بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔

''اتنی الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہو؟'' اس نے قریب آ کر کافی کا مگ میری طرف بڑھایا۔

''بس یونہی..... وہاں سخت بور ہو رہی تھی میں۔'' میں نے ایک نظر کافی سے اُڑتی بھاپ کو دیکھا۔

''حالانکہ یہ پارٹی صرف تمہارے لئے دی گئی ہے۔''

''ہاں مگر مجھے اس قسم کی پارٹیز بالکل بھی اٹریکٹ نہیں کرتیں۔'' میرے لہجے میں خودبخود اکتاہٹ غالب آ گئی تھی۔

''اچھا..... پھر کیا اٹریکٹ کرتا ہے تمہیں؟'' اس کے انداز میں خاصی دلچسپی تھی۔

''مجھے ہر وہ چیز پسند ہے ولید احتشام! جو فطرت سے بے حد قریب ہو، بالکل خالص پاک، کسی بھی کھوٹ اور ملاوٹ سے مبرا۔''

"مثلاً؟" اس نے پوچھا۔

"مثلاً بچے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اور ان کے چہروں پہ ثبت بے ریا مسکراہٹ بے حد اٹریکٹ کرتی ہے۔ اور اُبھرتی ہوئی صبح مجھے بہت پسند ہے...... پھولوں سے پھوٹتی خوشبوؤں کی میں دیوانی ہوں...... چاندنی رات کا حُسن مجھے اپنے طلسم میں جکڑ لیتا ہے اور سیاہ رات کے سینے پر جگر جگر کرتے چاند سے مجھے بے حد محبت ہے۔"

میں نے ایک جذب کے عالم میں سر اٹھا کر آسمان پر روشن چاند کو دیکھنا چاہا۔ میری نظر عین ولید احتشام کے چہرے پہ جا کر ٹھہر گئی تھیں۔ چاند اس کے لمبے چوڑے وجود کے پیچھے چھپ کر رہ گیا تھا اور چاندنی اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"آہم...... محترمہ! آپ شاید بھول رہی ہیں، میرا نام ولید احتشام ہے۔" اس نے ذرا کھنکار کر شرارت سے کہا تو میں مسکرائے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"سب کچھ تو تم نے کہہ دیا مگر ایک بہت اہم چیز تم بھول رہی ہو۔" اس کے کہنے پر میں لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئی تھی اور پھر استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"انسان...... اس کائنات کی اہم ترین مخلوق...... جو بیک وقت چاہنے اور چاہے جانے کے لئے انتہائی موزوں ہستی ہے......" اُس کی یاددہانی پر میں سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔

"خاصے خوش فہم لگتے ہیں آپ۔" میرے لہجے میں خود بخود طنز کی آمیزش ہو گئی تھی۔ "انتہائی موزوں ہستی کو خوب پرکھ چکی ہوں میں۔ دھوکا، فریب، ریاکاری، دوغلا پن، مفاد پرستی، ہر چیز اندازے سے بڑھ کر پائی ہے میں نے اس سانس لیتے پتلے میں......" میرے تجربات کا میرے الفاظ میں گھلا ہوا تھا۔

"نہیں شانزے!...... اس نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے فوراً میری بات کو رد کیا تھا۔ "دو انسانوں کے تناظر میں تم پوری انسانیت کو جاننے اور پرکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ہاں یہ بدقسمتی تھی کہ تمہیں پے در پے ان دو واقعات کا سامنا کرنا پڑا، جن کے ذمہ دار افراد تمہاری میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ مگر ان دو افراد کی وجہ سے تم ان تمام اچھے انسانوں سے صرفِ نظر کر سکتیں جو آج بھی تمہارے اردگرد موجود ہیں۔ مثلاً "دارالاطفال" کے باقی تمام ورکرز، میں تمہارے دوست، ونیزہ اور آنٹی جیسے رشتے دار۔"

"یہ سب لوگ اسی لئے اچھے ہیں کہ ابھی ان کی شخصیت کا پردہ چاک نہیں ہوا۔ چہروں پر نقاب جوں کے توں موجود ہیں۔ کل یہ لوگ کس چہرے کے ساتھ ہمارے گے، یہ ہم آج نہیں جان سکتے۔"

میں بے اختیار ہی اسے ٹوک بیٹھی تھی۔ میری بات پر اس کے چہرے پہ ناگواری کا ہلکا سا تاثر ابھر آیا تھا۔

"دیکھو شانزے! انسان کوئی کمپیوٹر نہیں کہ کھٹا کھٹ وہی جذبات ظاہر کرے، جو ہم لوگ چاہتے ہیں...... ہر بات پر وہی رسپانس دیں جو ہماری ڈیمانڈ ہے۔ انسان کے سینے میں دل بھی ہے اور سر میں دماغ بھی۔ اور اس دل و دماغ میں وہ منفی و مثبت سوچ بھی رکھتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے وہ عمل بھی کرتا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم دوسروں کی منفی سوچ کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں یا اسی منفی سوچ سے کوئی پلس پوائنٹ اخذ کرتے ہیں۔ تم نے خود پر حد درجہ مایوسی اور قنوطیت طاری کر لی ہے جو کہ بالکل غلط بات ہے۔ اپنے آس پاس بکھرے لوگوں کو غور سے دیکھو، ان کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ کون غلط ہے، کون درست...... اس کا فیصلہ تمہارا دل کرے گا...... آج یا کل کا انتظار کئے بغیر...... اوکے۔" اس نے اپنی بات ختم کر کے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اب میں چلتا ہوں...... مگر تم میری بات پر غور ضرور کرنا...... ٹھیک ہے۔"

وہ اُٹھ گیا تھا اور میں اس کی باتوں کو "فضول" قرار دیتے ہوئے بچی کھچی کافی حلق میں انڈیلنے لگی تھی۔



"بھئی کل حماد کی والدہ نے تو مجھے اچھا خاصا پریشان کر کے رکھ دیا۔" ناشتے کی میز پر پھپھو نے کہا تو میرے ساتھ ساتھ دادا اور انکل بھی چونک گئے۔

"کیوں، کیا ہوا؟" انکل نے اخبار ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کہہ رہی تھیں کہ ان کی ساس یعنی حماد کی دادی کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی ہے اور وہ اس بات پر اصرار کر رہی ہیں کہ جلد از جلد ان کے اس چھوٹے اور لاڈلے پوتے کے سر پہ سہرا سجا دیا جائے۔ اور حماد کی والدہ اس بات پر مصر تھیں کہ ہم شادی کے بارے میں ذرا سنجیدگی سے غور کریں تاکہ وہ اپنی بہو کو اپنے گھر لے جا سکیں۔"

"ہاں تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ونیزہ ہمارے پاس ان کی امانت ہی تو ہے...... جب چاہیں لے جائیں۔" پھپھو کی بات کے اختتام پر انکل نے نہایت مطمئن انداز میں کہا تو وہ گہری سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ بھئی اس کا ماسٹرز ادھورا رہ جائے گا...... اتنی جلدی ہم کیسے کر سکتے ہیں اس کی شادی؟" میری طرف سے کوئی رسپانس نہ پا کر وہ دوبارہ انکل کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"لیلیٰ بیگم! وہ کوئی بیک ورڈ فیملی تو ہے نہیں...... شادی کے بعد ماسٹرز تو کیا، پی ایچ ڈی بھی

کی جا سکتی ہے۔ کیوں شانزے؟'' انہوں نے نیپکن سے منہ اور ہاتھ صاف کرتے ہوئے مخاطب کیا۔

''اس سلسلے میں ونیزہ کی رائے زیادہ اہم ہے انکل! اور اس کے بعد جو آپ چاہیں۔ مگر ایک بات ہے کہ اگر حماد کی دادی محترمہ کی زندگی میں یہ خوشگوار واقعہ ہونا ہوا تو انہیں اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا، جب تک یہ شادی ہو نہ جائے۔ اور اگر نہیں تو پھر بھلے آپ جتنی جلدی مرضی کر لیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔'' میرے کہنے پر انکل مسکرا دیئے تھے۔ جبکہ پھپھو نے فوراً سرزنش کی تھی۔

''خدا انہیں پوتے کی خوشیاں دیکھنی نصیب فرمائے۔ خیر اس بات کو اب گول کرو اور یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

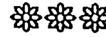
''کیوں داور! ان دونوں دوستوں کو ایک ساتھ رخصت نہ کر دیں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ فصیحہ سے بات کرتے ہیں۔ اگر اس کے پاس کوئی ڈھنگ کا پرپوزل نہ ہوا تو ہم خود اپنی بیٹی کے لئے حماد جیسا ہی کوئی سپر سیر بندہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔'' انکل مسکرا کر کہتے ہوئے اُٹھ گئے تھے۔

''شانزے! اس بات کو محض مذاق مت سمجھنا...... میں واقعی سنجیدہ ہوں۔ اور اگر اس سلسلے میں تمہارا اپنا کوئی انتخاب ہو تو تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہو۔'' ان کی بات سن کر میں نے بہت اطمینان سے فریش اورنج جوس ختم کر کے کہا تھا۔

''پھپھو!...... شادی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ یہ تو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہے۔ جس میں اسے اپنا وجود ہی نہیں، اپنے خواب، خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں بلکہ زندگی تک بڑے بھرے مان اور اعتبار کے ساتھ داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔ اور اگر اس جوئے میں شکست انسان کا مقدر بن جائے نا تو پھر وہ زندہ نہیں رہتا، صرف سانس لیتا ہے...... جیسے پاپا نے اپنی زندگی کے چوبیس سال صرف سانس لیتے ہوئے گزارے تھے۔ اور پھپھو! مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ یہ جوا کھیلنے کے لئے کسی فرد پر اعتبار کر سکوں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اس بات کو سنجیدگی کی بجائے مذاق ہی رہنے دیں۔''

میں بہت نارمل انداز میں کہہ کر، کرسی دھکیل کر اُٹھ گئی تھی اور میرے کمرے میں داخل ہونے تک پھپھو کی پُرسوچ، متفکر نظریں میرا تعاقب کرتی رہی تھیں۔



''شانزے ڈیئر!...... یہ تم ہی ہو نا؟'' ریسیور اٹھا کر ہیلو کہتے ہی جو بے تاب سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی، اسے سننے کے فوراً بعد مجھے ریسیور رکھ دینے کا خیال ہی آیا تھا مگر

دوسری طرف میرے ارادے کو غالباً بھانپ لیا گیا تھا۔

''پلیز شان! فون بند نہ کرنا۔ پلیز ایک مرتبہ میری بات سن لو۔'' مما کا لہجہ مخصوص تمکنت سے عاری تھا۔ میں ریسیور رکھتے رکھتے ایک لمحے کو ٹھہری سی گئی تھی۔

''جانو!...... تم گھر کیوں نہیں آتیں؟...... مجھ سے ملتی کیوں نہیں؟...... کتنے دن ہو گئے، میں نے تمہیں دیکھا تک نہیں، تم سے بات تک نہیں کی شان! مجھے اس طرح سے اذیت مت دو۔'' وہ نڈھال لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

'ہاں۔ اذیت دینے کا حق تو صرف آپ کو ہی حاصل ہے۔' میں دل کی بات ہونٹوں تک نہیں لائی تھی۔

''میں کتنی بار لیلیٰ کی طرف آئی ہوں مگر تم نظر ہی نہیں آئیں۔''

'نظر تو میں آپ کو اس وقت بھی نہیں آتی تھی، جب میں آپ کے چاروں طرف موجود ہوتی تھی۔'

''کہاں ہوتی ہو آج کل؟...... یونیورسٹی تو تم جاتی نہیں ہو اور...... اور تم گھر بھی نہیں آتیں۔ شانزے پلیز گھر لوٹ آؤ نا۔'' انہوں نے جیسے التجا کی تھی۔

''ہاسپٹل میں تم نے جس طرح مجھ سے بی ہیو کیا تھا، میں سب کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ رہی سہی کسر تم اب پوری کر رہی ہو۔ ہر آنے جانے والا مجھ سے تمہارے متعلق پوچھتا ہے۔ آخر تم کب آؤ گی؟...... شانزے! اگر تم کہو تو میں خود تمہیں لینے آ جاتی ہوں۔ مگر پلیز ایسے مت کرو۔''

'اوہ...... تو لوگوں کا خوف آپ کو میری طرف پلٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔'

''ہیلو...... شانزے! تم سن رہی ہو نا؟...... دیکھو صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں...... مجھے ایک موقع تو دو...... آخر میں تمہاری ماں ہوں شانزے!'' نہ جانے کیوں مجھے ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی سی محسوس ہوئی تھی۔

'اور یہ آخری بات ہی تو مجھے مار ڈالتی ہے...... کہ آپ میری ماں ہیں۔'

''ہیلو...... شان! تم بول کیوں نہیں رہیں؟ میری بات تو سن رہی ہو نا؟...... ہیلو! ہیلو!'' وہ پکارتے ہوئے بار بار کریڈل دبانے لگی تھیں اور میں نے چپکے سے ریسیور رکھ دیا تھا اور بالکل غیر ارادی طور پر میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔



آسمان کو اپنی آغوش میں لیتے طویل قامت درخت نہر کے پانیوں پر جیسے جھکے آ رہے تھے۔

نیم خوابیدہ سبز پانی اس وقت گہرے سکوت کی زد میں تھا۔ نم آلود، خنک سرسراتی ہوئی ہوا سرچڑھی
کے سنگ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

ماحول پر ایک عجیب خواب ناک سی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی اوٹ سے جھانکتے
سورج کی سنہری کرنیں عالم مدہوشی میں اس آبی فرش پر محوِ رقص تھیں۔ سفید پرندے ڈار کی صورت
نہر کے کنارے پر اُترے تھے اور اس سنہری پانی میں ڈبکی لگا کر دوسری سمت پرواز کر گئے تھے۔
میں نہر کے کنارے پر ایک درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور بے خیالی میں
اپنے آس پاس لگی گھاس کو نوچ رہی تھی۔ تبھی عقب میں گاڑی رُکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
اور گاڑی سے اُترتے شخص کو دیکھ کر میں اپنی بے تحاشا حیرت پر قابو نہ پاسکی تھی۔

'کمال ہے...... یہ شخص ہر اس جگہ یا تو پہلے ہی موجود ہوتا ہے، یا بعد میں آن وارد ہوتا ہے
جہاں میری موجودگی کے قوی امکان ہوں۔ اور اس کے باوجود یہ جاسوسی فلموں کا ہیرو بننے سے
انکاری ہے۔'

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف آیا تھا اور میرے عین سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اس کی
سیاہ چمک دار آنکھیں میرے چہرے پر ٹکا کے۔ میں منتظر ہی رہی کہ وہ کچھ کہے گا مگر وہ ہونٹ بھینچے
گہری نگاہوں سے میرے چہرے کو کھوج رہا تھا اور حقیقتاً میں اپنی تمام تر بولڈنیس کے باوجود اس کی
پُرتپش نگاہوں سے گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''کیوں تنگ کرتی ہو شانزے!'' بات کرنے کے باوجود انداز جوں کا توں تھا۔

''واٹ؟...... مَیں تنگ کر رہی ہوں یا......'' میں نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آخر تم کیوں اس طرح سے چھپتی پھر رہی ہو، جیسے مجرم کوئی اور نہیں، تم ہو۔''

اس کے کہنے پر ہی میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ پائی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے پھپھو
کے گھر مما کو داخل ہوتے دیکھا تو میں چپکے سے عقبی دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔ میں جانتی تھی
مما اپنی ساکھ کی بحالی کے لئے میرے سامنے ملتجی انداز اختیار کریں گی۔ اور میں ان کے سامنے کسی
طور نرم نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اسی لئے ان کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ میرے اور ان کے
درمیان جو خلیج حائل ہو چکی تھی، اسے پاٹنا کم از کم میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ تو پھر ان کا سامنا کر
کے دوسروں کو خود پر ہنسنے کا موقع کیوں دیتی؟

''اب کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟'' وہ استفسار کر رہا تھا۔

''کیوں بولوں؟'' میں نے اپنے سامنے کی گھاس نوچنی شروع کر دی تھی۔

''یہی کہ اس طرح کب تک چلے گا؟ وہ تمہاری ماں ہیں شانزے! تم ان سے اس طرح

لاتعلقی اختیار نہیں کر سکتی ہو۔'' اس نے مجھے کسی حقیقت سے آشنا کرانا چاہا تھا۔

''واٹ ڈو یو مین ولید احتشام؟ تمہارا خیال ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ان کے سینے سے جا
لگوں اور کہوں کہ ڈیئر مام! آج سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔'' میں
نے بگڑ کر کہا تھا۔

''میں نے یہ کب کہا؟'' اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

''تو پھر ایف آئی آر درج کرواؤں ان کے خلاف؟ عدالت میں گھسیٹ لوں انہیں؟......
پھانسی کے تختے پر لے جاؤں انہیں یا پھر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتاؤں کہ میری ماں قاتل ہے......
یا پھر اپنی ہی جان پر کھیل جاؤں۔'' میں سخت غصے میں آ کر پھٹ پڑی تھی۔

''پلیز کول ڈاؤن شانزے! میں نے تمہیں ایسا کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا۔'' اطمینان ہنوز اس
کے انداز پر غالب تھا۔

''تو پھر ان سارے حالات سے فرار حاصل نہیں کروں تو پھر کیا کروں؟'' میں نے پلکیں
جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔

''تم...... تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔'' اس نے اعتماد سے کہہ کر مجھے ہر بات بھلا دی
تھی اور میں ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھے گئی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں شانزے! تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔ میں اس کے
بدلے تمہیں ہر وہ خوشی دوں گا، جس پر میرا ذرا سا بھی اختیار ہوا۔ دیکھو شانزے ایمان حسن! یہ جو
شاہراہِ حیات ہے نا، اس پر انسان اپنی مرضی سے سفر کا آغاز نہیں کرتا اور نہ سفر کا اختتام اس کی منشاء
کے مطابق ہوتا ہے۔ اسے تو بس ایک ان دیکھی ڈور ہے جو ان راستوں پر چلا رہی ہے۔ اور اسے
اس شاہراہ کے ہر اجنبی موڑ، اجنبی راستے پر اعتبار کرنا ہے اور کٹھن راستے پر سفر کرنے کے لئے ہر
مسافر کو ایک ہم سفر کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور تم بھی یہ سفر تنہا نہیں کاٹ
سکو گی۔ تمہیں کسی نہ کسی فرد پر اعتبار کرنا ہو گا تاکہ جب تم تھک جاؤ تو وہ تمہاری تھکن سمیٹ سکے۔
اندھیرے تم پر غالب آنے لگیں تو وہ جگنو بن کر تمہارے ساتھ سفر کرے۔ اس سفر کی صعوبتیں
تمہارے پیروں پر آبلوں کی صورت ظاہر ہوں تو اس کا محبت بھرا لمس تمہیں اذیت سے نجات دلا
دے۔ اور ایسے کسی ہم سفر کی تلاش تمہیں باہر نہیں، اپنے دل کے اندر کرنی ہوگی جو اپنے فیصلوں پر
آپ مختار ہے۔ جو ان دیکھے، اَن جانے جذبوں کو محسوس کرنے پر قادر ہے۔''

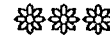
''مجھے نہیں معلوم شانزے! میں تم سے محبت کرتا ہوں یا عشق مگر میرے دل میں تمہارے لئے
جو جذبہ ہے، وہ مجھے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنے نہیں دیتا۔ میں اپنے اس جذبے کو ایک ہزار

ایک تشبیہات دے سکتا ہوں مگر دوں گا نہیں۔ میں محبت بھرے ڈائیلاگز بھی بول سکتا ہوں مگر
وقت کچھ کہوں گا نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں تمہیں اپنے حق میں کنوینس کرنا چاہتا
ہوں۔ اس لئے میں تمہیں صرف ایک آپشن دے کر جا رہا ہوں، اپنی صورت میں۔ تم میرے
بجائے کسی اور کو یہ اعتبار بخشو گی تو بھی مجھے اس بات کی خوشی ضرور ہوگی کہ راہِ حیات میں تم تنہا نہیں
ہوگی۔"

دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے میری کھلی ساکت آنکھوں میں جھانکا
تھا اور پھر کوئی رسپانس نہ پا کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں منتظر رہوں گا شانزے! کیونکہ دسمبر کے آخری ہفتے میں پیرس جا رہا ہوں۔ اور اگر تم اس
وقت تک کوئی فیصلہ نہ کر پاؤ تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ راہِ حیات پر میں تمہارا انتظار بہت دور تک
کر سکتا ہوں۔"

وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے پلٹ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے کتنے ہی
چھوٹے بڑے کنکر نہر کے ساکت پانیوں میں گر کر ارتعاش پیدا کر گئے تھے۔ سبز پانی میں کتنے ہی
دائرے بنتے چلے گئے تھے اور میں اپنی جگہ ساکت بیٹھی ان دائروں کو دیکھ رہی تھی۔ ولید اختشام ایسا
ہی ارتعاش میرے دل میں پھیلا گیا تھا اور اب ایسے ہی دائرے میرے وجود میں وسعت اختیار
کرتے جا رہے تھے۔



"کون غلط ہے، کون درست..... اس کا فیصلہ تمہارا دل کرے گا۔ آج یا کل کا انتظار کئے بغیر
ہم سفر کی تلاش تمہیں باہر نہیں، اپنے دل کے اندر کرنی ہوگی...... جو اپنے فیصلوں پر آپ مختار ہے
جو اَن دیکھے، اَن جانے جذبوں کو محسوس کرنے پر قادر ہے۔"

کتنا درست کہا تھا اس نے۔ یہ دل وہی تھا، جو ارادہ کئے بیٹھا تھا کہ اب کسی پر اعتبار نہیں
کرے گا اور اب جو فیصلہ کیا تھا تو ایک پل بھی نہیں لگا تھا۔

یا شاید فیصلے کی بھی کوئی گھڑی کاتب تقدیر نے لکھ چھوڑی ہے اور پنڈولم کی طرح "ہاں"
"ناں" کے درمیان ڈولتا ہوا انسان اس گھڑی پر ایک لمحے کے لئے ساکت ہو جاتا ہے اور یہ دل
اپنا فیصلہ سنا کر تقدیر کے لکھے پر تصدیق کی مہر ثبت کر دیتا ہے اور اپنے دل کی آواز سن کر میں نے
بھی یہ ہی سوچا تھا۔

'شاید اسے بھی عادت ہوگئی ہے دھوکا کھانے کی اور دھوکا کھانے سے پہلے اعتبار کرنا تو
ہے۔ سو یہ دل اعتبار کر رہا ہے۔'

رات کے دوسرے پہر دل نے یہ مژدہ سنایا تھا اور میں نے اسی لمحے ریسیور اٹھا کر ولید
اختشام کے نمبر ڈائل کر دیئے تھے۔ دوسری جانب ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔
"ہیلو۔" نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز سنائی دی تھی اور اس آواز کے پیچھے رات کا محسوس کیا
جانے والا سناٹا تھا۔

"ہیلو..... ہو از دِس؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد استفسار کیا گیا تھا۔

"سنو ولید اختشام!..... پیرس جانے کے لئے ایک کی بجائے دو ٹکٹ لے لینا۔ نیکسٹ ویک
میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا تھا۔ دوسری جانب ایک لمحے کی
خاموشی چھا گئی تھی جس سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

اور پھر چند روز بعد میرون اور فان کلر کے لہنگے میں قد آدم آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے
ہوئے میں نے ونیزہ کو بتایا تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے میں شانزے ایمان سے شانزے ولید ہوگئی
ہوں تو کچھ دیر سکتے میں رہنے کے بعد وہ اس زور سے چیخی تھی کہ مجھے کانوں کے پردے پھٹتے
ہوئے محسوس ہوئے تھے اور پھر بے حد ناراض ہوتے ہوئے اس نے روہانسے لہجے میں کہا تھا۔

"تم میرا انتظار نہیں کر سکتیں تھیں؟ آخر میں یہاں مرنے تو نہیں آئی تھی۔ واپس آ ہی جاتی
کچھ عرصے بعد۔"

"نہیں ونیزہ! اب حالات سے فرار ہونا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ اور پھر ولید تقریباً دو
سال کے کنٹریکٹ پر پیرس جا رہے ہیں اور مجھے لگا تھا کہ اگر یہ وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر
تمام عمر میں کسی پر اعتبار نہ کر پاؤں گی۔"

اور ونیزہ کو سمجھانے کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت تو نہ تھی۔ اسی لئے کچھ دیر بعد وہ
خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ، کوئی ڈھنگ کا سوٹ بھی بنوالیا تھا یا جینز اور جیکٹ میں ہی نکاح پڑھ لیا تھا؟"
تب میں آئینے میں دیکھ کر اسے اپنے متعلق تفصیل سے بتانے لگی۔ اور مزید کچھ باتیں کرنے
کے بعد وہ ایک دم چونکی تھی۔

"ارے ہاں شانزے! میں نے سنا تھا کہ وہ جمشید آفندی....." کلک کی آواز کے ساتھ ہی
رابطہ کٹ گیا تھا اور میں نے حیرت سے اپنے کریڈل پہ رکھے ہاتھ کو دیکھا تھا۔

'کیا بے نام رشتہ ہے میرا تمہارے ساتھ جمشید آفندی! کہ حقیقت ہونے کے باوجود میں
تمہارے بارے میں کچھ غلط نہیں سن سکتی۔'

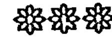
کچھ سوچتے ہوئے میں نے عاصم کا پرسنل نمبر پریس کیا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی نسوانی

آواز اُبھری تھی، جسے سن کر میں چونک گئی تھی۔ اور پھر اس آواز کو پہچان کر میں اُچھل ہی تو پڑی تھی۔

"شہرینہ۔"

"ارے..... شانزے!..... ہاں بھئی، یہ میں ہی ہوں۔ لیکن اب مسز عاصم ہوں۔" اس کا لہجہ کچھ پالینے کی خوشی سے سرشار تھا۔ شہرینہ کو ڈھیر ساری مبارکباد دینے کے بعد میں نے عاصم سے بات کی تو گفتگو کے اختتام پر میں نے کہا تھا۔

"سنو! کبھی اس شخص کا سامنا ہو تو میری جانب سے اسے کہنا..... سبز آنکھوں کی جوت مدھم نہ ہونے پائے۔ کچھ عرصے بعد ہم سب دوبارہ ایک جگہ اکٹھے ہوں گے۔ دارالاطفال میں ایک بار پھر بہار اُترے گی۔ اسے کہنا ہم سب اس کی واپسی کے منتظر ہیں۔" میری آواز میں نمی گھلنے لگی تھی اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔



"دیکھ لو شانزے گڑیا! میں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ حماد حسن سے زیادہ جینئس، ڈیشنگ اور سپیریئر بندہ ڈھونڈا ہے تمہارے لئے۔"

جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر داور انکل نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار گرے سوٹ میں ملبوس ولید کو دیکھنے لگی تھی جو حماد سے محوِ گفتگو تھا۔

"ونیزہ واپس آئے گی تو جلد ہی اس کی بھی شادی ہو جائے گی۔ ہم لوگ تو بالکل اکیلے رہ جائیں گے شانزے!" پھپھو بار بار آنسو بہا رہی تھیں۔

"پھپھو! ونیزہ تو اپنے ہی شہر میں رہے گی، آپ کو تنہائی کا زیادہ احساس نہیں ہوگا۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی۔

"ہاں مگر تمہیں دیکھ کر ایمان حسن سے دُوری کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ دل کو ڈھارس مل جاتی تھی کہ بھائی کی نشانی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

"کم آن لیلیٰ! کیوں بچوں کو اُداس کر رہی ہو؟ بھئی دو سال کی تو بات ہے، چٹکی بجاتے ہی گزر جائیں گے۔" داور انکل نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

"بھئی اب ذرا جلدی کریں۔ میرا خیال ہے، اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے۔" حماد بھائی نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"او کے شانزے بیٹا!..... وِش یو آل دا بیسٹ۔" احتشام انکل نے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیشانی پر پیار کیا تو ان کے وجود سے ویسی ہی خوشبو مجھے مسحور کرنے لگی تھی، جیسی پاپا کے وجود سے پھوٹتی تھی۔

"اور اگر آج پاپا یہاں ہوتے تو.....؟" میں نے تصور ہی تصور میں خود کو پاپا سے ملتے ہوئے دیکھا تھا اور چپکے سے اپنی پلکوں پہ اٹکے آنسوؤں کو پونچھ لیا تھا۔

"ہری اپ شانزے!" ولید احتشام کی آواز اس لمحے مجھے سہارا محسوس ہوئی تھی۔ احتشام انکل سے جدا ہوتے ہوئے میری نظریں یونہی بھٹک کر کچھ دُور جا ٹھہری تھیں۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں سے مسلسل کچلتی ہوئی وہ بہت بے بس لگ رہی تھیں۔ لرزتی کانپتی انگلیاں ایک دوسرے میں سختی سے پیوست تھیں۔ پلکیں جھپک جھپک کر وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے باوجود ان کے چہرے کی زردی اور پژمردگی میری نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی تھی۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ شاید ان میں ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا سکتیں۔ یا شاید انہیں ڈر تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر انہیں دھتکار دوں گی۔

"بھئی فصیحہ! کیوں دل چھوٹا کر رہی ہو؟ بیلیو می، یہ ولید احتشام اپنے باپ سے بھی زیادہ لونگ اور کیئرنگ ہے۔ یہ ہماری بیٹی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھے گا۔"

احتشام انکل نے انہیں دونوں کاندھوں سے تھام کر شگفتگی سے کہا تھا۔ اور شاید ان کا سہارا پا کر ہی انہوں نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ایک دم چھلک گئی تھیں۔ اور ان کا چہرہ بھیگتا چلا گیا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے بہتے آنسوؤں میں وہ سب کچھ موجود تھا، جسے میں ہمیشہ ان کے چہرے پر کھوجتی رہی تھی۔

دکھ کا احساس۔

پچھتاوے کے آنسو۔

احساسِ جرم۔

احساسِ زیاں۔

احساسِ ندامت۔

احساسِ محرومی۔

وہ تو جیسے تہی داماں کھڑی تھیں۔ اور اس لمحے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ میرے سامنے نہیں کھڑیں، بلکہ وہ تو اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی ہیں۔

"اور میں آپ کو کسی عدالت میں کیسے پیش کرتی مما! کہ میرے پاس کوئی گواہ تھا، نہ کوئی ثبوت، نہ کوئی عینی شاہد۔ آپ کو تو خود ہی چل کر اپنے ضمیر کے کٹہرے میں پیش ہونا تھا۔ جہاں آپ ہی وکیل ہیں، آپ ہی مجرم۔ عینی شاہد بھی آپ خود ہیں اور جرم کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔ اور یہ

عدالت آپ کو جو سزا سنائے گی، وہ دنیا کی کسی بھی عدالت سے بڑھ کر سخت اور کڑی ہوگی۔ جس
نہ کوئی وقت ہوگا، نہ معیار۔ آپ کو خود ہی اس آگ میں جل کر راکھ ہونا ہوگا۔ اور کوئی ہاتھ آپ
بچانے کے لئے آپ کی طرف نہیں بڑھے گا۔

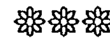
"چلو شانزے! دیر ہو رہی ہے۔" ولید نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے چونکایا تھا۔

"خدا حافظ مما!" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ان کے لب ایک لمحے کے
تھرتھرائے تھے اور نظریں جھک گئی تھیں۔ میں ولید کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی تھی اور ذرا دور جا
جب میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا تھا تو ولید نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

"شانزے! جاتے ہوئے ماہ و سال کی طرح خاردار راستے بھی اختتام پذیر ہو چکے ہیں
اب مڑ کر دیکھنے کی بجائے سامنے دیکھو۔ سالِ نو کے اولین سورج کی کرنوں کو دیکھو۔ وہاں د
جہاں پھول ہیں، رنگ ہیں اور خوشیاں میرے اور تمہارے استقبال میں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہیں
جہاں بہاریں رقص میں ہیں اور جہاں مسکراہٹیں میری اور تمہاری منتظر ہیں۔" اس نے گمبھیر
میں کہتے ہوئے میری اُداسی کو دور کرنا چاہا تو میں بے اختیار مسکرا دی تھی۔

'اور یہ شخص...... جس کی محبت کے خالص پن کا سب سے بڑا گواہ میرا دل ہے اور جس
محبت کی مہک ایسی ہی مسحور کن ہے جیسے کچی مٹی پر بارش کی پہلی پھوار پڑے تو اس کی سوندھی سوندھی
مہک انسان کو مدہوش کر ڈالے۔ اور اگر میں نے اس شخص پر اعتبار کیا ہے تو یہ فیصلہ کچھ غلط تو نہیں

میں نے ایمانداری سے اعتراف کیا اور اس شخص کے سنگ ہو لی تھی، جس کے بارے
مجھے یقین تھا کہ وہ میری ساری تھکن سمیٹ لے گا۔ اور جب اندھیرے مجھ پر غالب آنے لگیں
گے تو وہ جگنو بن کر میرے ساتھ سفر کرے گا۔



رفاقتوں کے موسم

سمجھ میں نہیں آتا تھا' اماں بی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟

تین جوان جہاں لڑکیاں تھیں اس گھر میں تینوں کی تینوں بے حد سگھڑ' سلیقہ شعار' باتمیز' گھریلو امور میں طاق' ماں کی فرمانبردار' حسن میں بے مثال .... اس کے باوجود اماں بی کو ان کے رنگ ڈھنگ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔

ایک سے بڑھ کر ایک شکایت' نئے سے نیا شکوہ۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آج کل کی نسل اتنی نازک مزاج' اتنی آرام طلب اور اتنی فراغت پسند کیوں ہے؟

اور اماں بی کی سمجھ میں تو وہ مسئلے مسائل بھی نہ آسکے تھے' جنہیں حل کرنے کے لیے وہ تینوں ہر وقت سر جوڑے کمرے میں گھسی رہتی تھیں۔ گھر میں نہ تو ٹی وی' وی سی آر کی سہولت تھی' نہ ڈش' کیبل کی خرافات۔ لے دے کر ایک منا سا ریڈیو رہ گیا تھا' ابا مرحوم کا۔ بے چارہ آج تک ساتھ دے رہا تھا۔

خبریں' گانے' بہنوں کی محفل' ڈرامے اور رات گئے تک غزلوں کے پروگرام۔ سارا دن بے چارے کو آرام کا وقت کہاں ملتا تھا؟

اپنی زبانیں پٹر پٹر چل رہی ہوں، تب بھی کہیں نہ کہیں پسِ منظر میں بجتا ہی رہتا۔ ہانڈی پک رہی ہے، ریڈیو چل رہا ہے۔

تم سنگ نیناں لاگے

اب چاہے، ہانڈی ہی کیوں نہ لا گے .... گانا پورا سنا جائے گا۔

دل کا کھلونا ہائے ٹوٹ گیا

کھلونے کے ساتھ ساتھ برتن بھی ٹوٹ رہے ہیں۔

اماں ہول رہی ہیں اور ریڈیو چل رہا ہے۔

کتابوں' اسکولوں کو عرصہ ہوا خدا حافظ کہہ چکی تھیں پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ صبح سے شام

تک ایک ہی کمرے میں، ایک ہی پلنگ پر سر جوڑے بیٹھی رہتیں۔

''اوہو.... آخر کون سی باتیں ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔'' اماں بی کو اپنی تینوں بیٹیوں کی یہ سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔

''اللہ جانے کن گھروں میں آگ لگائیں گی جا کر۔ رنگ، ڈھنگ تو ایسے ہیں کہ ابھی کان چٹیا سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دیں۔ من من کرتی کمرے سے باہر بھن بھن کرتی کمرے کے اندر..... ذرا فکر نہیں، جاتے موسم کے بستر، کپڑے نکالنے ہیں۔ میں نہ ہوں تو گرمیاں بھی جاڑے کے بستروں میں نکل جائیں۔''

اماں بڑبڑاتے جاتیں پھر بک جھک کر خاموش ہو رہتیں۔

مگر کب تک؟

کہیں کوئی کمی، کجی نظر آئی اور ان کا الارم دوبارہ بجنے لگتا۔

لڑکیاں بے زار ہو جاتیں۔

''اماں تو بس.....'' لمحہ بھر کو محفل برخاست کر دی جاتی۔

زیب النساء سب سے بڑی تھی۔ وہ باورچی خانے میں گھس جاتی۔

الماریاں صاف ستھری۔

ڈبے ترتیب سے رکھے۔

برتن دھلے ہوئے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔ لو یہ ذرا سا خشک آٹا چولہے پہ گر رہ گیا اور اماں کی شکایتیں شروع۔''

وہ گیلا کپڑا لے کر چولہا رگڑنے بیٹھ جاتی۔

منجھلی مہر النساء صفائی پر مامور تھی۔

دونوں ہاتھ کمر پر رکھے آنکھیں کھول کھول کر کمروں کا جائزہ لیتی۔

بستروں کی چادریں دھلی دھلائی، بے شکن۔ تکیوں کے غلاف بے داغ..... کشن اپنی جگہ۔ فرنیچر جھاڑا ہوا۔ سرخ برآمدے نکھرے ستھرے۔ صحن دھلا دھلایا۔

''اور کیا چاہیے اماں کو؟'' وہ چڑ جاتی۔ تب ہی نگاہ چھت پر جاتی۔

''لو..... یہ ذرا سا جالا، ایک مکڑی بھی مشکل سے سما پائے۔ جب ہی تو اماں کی بڑبڑاہٹیں ختم ہونے میں نہیں آ رہیں۔''

وہ لپک جھپک ڈنڈا لے کر جالے اتارنے لگتی۔ پھر اماں کی عینک زبردستی اتار کر ناک پر رکھ لگی۔

''دیکھیں تو سہی اس جادوئی عینک کا کمال۔ سامنے کھڑا بندہ دکھائی دے نہ دے، جالے ضرور دکھا دیتی ہے کم بخت۔''

چھوٹی نور العین تھی۔

اسے خوب خبر ہوتی تھی کہ آج کن معاملات میں سستی دکھائی ہے، سو بھاگم بھاگ چوزوں کے ڈربے تک جاتی۔ دانہ پانی ڈالا۔ مرغیوں کے نیچے سے انڈے نکالے۔ چڑیوں کا کٹورہ پانی سے بھرا اور دوڑ لگا کر پھر کمرے میں۔

جلے تو جلاؤ گوری

بڑی دونوں ریڈیو سے چپکی ہوتیں۔ وہ بھی شریک راگ ہو جاتی۔

جلے تو جلاؤ گوری

نیرہ نور جی جان سے گاتی رہتیں۔ اماں، جی جان سے جلتی رہتیں۔

''اس موئے ریڈیو کو چولہے میں نہ جلایا تو میرا نام بھی قمر النساء نہیں۔''



شام ڈھلنے کو تھی۔

اماں نے رات کے لیے دال، چاول بنانے نہ دیے تو مہرو نے ضد میں آ کر کدو کا رائتہ بھی نہ بنایا۔

زیبی نے ریڈیو کو کھولا اور چکن شاشلک کی ترکیب لکھنے لگی۔

عینی بے چاری الجھے ہوئے ریشم کا گچھا سامنے رکھے لبالب بھری آنکھوں سے دونوں بہنوں کو دیکھ رہی تھی۔

'اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں۔'

سارا قصور تو خود اس کا اپنا ہی تھا۔ اماں کڑھائی کا ٹانکا سکھانے پر بضد تھیں اور وہ نہ سیکھنے پر۔ ٹانکے نکلنے کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی تو لے کر ان سب دھاگوں کا گچھا مچھا بنا دیا۔ اماں کے دھاگوں نے تو کر سینگی ہی الٹا آنتیں بھی گلے پڑ گئیں۔

مہرو کن اکھیوں سے اماں کو دیکھتے ہوئے ان کے تمام چوزوں کو یکے بعد دیگرے ہاتھوں میں تول رہی تھی۔

'تجھے رب نے بنایا کس لیے'

وہ ایک چوزے کو آنکھوں کے سامنے نچا رہی تھی۔

اماں ہری مرچیں پیس رہی تھیں۔ اس کے انداز پہچان لیتیں تو ہری مرچوں کے ساتھ اس ملیدہ بھی لمحوں میں بن جاتا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

گلابی شام کے سکوت میں دھما دھم دھمال ڈالتا ڈنڈا پل بھر کے لیے ساکت ہوا۔

"دروازہ بجا ہے۔" انہوں نے گردن موڑ کر چھوٹی کو دیکھا۔

ظاہر ہے' اتنی زور زور سے کان تو نہیں بج سکتے۔" وہ جلی بھنی بیٹھی تھی۔ دستک دوبارہ ہوئی تھی۔

اماں اٹھ کر ڈیوڑھی تک گئیں تو مہرو سب سے تگڑا چوزہ لے کر کمرے کی طرف بھاگی۔

"زیبی! چکن شاشلک کے لیے کتنا چکن درکار ہے؟"

"مطلب.....؟"

"جیتا جاگتا چکن تمہارے سامنے ہے۔ اب بھی مطلب پوچھ رہی ہو۔" مہرو کے معنی خیز انداز پر اس نے مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑیں۔

"اماں نے پوچھا تو.....؟"

"بلی کھا گئی۔" مہرو بھی اپنے نام کی بس ایک ہی تھی۔

"ذبح کون کرے گا؟"

"کہو تو ابھی گردن مروڑ دوں۔" مہرو نے دلار سے چوزے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔

"مہرو.....! زیبی.....!" عقب سے اماں کی آواز صور اسرافیل بن کر گونجی تھی۔

"آ..... آ....." دل کانپا..... ہاتھ لرزے..... بانکا چکن ہاتھ سے نکلا.....

اماں کے کندھے پر سوار ہوا' ان کے پیچھے کھڑے اجنبی کے قدموں میں گھڑی بھر لوٹا اور پھر وہ جا۔

مہرو تھوک نگلتی' کھنکھارتی' اماں سے نظریں چراتی بمشکل سلام کہتی برابر سے نکلتی چلی گئی تھی۔

زیبی گھبرا کر اٹھی۔

گود میں رکھا ریڈیو دھڑام سے نیچے جا گرا۔

چاہے میرا دل لے لے چاہے میری جان لے لے

وہ ریڈیو اٹھانے کو جھکیں' تب تک مردانہ جوتے قریب آ چکے تھے۔ سو جھٹ کھڑے ہو کر داغا اور اگلے پل کمرے سے باہر۔

"ارے بھاڑ میں گیا تیرا دل..... چھوٹی..... ارے او چھوٹی.....!"

اماں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ ریڈیو بند کرنے میں ناکام رہیں تو جھلا کر نور العین کو پکارنے لگیں۔

○ ○ ○

"کشمش اور ناریل بھرا انڈوں کا حلوہ' انار دانے کی چٹنی کدو کا رائتہ اور بھنا ہوا چوزہ۔

'میری قسمت میں تو نہیں شاید۔'

مہرو کے غم کا کوئی مداوا نہ تھا۔ اپنے ہاتھوں ٹرے سجا رہی تھی۔ منہ سے رال ٹپک رہی تھی' آنکھ سے آنسو۔

"کبھی جو ہماری خواہش پہ کوئی مرغی' چوزہ ذبح ہوا ہو۔ مہمان اچھے ہیں۔ جی بھر کے مزہ لیں گے۔" وہ باورچی خانے کے فرش پر دھرنا مارے بیٹھی تھی۔

زیبی کئی بار کھانے کے لیے کہہ چکی تھی مگر وہ احتجاج کے ساتھ انتظار بھی کر رہی تھی۔

"ہمارے لیے یہ ہی رہ گیا ہے کیا؟ رائتہ اور وہ بھی کدو کا۔ برتن واپس آنے دو' تب ہی کچھ کھاؤں گی۔"

اللہ اللہ کر کے برتن واپس آئے۔

مہمان کی صحت دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ اتنا کچھ کھا جائے گا۔ حلوے کی پلیٹ بالکل خالی' چٹنی اور رائتہ جوں کا توں اور سالن بھی کچھ نہ کچھ موجود۔

مہرو نے جھٹ سے روٹی نکالی مگر اماں اس سے بھی تیز۔ سالن کا ڈونگا فوراً ہی الگ سے ڈھانپ دیا۔

"یہ صبح ناشتے میں اس کے کام آئے گا۔"

مہرو کے پتنگے لگ گئے۔

"ہمارے لیے کیا.....؟ یہ ہی کدو کا رائتہ..... نہیں..... نہیں۔" اس نے جلالی انداز میں تڑخ کر آنکھیں گھمائیں۔

"اماں! فوراً سے بیشتر میری روٹی پہ سالن ڈال دیں ورنہ..... ورنہ بلی رات کو سارا سالن کھا گئی تو مجھ سے مت کہیے گا۔"

اماں نے غصے سے اسے دیکھا۔ ایک ہی نظر میں تیور بھانپ گئیں۔

زیبی اور مہرو صبر شکر کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تھیں۔

"میری یہ دونوں بیٹیاں اتنی صابر شاکر..... اور یہ جگا..... ہٹ کا پکا....."
اماں نے ڈونگا اٹھا کر اس کے سامنے پٹخا اور خود باہر نکل گئیں۔
مہرو کی ندیدی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ لحہ بہ لحہ گہری ہوتی چلی گئی تھی۔



اماں کی مرحومہ خالہ زاد کا یتیم و لیسیر بیٹا المعروف معروف حسن بدستور سو رہا تھا۔ ناشتہ کب کا تیار تھا۔ دو انڈوں کا آملیٹ، بناسپتی گھی میں تلے پراٹھے اور ایک عدد دہی کی پیالی۔

مہرو کو اس ناشتے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سوا اپنے حصے کے سارے کام نمٹاتی چلی جا رہی تھی۔ فرش پہ پوچا، فرنیچر کی جھاڑ پونچھ، باورچی خانے کے کوڑے دان کی دھلائی، کالی دیگچیاں رگڑائی۔ زیبی باورچی خانے میں ناشتہ گرم رکھتے رکھتے تھک گئی تو اٹھ کر نہانے چلی گئی۔ اماں مرغیوں کے لیے خوراک تیار کر رہی تھی۔

عینی گملوں کی گوڈی میں مصروف۔

دن خوب روشن اور چمکیلا تھا۔ مہرو فارغ ہوتے ہی ریڈیو لے کر بیٹھ گئی۔ پُرسکون ماحول..... صاف ستھرا کمرہ..... فراغت کا شدید احساس اور من پسند گانے۔

میں بن پتنگ اڑی جاؤں رے
ہوا کے سنگ لہراؤں، لہراؤں رے

ابھی تو پرواز ڈھنگ سے شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ اماں نے ایک جھٹکے سے ڈور کھینچ لی۔

"ناشتہ گرم کر دو، معروف حسن اٹھ گیا ہے۔"

"اف....." کیسی بدمزہ ہوئی تھی۔

"کیا ہوتا جو موصوف پل بھر پہلے اٹھ جاتے یا پھر بعد میں۔" وہ خراب موڈ کے ساتھ اٹھ کر ناشتہ گرم کرنے لگی۔

دوپہر میں بھی کچھ یہی حال رہا۔

تازہ سبزی بنائی، چھلکے تک ڈال دیے مگر ہوتے ہوتے سہ پہر بھی ڈھل گئی۔

اماں پریشان، لڑکیاں معترض۔

"ایسے نخرے ہم سے برداشت نہیں ہوتے، ہونہہ....."

ایک تو مہمان کی خاطر اماں کی بے جا سختی، اس پر خود مہمان کا غیر ذمہ دارانہ رویہ۔

"ہم پہ تو ہزار پابندیاں ہیں۔ اونچی آواز میں بات نہ ہو، وقت بے وقت ریڈیو نہ چلے، کھانے میں رتی برابر دیر نہ ہو اور موصوف پر کوئی قدغن نہیں۔ مہاراجہ کہیں کا۔"

مہرو جھٹ ایک پرچہ لکھنے بیٹھ گئی۔

ناشتہ..... دوپہر کا کھانا..... رات کا کھانا..... شام کی چائے..... سب کے اوقات
مثلاً، گھر میں داخلے کا وقت..... کمرے میں رہنے کے آداب.....

مہرو لکھتی جا رہی تھی، باقی دونوں کھی کھی کرتی اس پہ جھکی بیٹھی تھیں۔

صبح کمرے سے بھیگا تولیہ..... گندے سلیپر..... اتارے گئے کپڑے ہٹانے پہ مہرو قطعاً راضی نہ ہوئی تھی۔ (لڑ جھگڑ کر اماں کو ہی اس کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنا پڑیں)

سو بہت سوچ سمجھ کر سارے اصول و ضوابط تحریر کیے گئے۔

زیبی اور عینی اس معرکے میں پوری طرح شریک تھیں۔ اماں کی طرف سے البتہ خوب رازداری برتی گئی تھی۔ وہ جانے کیوں جی جان سے مہمان کی خدمت کرنا چاہ رہی تھیں۔

اس کے میلے کپڑے دھو کر پھیلا دیے۔ جب تک اس نے گھر میں قدم نہیں رکھا، انہوں نے بیسوں چکر دروازے کے لگا ڈالے تھے۔

لڑکیوں کو کسی غیر کے لیے ان کی یہ فکرمندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

شام کو وہ گھر میں داخل ہوا، خوب تھکا ہارا، پریشان۔ وہ اپنا تبادلہ واپس اپنے شہر میں کروانا چاہتا تھا۔ ساری بھاگ دوڑ اسی چکر میں تھی۔ صبح دفتر میں..... شام کو افسران بالا کے ہاں حاضری..... کبھی اس کو درخواست دے، کبھی اس تک فائل پہنچا..... اف..... نوکریوں کے سو بکھیڑے۔

"کام بنا.....؟" اماں کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ اُترے اترے چہرے پہ کیسا پیار آ رہا تھا انہیں۔

"اے ماں میسر نہیں، مجھے بیٹا..... واہ قدرت....."

دل میں آتے خیالات جھٹک کر اسے خوب تسلی دلاسا دیا..... جھولیاں بھر بھر دعائیں۔ اتنی محبت پا کر اس کا ناامید دل ایک بار پھر پُرامید ہو گیا۔

"کل ایک دو لوگوں سے ملنا ہے، آپ دعا کیجیے کہ کام بن جائے۔"

اور اماں برسات کے بادل کی طرح اپنی دعائیں بے دریغ اس پر نچھاور کرتی رہیں۔ ذرا دیر میں وہ بھی چہکنے لگا۔ کھانا کھا کر آیا تھا۔ عینی چائے دینے گئی تو خوامخواہ اس کی چپٹی سی ناک کو نشانہ بنانے لگا۔

"لگتا ہے بچپن میں ناک کے بل گری تھی۔ کہیں کوئی جاپانی اٹھا کر ہی نہ لے جائے۔"

"ارے خوامخواہ....." عینی بری طرح جھینپی۔

"تو ذرا سچ بتاؤ' یہ جاپانی ناک کتنے میں لگوائی؟"

آپ بھی تو بتایئے کہ..... یہ ہاتھی جیسے کان..... چوہے کی دم ایسی مونچھیں.....

"اے.....اے.....اے....." اماں گڑبڑائیں۔

معروف حسن نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔

"ایسی منہ پھٹ لڑکی....." اماں کی آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں۔

عینی بگٹٹ بھاگ کر باورچی خانے میں گھس گئی۔

وہاں مہرو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں اتنا فری ہونے کی' خوامخواہ سر پہ چڑھنے لگے گا۔" عینی بے چاری شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

رات کے کھانے تک بمشکل انتظار کیا گیا۔ جونہی معروف حسن نے کھانا کھایا اور اماں نماز میں مصروف ہوئیں' وہ تینوں جھپاک سے کمرے میں جا گھسیں۔

"آہم....."

معروف حسن اپنی ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا۔ ہلکی سی کھنکھار پر پہلے آنکھیں کھولیں پھر شپٹا کر اٹھ بیٹھا۔

تینوں حسینائیں خطرناک تیور لیے اس کے سر پہ کھڑی تھیں۔

شکلیں دلیرانہ..... انداز جارحانہ.....

"آپ یہاں آئے کس لیے.....؟"

آپ نے بلایا اس لیے۔"

سنگین ترین غلطیوں کی ایک طویل فہرست سامنے تھی جو صرف اور صرف سفر کی تھکاوٹ کے سبب دیر تک سونے اور پھر وقت پر دفتر پہنچنے کی جلدی کے باعث اس سے سرزد ہوئی تھیں۔

اس نے ہزار دلیل وصفائی سے کام لینا چاہا مگر وہاں کوئی سننے کو تیار ہوتا تب نا۔ دونوں ہاتھ پہ رکھے' وہ چپ چاپ فردِ جرم سنتا رہا۔

آخر میں ایک ہدایت نامہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہایت نزاکت سے لہرایا گیا جسے بڑ... کے ساتھ ساتھ وہ وقتاً فوقتاً نگاہ اٹھا کر ان تینوں کو بھی دیکھتا رہا۔ جابر حکمرانوں کی سلطنت میں ان کی رضا و پسندیدگی کے بغیر خیمہ زن ہو کر کس قیامت کو دعوت دی تھی اس نے۔ اس کا اندازہ ان چہروں پہ پھیلے نخوت بھرے ناگوار تاثرات کو دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا تھا۔

نہایت صبر و تحمل سے ہدایت نامہ پڑھ کر ادب و احترام سے تہہ کر کے جیب میں رکھا اور

گئے ہی پل۔ جیسے تو حکم کرے دل میرا ویسے دھڑکے، کے مصداق اٹھ کر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

"غلطی کی جو گھریلو ماحول کی تلاش میں یہاں چلا آیا' ورنہ شہر میں ہوٹلوں کی کیا کمی؟"

کس آرام سے کہہ کر وہ چلنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

وہ تینوں منہ کھولے ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ یہ سب تو ان کی پلاننگ میں نہ تھا۔ کچھ سبق سکھانا مقصود تھا اور بس.....

زیبی کی ساری جرأت..... مہرو کی ساری بہادری دھری کی دھری رہ گئی۔ عینی بھی گڑبڑا گئی۔

"اماں تو جان نکال لیں گی۔" اس نے ساکت کھڑی بہنوں کو جھنجوڑا۔

"د.....د.....دیکھیے..... یہ تو صرف مذاق..... رہنے دیجیے..... رکیے نا..... ہم تو یونہی....."

زیبی منمنائی' عینی نے بھی منت کی۔

"اوہ کہہ دیا نا' مذاق کر رہے تھے۔" مہرو نے پاؤں پٹخے پھر قمیص کی اوپری جیب میں پھڑپھڑاتا کاغذ جھپٹنے کو ہاتھ بڑھایا' جسے بصد احترام کلائی سے تھام کر پیچھے ہٹا دیا گیا۔

"اونہوں..... بری بات....."

"اف....." وہ پاؤں پٹختی باہر نکل آئی۔

"بدتمیز آدمی! خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہے تھے۔ ایک بار وہ کاغذ ہاتھ میں آ جاتا پھر جاتا جہنم میں میری بلا سے۔" دوسرے کمرے میں آ کر سرتاپا چادر تان لی۔ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی۔

"اماں کو تو موقع چاہیے ڈانٹنے کا۔"

وہ زیبی اور عینی کی منتظر تھی۔ دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد۔

چند گھڑیاں گزریں' کچھ وقت بیتا۔ اس نے دھیرے سے چادر کھسکائی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ چادر ہٹائی' دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئی۔

اماں نماز ختم کر چکی تھیں اور اب معروف حسن کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے چپکے سے دروازے پہ لٹکتا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

اماں سامنے والی چارپائی پہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں زیبی دبکی بیٹھی تھی۔

عینی معروف حسن کی باتوں سے لال پیلی ہو رہی تھی۔

"اف..... یہ..... دونوں..... ابھی نکل آئیں کمرے سے تو ہوش ٹھکانے لگا دوں۔" وہ پردہ چھوڑ کر دانت پیستی واپس کمرے میں آ گئی۔

ان کا انتظار کرتے کرتے بہت سا وقت بیت گیا پھر ذہن پہ غبار سا چھانے لگا۔ سونے سے

کچھ لمحے قبل کمرے میں کھٹر پٹر کی آوازیں آئیں۔

اتنے اچھے ہیں معروف بھائی۔! میں انہیں کبھی یہاں سے جانے نہ دوں گی۔"

عینی کی آواز بہت دور سے آئی تھی۔

اسے جھاڑنے کے لیے مہرو نے زبان ہلانی چاہی مگر نیند کا غلبہ شدید تھا۔

وہ کروٹ بدل کر گہری نیند سوگئی۔

○ ○ ○

مہرو کی ناراضی کا ڈر تھا' سو اگلی صبح زیبی اور عینی نے اسے کئی کہانیاں سنا ڈالیں۔

"اماں اچانک آ گئی تھیں۔" بمشکل اس نے اپنا موڈ درست کیا۔ وقت بے وقت چا
پلانے کا وعدہ..... ریڈیو سننے کی فرمائش ..... پل بھر میں ساری شرطیں منوالیں اس نے' پھر
"تبادلہ ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔ جتنے دن یہاں ہوں' برداشت کرلیں۔"

"مہرو! ہم نے بھی زیادتی کی۔ مہمان تو مہمان ہی ہوتا ہے نا' خواہ کیسا ہی.... اچھا چھو
دفع کرو۔" زیبی نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر بات ہی بدل ڈالی۔ کچھ دیر بعد سب اپنے ا
کاموں میں جت گئیں۔

معروف حسن کی عدم موجودگی میں مہرو اس کے کمرے کی صفائی ستھرائی کے لیے آئی تو دنگ
سے رہ گئی۔

ہر چیز سمیٹ کر رکھی ہوئی۔ بستر تہہ کیا ہوا.... چادر بچھی ہوئی....
کپڑے کھونٹی پہ.... کنگھا' شیشہ' پرفیوم سائیڈ ٹیبل پہ بالترتیب اور سامنے کی دیوار کے
وسط میں لٹکتا ہوا ہدایت نامہ.....

مہرو چکرا کر رہ گئی۔

اماں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اَن پڑھ بھی نہ تھیں۔ اخباروں کی سرخیاں تو پڑھ
لیتی تھیں اور پھر یہ ہدایت نامہ ایسی فصیح و بلیغ اردو میں نہ لکھا گیا تھا کہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتا۔
دانت پیستی' لپک جھپک آگے بڑھی۔

کرسی پہ تپائی' تپائی پہ خود..... ایک جھٹکے سے کاغذ کھینچا تو دوسرے جھٹکے پہ خود نیچے تپائی اوپر
"آ...." تیز چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔

عین اسی وقت کوئی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کس اطمینان سے پوچھا گیا تھا۔

گویا جو کچھ ہو رہا ہے' ارادتاً ہو رہا ہے۔

اور مہرو نے لاکھ کوشش کر ڈالی کہ کسی نہ کسی طرح بے ہوش ہی ہو جائے اور کچھ نہیں تو بے پناہ
شرمندگی کے زیر اثر ہی سہی۔

مگر یہ نہ ہونا تھا' نہ ہوا....

الٹا اسی نے تسلی کے دو بول کہتے ہوئے تپائی اس کے اوپر سے ہٹائی' تب کہیں جا کر وہ اٹھ کر
لنگڑاتے ہوئے بھاگنے کے قابل ہو سکی۔

○ ○ ○

ہو میرا ابا بو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی

ہو میرا ابلما رنگ رنگیلا میں تو ناچوں گی

ریڈیو بج رہا تھا اور مہرو واقعی صبح سے ایک ٹانگ پر ناچتی پھر رہی تھی لیکن وجہ ہرگز وہ نہ تھی جو
نغمہ بتا رہی تھی۔

بس ایک گھٹنا چوٹ لگنے پر سوج گیا تھا اور اب کسی پل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ معروف حسن
نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ دوا لا کر دینے کی آفر کی جسے اماں نے سہولت سے رد کر دیا۔

"تیل کی مالش سے آرام آ جائے گا۔"

انہوں نے خود تیل نیم گرم کر کے گھٹنے پر مالش کی اور پھر کپڑا لپیٹ کر آرام کی تاکید کرنے
لگیں۔

وہ صحن میں بچھی چارپائی پہ ہی دوپٹہ تان کر لیٹ گئی۔

عجب اداس سی شام تھی۔

اور ایسی شام میں ہمیشہ ابا چپکے سے اس کی یاد میں چلے آتے تھے۔

کچھ محرومیوں کا احساس دھیان کا در کھٹکھٹاتا تھا۔ کچھ خواہشیں دامن پکڑ کر کھینچتی تھیں۔

دوپٹے کی اوٹ میں بے آواز آنسو بہانے اور دماغ پہ چھائی غنودگی کے باوجود وہ چڑیوں کی
چوں چوں' چڑ چوں کو بغور سنتی رہی۔

مرغی کے نوزائیدہ بچوں کی معصوم سوالیہ چوں' چوں۔ باہر گلی میں سبزی والے کی پکاریں اور
اس سے کچھ دور کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگتے' دوڑتے بچوں کی چیخ و پکار۔ وہ بہت دیر تک یونہی لیٹی
نرم گرم موسم کا مزہ لیتی رہی۔

سبزی والا دروازے کے عین سامنے آ گیا تھا۔

وقت برباد کرنا.... نہ بھئی.....'' آواز میں شرارت۔ عینی کے ساتھ اشاروں میں باتیں ہو رہی تھیں۔

مہرو نے غصے سے کروٹ بدلی۔

''ان کے گھٹنے پر بڑی سخت چوٹ آئی ہے۔'' عینی نے اطلاع دی۔

''چوری کی کچھ تو سزا ملنا تھی۔''

''چوری.....؟'' مہرو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''کیا چرالیا ہم نے؟'' وہ سرخ آنکھوں سے براہ راست گھور رہی تھی۔

معروف حسن نے ایک نظر اماں کو دیکھا' قریب ہی بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ نہ ہوتیں تو وہ سب گنوا دیتا جو یہاں آکر چوری ہو گیا تھا مگر اب گرم چائے سے اڑتی بھاپ پہ نگاہ جمائے خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔

''خوامخواہ کا الزام.... کون سے ہیرے جواہرات ساتھ لے کر آئے تھے جو.....''

اماں کی نگاہ اس تک آئی۔ تیز..... غصے سے لبریز..... تنبیہ کرتی ہوئی......

''ان کو تو کچھ نہیں کہتیں۔ خوامخواہ سر پہ چڑھ رہے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو کر اٹھ گئی۔ گھٹنے میں درد کا احساس تک نہ رہا۔ باورچی خانے میں جاکر زیبی کے سامنے ساری بھڑاس نکالی۔

باہر اماں' معروف حسن کو سمجھا رہی تھیں۔

''نہ ان کی عادتیں خراب کرو' اوٹ پٹانگ چیزوں کا ذائقہ منہ کو لگ گیا تو کل کلاں مجھے بھی تنگ کریں گی اور میں تو دال روٹی ہی مشکل سے پوری کرتی ہوں' تم بھی بچت کی عادت ڈالو۔ ماں' باپ سر پہ ہوتے تو تمہیں روپے پیسے کی قدر بتاتے۔ برے بھلے وقت میں کام آتا ہے' کچھ نہ کچھ بچا کر رکھا کرو۔''

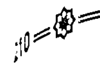


اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

باورچی خانے کے دھلے فرش پہ تینوں کی محفل جمی تھی۔

اماں محلے میں کسی کی عیادت کے لیے گئی تھیں۔ معروف حسن بھی ناشتے کے بعد جا چکا تھا۔ سو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اونچی آواز کھول کر ریڈیو چلایا گیا تھا۔

عینی چراغ کے لیے روئی کی بتیاں بنا رہی تھی اور مہرو روئی کے گالے ہوا میں اڑا اڑا کر ''کوئی



بھونڈی آواز میں روز کی رٹی رٹائی سبزیوں کی دیوانہ وار آوازیں لگائے چلے جا رہا تھا۔

اماں ٹوکری اٹھائے باہر نکل گئیں۔ اس نے ذرا سا پلو چہرے سے کھسکایا۔

شام کا نارنجی رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان کے کنارے سیاہ پڑنے والے تھے۔

باورچی خانے میں زیبی ہنڈیا بنانے کی ابتدائی تیاریوں میں مگن تھی۔ ریڈیو پاس ہی دھرا تھا۔

مہرو نے کچھ سننے کی کوشش کی مگر آواز بہت دھیمی تھی۔

عینی اس کے قریب سے چپل گھسیٹتی گزری اور چوزوں کو ڈربے کی طرف گھیر کر لے جانے لگی۔ مہرو زیبی کے پاس جانے کے لیے اٹھنے والی تھی کہ ڈیوڑھی میں اماں کے ساتھ ساتھ گویا باتیں کرتا' معروف حسن بھی صحن میں داخل ہوا۔

خدا جانے کیا قصہ سنا رہا تھا۔

''توبہ..... پرسکون ندی میں کوئی پتھر آن گرا شاید۔'' وہ دوبارہ سے اکڑوں لیٹ گئی۔ اب لنگڑاتی ہوئی چلتی تو گھنٹے بعد ہی باورچی خانے میں پہنچ پاتی۔ اپنا مذاق تھوڑی بنوانا تھا' سو اس کے ٹلنے کا انتظار کرنے لگی۔

وہ بھی ایک نمبر کا بدتمیز تھا۔ کمرے میں جانے کے بجائے برآمدے میں دھرے تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس کے عین سامنے باورچی خانہ تھا۔

''اے گڑیا! جا..... جا..... پا..... پانی..... پلیٹ لے کر آؤ۔'' وہ عینی کو پکار رہا تھا۔

''اور آکر دیکھو ذرا..... کیا مزے کی گرم گرم پکوڑیاں لایا ہوں۔ ساتھ دہی کی چٹنی... کرارے چھولے' مجھے تو خبر ہی نہ تھی۔ جاپانیوں کی پکوڑیاں اتنے مزے کی بنتی ہیں۔'' وہ بولتا جا رہا تھا۔

''میں تو سمجھا یہاں صرف چاقو' چھریاں اور تلواریں ہی بنتی ہیں۔'' صاف صاف اشارہ ان کی جانب۔

عینی کی ہنسی نکل گئی۔ مہرو پیچ و تاب کھاتی رہی۔

''میں اپنا حصہ نکال چکا۔ ذرا کچن میں اپنی آپا کو بھی دے آؤ..... ہو سکتا ہے پکوڑیاں کھانے کے بعد ان کا دل چائے پینے کو چاہے۔ اسی بہانے ہم بھی چکھ لیں کہ آپ کے شہر میں چائے کیسی بنتی ہے؟

''دن رات ٹھونس کر بھی پتہ نہیں چلا کہ چائے کیسی بنتی ہے؟'' مہرو نے ناراضی سے سر جھٹکا۔

''ارے ہاں بھئی..... وہ ایک بڑی اہم دستاویز میں نے اپنے کمرے میں لٹکائی تھی۔ کہیں... جاتی تو باقی لوگوں کو بھی بتا دیتا کہ سونے جاگنے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں۔ یوں...

یہاں گرا اور کوئی وہاں گرا'' کا عملی نمونہ پیش کر رہی تھی۔

زیبی لالٹین کا شیشہ کھولے رگڑنے میں مصروف۔ تب ہی باورچی خانے کے دروازے کے چند قدم پیچھے کوئی زور سے کھنکھارا۔ تینوں متوجہ ہوئیں۔

چند لمحوں بعد معروف حسن دروازے کے چوکھٹے میں ظاہر ہوا۔ سامان سے لدا دالیں، مسالے چینی، گھی، چاول اور نجانے کیا کیا.....؟

''یہ سب کیا ہے؟'' مہرو نے سوالیہ نظروں سے زیبی کو دیکھا۔

جواباً لاعلمی کا اظہار کندھے اچکا کر کیا گیا؟

''یہ.....؟'' معروف حسن سے استفسار کیا۔

''سودا سلف..... راشن.....''

''پرسوں کچوریاں، کل ڈبل روٹی اور انڈے اور آج مہینے بھر کا راشن..... کوئی یتیم خانہ کھلا ہے یہاں۔''

''مہرو کی خطرناک تیوروں پہ حیران ہوتے ہوئے اس نے مہرو کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا۔

''کیا سمجھا ہے آپ نے ہمیں۔ مسکین، لاچار، بھیک منگے۔ مان لیا کہ غریب ہیں، بے سہارا ہیں لیکن اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتے ہیں۔ ہرگز ضرورت نہیں ایسی امداد کی، اتنے ہی لینڈ لارڈ ہیں تو جائیے گلی میں کھڑے ہو کر فقیروں، بھکاریوں میں بانٹیے اپنا مال اسباب۔ غریبوں، بیواؤں کی جھولیاں بھریں۔'' وہ شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی۔ کمر ٹھونکنے کو دو عدد مشیر دائیں بائیں موجود تھیں۔

''دیکھیے..... آپ..... میرا مطلب..... یہ زیادتی..... حد ہو گئی.....'' اس نے بارہا کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر سامنے تو قینچی تھی۔ کتر..... کتر اس کی ساری کوششوں کے پرزے اڑا گئی۔

آخر کار گردن کاندھے پہ گرائے، زبان تالو سے چپکائے، ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ بجلیاں کڑکتی رہیں، آگ برستی رہی۔

وحشی حسینہ..... جنگل کوئین..... ہانگ کانگ کی بجلیاں..... بنکاک کے شعلے..... پستول کی ٹھائیں ٹھائیں..... بندوق کی دھنا دھن.....

جگر چھلنی ہے..... دل گھبرا رہا ہے۔

آہ بھرنے کا بھی موقع نہ دے رہی تھی نیک بخت۔

''اگر یہاں رہنے کا کرایہ اس صورت میں ادا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بخشیے، شہر بھرا پڑا ہے ہوٹلوں سے۔ جائیے، سدھاریے مگر ایسے احسان..... ہماری برداشت سے باہر..... دو چار پیسے آ جائیں تو خود کو کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہم بھی آن، عزت والے لوگ ہیں ہاں۔''

تھک ہار کر دھپ سے فرش پر بیٹھ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھ سے چند ایک آنسو ٹپک ہی پڑے۔

روتے ہیں چھم چھم نین

اجڑ گیا.....

ریڈیو کو غصے سے بند کیا گیا۔

معروف حسن نے لمبی سانس لے کر خود کو زندوں میں شمار کیا۔ کولر سے لے کر چند گھونٹ پانی پیا پھر دھیرے سے پنجوں کے بل اس کے برابر جا بیٹھا۔ شرٹ کی اوپر والی جیب سے ایک کاغذ اور کچھ رقم نکالی۔

''خالہ بی سے کہیے گا آخر میں لکھے گئے چند سودے نہیں لا سکا۔ اتوار بازار سے ملے نہیں، کہیں اور سے ڈھونڈ لاؤں گا۔''

''ہائیں.....'' آنسوؤں کے اس پار در و دیوار گھوم سے گئے۔ معروف حسن کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ اور گود میں رکھے کچھ روپے اور سودا سلف کی وہ لسٹ بھی جواب آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اپنے ہی ہاتھوں سے بنائی گئی لسٹ۔

''اُ..... و..... ف.....'' وہ گھٹنوں میں منہ دے کر چھکوں پھکوں رونے لگی۔

زیبی نے مارے شرمندگی کے لالٹین والا شیشہ ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ عینی البتہ دوپٹہ منہ میں دبائے کھی کھی کرتی رہی۔

لگژری ولا	ایک عدد
لینڈ کروزر	دو عدد
ٹی وی (کم از کم چالیس انچ)	ایک عدد
نوکر چاکر	حسب ضرورت

ہائے، کل نجانے کس ترنگ میں تھی کہ اماں نے سودا سلف کی لسٹ بنانے کو کہا تو ضروری سامان کے بعد اپنی ضرورت کی چیزیں کچھ اسی ترتیب سے لکھی تھیں اس نے۔ آج سے پہلے تو ہمیشہ عینی اور اماں ہی جاتی تھیں خریداری کے لیے۔

عینی سامان بولتی جاتی۔ اماں اپنے سامنے لکھواتی جاتیں۔

کیا خبر تھی کہ معروف حسن بے دام غلام کی طرح یہ خدمات بھی سرانجام دے گا۔ ایک تو مادیت پرستی کا عظیم الشان مظاہرہ..... اس پہ بے وجہ کی لعن طعن..... رات ہونے تک وہ منہ پھلائے..... آنکھیں سجائے بیٹھی رہی۔

عینی کو خوامخواہ سارا وقت ہنسی آتی رہی۔ زیبی پریشان تھی۔

''مہمان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔'' احساس تو اسے بھی تھا۔

شام ڈھلی تو مسمسی سی شکل لے کر اس کے کمرے تک آئی۔ غالباً چوتھی مرتبہ۔ بمشکل ہمت کر کے دروازے پر لٹکتا پردہ ذرا سا سرکا کر اندر جھانکا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' نیم تاریک کمرے سے وہ دھاڑا۔ پردہ ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''خدا جانے کون سے شیر چیتے کھائے بیٹھا ہے۔'' ننھا سا دل لرز گیا تھا۔ دوبارہ سے ہمت کر کے اندر داخل ہونا چاہا۔

''کیا دو گھڑی آرام کی اجازت مل جائے گی؟'' روکھا' پھیکا انداز۔

''ہونہہ..... کریلا..... نیم چڑھا..... صبح سے نخرہ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ ہماری بلا سے۔'' معافی تلافی کا ارادہ ختم..... پاؤں پٹختے ہوئے وہیں سے واپس ہو لی۔ معروف حسن کمرے کی تاریکی میں بے وجہ ہی مسکراتا چلا گیا تھا۔



امبوا کی ڈالیوں پہ جھولنا جھولا جا

اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

اب کے ساون تو سجن گھر آ جا

آموں کے ڈھیر پر وہ بیٹھی وہ گنگنائے چلی جا رہی تھی۔

اب کے ساون تو سجن گھر آ جا۔

اب کے.....

''لیں جی میں آ گیا۔'' آستینیں چڑھائے ہاتھ میں گنڈاسا لیے وہ عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''ہائیں.....'' وہ ایک پل کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چہرے پہ سنجیدگی لیے اماں سے مخاطب تھا جو اچار کے مسالا جات کے ناپ تول میں مصروف تھیں۔

وہ زیر لب لاحول پڑھتی فوراً وہاں سے اٹھ گئی۔

معروف حسن کے عنابی ہونٹوں پہ اترتی اور پھر غائب ہوتی مسکراہٹ صرف زیبی ہی دیکھ پائی تھی۔

سر جھکا کر اپنی بے اختیار ہنسی کو روکتی' وہ کڑھائی ٹانکنے میں الجھ گئی۔

گلابی سی شام تھی۔

دروازے کے ساتھ والی دیوار کو ڈھانپتی بوگن ویلیا کے پھول ہوا میں ہولے ہولے لرز رہے عینی مرتبان دھو کر خشک کر رہی تھی۔

سال بھر کا اچار ڈالا جا رہا تھا۔ جب جب دال چاول میسر نہ ہوا ایک بے چارہ یہی کام آتا بانٹنے میں تو لازم تھا۔

اماں آم دھو کر سکھا چکی تھیں بس پھانکیں بنانا باقی تھا۔

معروف حسن گنڈاسا لے کر کھٹا کھٹ آم کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ پُرسکوت سی شام کے آنگن میں کبھی اس کا بے خوف سا قہقہہ فضا میں گونجتا تو لڑکیاں چونک جاتیں۔

مہرو کو یاد آ گیا پچھلے سال وہ تینوں باری باری آم کاٹنے کا کام کر رہی تھیں۔ تب بھی رات کو ہاتھوں میں درد ہونے لگا تھا۔

اور وہ جوان' توانا پل بھر میں سارے آم ٹھکانے لگا کر فارغ۔

اماں مرتبان میں مسالے ڈالنے لگیں۔ وہ تولیہ اٹھا کر نہانے گھس گیا۔

باہر نکلا تو عجیب فرمائش۔

''چلیں سب گھومنے چلتے ہیں۔'' اماں بے اختیار ہنس دیں۔

''نہیں بیٹا! یہ کہاں نکلتی ہیں باہر۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں' آؤٹنگ ضروری ہوتی ہے۔ طبیعت فریش ہو جاتی ہے۔''

اماں کے پیش نظر ہزار مصلحتیں تھیں' بڑے سبھاؤ سے ٹال گئیں۔

وہ مایوس ہو کر اکیلا ہی باہر نکل گیا۔ جونہی دروازہ بند ہوا' عینی نے گھٹنوں میں سر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ہائے ہائے..... کیا ہوا بچی؟'' اماں گھبرا گئیں۔

زیبی نے بھاگ کر اسے بانہوں میں لیا۔ مہرو زبردستی اس کا چہرہ اٹھانے لگی۔

''کیا ہوا عینی! بولو نا؟''

''ہمارا..... ہمارا بھی کوئی ہوتا..... ہم جیسے چاہتے اس کے ساتھ سیر پہ جاتے..... بغیر کسی ڈر خوف کے.....''

''اوہ.....'' اماں نے طویل سانس لی اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔

''اللہ کے کاموں میں کس کا دخل؟''

مہرو آبدیدہ ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔ زیبی دیر تلک عینی کو سمجھاتی رہی۔

مہرو چولہے میں آگ جلا کر خود بھی گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی۔

"کوئی احساس تو تھا جو معروف حسن کو اس گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر تسکین پاتا تو
طویل قامت کے سائے میں کھڑے ہونے کی چاہ من میں چٹکیاں سی لینے لگتی تھی۔ وہ ہر
بھرا بھرا سا لگتا۔ بے فکری ہر سانس میں ہلکورے لینے لگتی تھی۔ نہ ہوتا تو یہ ہی گھر ویران اُجڑ
محسوس ہوتا۔ دیواروں پر آنکھیں اگ جاتیں۔ چھتوں پر اجنبی آہٹیں سانس لینے لگتیں۔

"کتنا عرصہ ہو گیا اسے آئے ہوئے۔" اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔

"ایک مہینہ اور شاید اٹھارہ دن۔" اتنے تھوڑے سے دنوں میں سب کے دلوں میں گھ
تھا اس نے اور دل تو جیسے برسوں سے ایسے ہی کسی مضبوط، اپنائیت بھرے رشتے کو ترس رہا
دھوئیں کی اٹھتی لکیر پہ نگاہ جمائے خود میں محو تھی۔

جب زیبی نے آ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"بڑی زبردست سی آندھی آنے والی ہے، سارا آسمان لال سرخ ہو رہا ہے۔ جلدی سے
چیزیں سمیٹو۔"

وہ گھبرا کر باورچی خانے سے باہر نکلی۔

دیواروں پہ دھلے ہوئے کپڑے ایک قطار میں پڑے تھے۔ سارا دن ڈنڈا اچھال اچھال کر باز
گیا تھا۔ تیز ہوا کا ایک ہی جھونکا ساری محنت غارت کر دیتا۔ وہ اندھا دھند سارے کپڑے سمیٹ
اندر رکھ آئی۔

ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ مٹی کی باس سے سانسیں ایک دوسرے میں الجھنے لگی تھیں۔ بل
گرد کا ایک طوفان سر پہ آ پہنچا تھا۔

اماں اچار کے مرتبان اٹھانے کو چیخ رہی تھیں۔ زیبی آگ بجھانے کو دہائیاں دے رہی تھی۔
عینی مرغی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر پاگل ہو رہی تھی۔

تب ہی دھماکے کی زوردار آواز کے ساتھ گھر سے باہر کوئی چیز گری تھی۔ کوئی بوسیدہ در
سالخوردہ دیوار۔ کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔ تاہم اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"رہنے دو..... کمرے میں چلو..... زیبی..... عینی..... مہرو..... میں کہتی ہوں چھ
سب چیزیں بدبختو! کوئی چیز آ کر لگے گی سر میں۔" وہ زور سے چلائیں۔

ایسی تاریک آندھی تھی کہ شام میں رات کا سماں بن گیا تھا۔ مہرو نے آتے آتے بھی
پانی چولہے میں انڈیلا۔ زیبی اچار کے مرتبان گھسیٹ لائی۔

عینی البتہ اماں کی گود میں گھسی۔ "ہائے میرے چوزے، ہائے میرے چوزے" کا ورد کرتی رہ
گئی۔ زیبی اور مہرو ایک دوسرے میں گھسی بیٹھی تھی۔

کمرے کا بند دروازہ کھٹاک کھٹاک بج رہا تھا۔ جوشیلی ہوا سارے بند توڑ ڈالنے پر آمادہ تھی۔

"یا اللہ.....! اس بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھیو۔" بجلی بند ہو چکی تھی۔ تاریکی میں اماں کی
متفکر آواز نے انہیں بھی پریشان کر دیا۔

دھیرے دھیرے ہوا کا زور کم ہوتا چلا گیا۔ دروازے کی جھریوں سے گیلی مٹی کی خوشبو اندر
آئی تب مہرو نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

بارش برس رہی تھی، دھواں دھار قسم کی۔ چھت کا پرنالہ زور و شور سے بہہ رہا تھا۔

"لالٹین میں تیل ڈال لو..... کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریں۔" اماں کے کہنے پر زیبی اور
مہرو دونوں باورچی خانے میں آ گئیں۔

پورا جگ انڈیلا تھا چولہے میں۔ اب آگ جلانا دشوار..... باورچی خانہ پورے کا پورا دھوئیں
سے بھر گیا۔ زیبی پھونکیں مارتے مارتے مہرو پہ برس پڑتی۔ عینی، اماں کو لے کر چوزے اکٹھے کرنے
نکلی تو پتا چلا۔ بی مرغی سارے بچوں کو پروں میں چھپائے ڈربے میں ہی بیٹھی ہیں۔

تب ہی دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ جانی پہچانی دستک۔ عینی نے بھاگ کر دروازہ
کھولا۔ بارش سے بچنے کے لیے بستر کی چادر خوب اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ معروف حسن کو بری
طرح بارش میں بھیگے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس دی۔

پہلے تو دھول مٹی پھر تیز بارش کا نوکیلا پانی اور اب مذاق اڑاتی ہوئی ہنسی کی پھوار۔

معروف حسن نے ٹھیک ٹھاک چپت اس کے سر پہ لگائی۔

"بھاگ جاؤ..... میرے کپڑے نکال کر لاؤ....."

اسے برآمدے میں دھکیلا اور خود نہانے چل دیا۔ واپس نکلا تو باورچی خانے سمیت دونوں
کمروں میں کڑوا دھواں چکراتا پھر رہا تھا۔ عینی سے چراغ مانگا۔ سب کھڑکیاں دروازے کھولے
اور چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ کھانا سامنے آیا تو اس میں بھی دھوئیں کا تڑکا۔ باآواز بلند کھانے کی تعریف کی
ذائقے کو سراہا۔ جواباً برتنوں کے پٹخنے کی آوازیں کمرے تک آتی رہیں۔ وہ نوالہ منہ میں رکھے جی
بھر کر مسکراتا رہا۔ کھانا جیسا بھی تھا، اس میں گھر کا لطف موجود تھا۔

"اور ہم بھی کس ڈھنڈار سے گھر میں رہتے ہیں۔ نہ کبھی گھر میں چولہا جلا..... نہ دھوئیں کی
خوشبو حلق میں اتری، نہ کبھی سالن کا تڑکا مہکا....." اس نے ہولے سے سر جھٹکا۔

"دو بھائی تھے، دونوں ہی چھڑے چھانٹ۔ بازار کے برگر، ہوٹلوں کی بریانی، گھر کے کھانوں

کامزہ عرصہ ہوا بھول چکے تھے۔"

عینی ٹرے اٹھا کر لے گئی تھی۔ وہ وہیں پاؤں پسار کر لیٹ گیا۔ سرہانے رکھے میز پہ چراغ روشن تھا۔ نیم تاریک کمرہ..... دروازے سے آئی ٹھنڈی ہوا کے اکا دکا جھونکے ہولے ہولے برتی بارش..... شور مچاتا پرنالہ..... برابر کا کمرہ خالی تھا۔ ساری آوازیں باورچی خانے سے آرہی تھیں۔

باتوں کی' دبی دبی ہنسی کی' برتنوں کے آپس میں ٹکرانے کی اور کبھی کبھی بے ساختہ بلند ہوجانے والی نسوانی قہقہے کی آواز۔

"ایک ہنستے بستے گھر کی ساری نشانیاں' عورت کا وجود ہی رونق اور خوشی ہے۔"

اس نے کروٹ بدلی' چارپائی ہولے سے چرچرائی تھی۔

"کہاں دیکھے تھے ایسے رنگ' محبت وشفقت کے' دعاؤں کے' روٹھنے' منانے کے۔ نادانیوں کے اور یہ مہرو۔" اس کا خفا خفا سا چہرہ نیند بھری آنکھوں میں اترا تو ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی اچھوتے سے خیال میں ڈوبا نجانے کب وہ نیند کی وادیوں میں جا اترا۔ ٹپ..... ٹپ..... ٹپ

رات کسی پہر بارش کی جلترنگ قریب ہی بجنے لگی تھی۔ اس نے ذرا سا کسمسا کر کروٹ بدلی۔

ٹپ..... ناک کی پھننگ پر کوئی ٹھنڈی سی چیز گری پھر پیشانی پر۔ یک لخت ہی دونوں آنکھیں کھل گئیں۔ اگلا قطرہ گرنے تک وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ چھت ٹپک رہی تھی بلکہ جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی۔

وہ چھلانگ لگا کر چارپائی سے اترا' بستر لپیٹ کر ایک کونے میں رکھا۔

چراغ بجھا ہوا تھا۔ کمرے میں گھور تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا' بچتا بچاتا برآمدے میں نکل آیا۔ یہاں آکر احساس ہوا..... بارش ایک بار پھر زور پکڑ چکی تھی۔

بادلوں کی گرج' بجلی کی چمک' چھوٹے سے آنگن میں پانی چھما چھم برستا جا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں مسلیں پھر اندازے سے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔

"پتا نہیں کہاں سے ملے گی ماچس یا کوئی لائٹر وغیرہ۔" گھر والوں کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا تھا مگر دوسرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ لالٹین اور چراغ دونوں روشن۔

اہل خانہ آرام وسکون سے بے نیاز۔

کمرے کا سارا سامان بے ترتیب' سنگھار میز کمرے کے وسط میں۔ کرسیاں پلنگ پر اوندھی پڑی تھیں۔ کوئی دھلے کپڑوں کی گٹھری بنا رہا تھا کوئی کتابوں کی الماری خالی کرنے پر مامور۔۔

...ں میں کھڑا وہیں کھڑا رہ گیا۔
...بنے میں تھے وہ سب لوگ مکان کے عقب میں کوئی نیا گھر بنا تھا۔ دیوار پوری
کس قدر پریشانی میں پانی بیچ کی دراڑیں بھر کر خستہ مکان کی بنیادیں تک ہلائے دے رہا تھا۔ چھت چھلنی
...طرح ملی نہ تھی۔ ...
...تھی' گویا دو طرفہ عذاب وہ کشش وپنج میں کھڑا رہا۔
"اندر جاؤں؟ ایسے وقت میں کیا مدد کر سکتا ہوں ان کی؟" کچھ دیر کو سوچا پھر وہیں سے
...پلٹ آیا۔

تاریک کمرے میں چارپائی پہ بیٹھا رہا' ساتھ کے کمرے میں ٹپکتی چھت کے نیچے کوئی برتن رکھا گیا تھا۔ بے ہنگم سی جلترنگ بڑی واضح تھی۔ جتنی دیر تک ساتھ کے کمرے میں اٹھا پٹخ ہوتی رہی، وہ بھی بے قراری سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بڑی دیر بعد برآمدے میں چارپائیاں بچھانے کی آواز آئی۔ بارش ہلکی ہوتے ہوتے بالآخر رک گئی تھی۔ ایک ہلکا سا سکوت چاروں اور پھیلا تو وہ بھی ...ڈھنگ سے سویا۔

○ ○ ○

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا۔
بجلی آ گئی تھی اور چھت پہ لگا پنکھا متوازن رفتار سے گھوم رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی تو احساس ہوا کھری چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ چند لمحے یونہی کسلمندی سے پڑا رہا پھر سر اٹھا کر جالی کے ...پردے سے باہر جھانکا۔
باہر صبح کی گہما گہمی جاری وساری تھی۔
صحن کے بیچوں بیچ مہرو ایک ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑی تھی' دوسرا ہاتھ کمر پہ۔
کہاں سے شروع کروں' کہاں پہ ختم.....؟ ارے او سنتی ہو۔ نورالعین.....! ذرا لے کر آؤ ...گھر بھر کے چراغ..... ہم بھی مانجھ' رگڑ کر دیکھ لیں۔ کیا خبر کوئی چھوٹا موٹا جن بھوت ہمارے قبضے میں آ جائے۔ چٹکی بجائیں اور ساری دھول مٹی غائب۔"
جواباً نورالعین تو نہ بولی' البتہ اماں نے اسے سخت سست کہتے ہوئے چار چھ باتیں ضرور سنا ڈالی تھیں۔

"سست وست نہیں ہوں میں' نلکے سے بالٹیاں بھر بھر کر صحن دھونے میں کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ اب ایسی نازک کمر....."
معروف حسن کے کمرے میں ذرا سا کھٹکا ہوا تھا۔ لب بھینچ کر فوراً ہی شرافت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

وہ تولیہ کندھے پہ ڈالے باہر نکلا۔ چپل گھسیٹتا' جمائیاں لیتا۔ خالی بالٹی نلکے کے سامنے ر
چلایا اور پھر کپڑے نکالنے کمرے میں چلا گیا۔

مہرو نے کن اکھیوں سے دیکھا' یکا یک ہی شرارت سوجھی۔ پانی سے لبالب بھر
برآمدے تک لائی۔ چھپاک چھپاک جھاڑو چلا۔ معروف حسن واپس آیا تو بالٹی خالی۔

کپڑے باتھ روم کی کھونٹی پہ لٹکائے' دوبارہ سے بالٹی بھری' یاد آیا ابھی شیو بنانی ہے
اٹھایا' نیچے چھت کے مہمان خانے میں جا گھسا۔ خوب دل لگا کر شیو بنائی' جھاڑو کا شور بند ہ
پھر بالٹی بھری۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جھٹ سے ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ جاتے جاتے پلٹ کر
بڑے مزے سے تیسری بالٹی بھی اپنے قبضے میں کر رہی تھی۔ بے اختیار ہی مسکراہٹ لبوں کو
اسی مسکراہٹ کے ساتھ بیرونی دروازہ کھولا تو ذرا سا چونک گیا۔

اپنی ہی جان پہچان کا آدمی تھا۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا' عینی سے چائے کا کہہ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے
ہی خوش خبری سنائی۔

"مبارک ہو' تبادلے کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ سامان باندھ کر چلنے کی تیاری کرو

"کیا.....؟" پل بھر میں اس کا چہرہ اتر گیا۔

"ہاں ہاں' سچ کہہ رہا ہوں۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی لیکن تم جانتے ہو' ہم تو یاروں
ہیں۔" وہ جوش سے بتا رہا تھا پھر جلد ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چائے....."

"نہیں پھر کبھی....." وہ عجلت میں نکل گیا۔

معروف حسن کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اب کس کا دل چاہتا تھا یہاں سے جانے کو۔ اس
انگلیوں سے پیشانی مسلی۔

بارش کی سیلی سی نمی کمرے کے فرش پہ چکراتی پھر رہی تھی۔ نیم تاریک کمرہ' ٹھنڈی
کھڑکیوں پہ لٹکتے جالی دار پردے' پلنگ پہ بچھی مٹے مٹے پھولوں والی صاف ستھری چادر'
میں دھرے چراغ' گلدانوں میں سجے کاغذی پھول' دیوار پہ سجی مسجد نبوی ﷺ کی تصویر'
آئینہ۔ اس نے ایک ایک چیز کو نظر بھر کر دیکھا۔

جی چاہا تھا ساری عمر کے لیے یہیں رہ جائے۔

دروازے پر عینی چائے کے لیے دستک دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ چھوٹی ت

دو کپ چائے اور بسکٹ۔

"مہمان تو چلا گیا ہے۔"

"ہائیں..... اتنی دیر تو نہ ہوئی تھی چائے بنانے میں۔" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں' اسے جلدی تھی۔" معروف حسن کی سنجیدگی پہ عینی کندھے اچکاتی واپس پلٹ گئی۔

صحن میں آیا تو مہرو مزے سے صحن اور برآمدہ چمکائے انگوروں کی بیل درست کر رہی تھی۔

"کیوں ہر وقت' ہر چیز کو باندھنے کے چکر میں رہتی ہو۔" وہ اس کے سر پہ جا کر درشتی سے بولا
دیوار کے ساتھ بیل کو باندھتے ہوئے اس نے ناراضی سے معروف کو دیکھا۔

"کیا مطلب.....؟"

"ہونہہ..... معصومیت..... ایک یہ ہی تو باندھ رہی ہے مجھے اس گھر کے در و دیوار سے۔" وہ
خوامخواہ ہی چڑ گیا۔

"اتنی بالٹیاں تمہارے لیے نہیں بھری تھیں۔ جلدی سے پانی بھر کے غسل خانے میں رکھو' مجھے
دیر ہو رہی ہے۔" کس انداز سے حکم چلا رہا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو مہرو بھی ٹکا سا جواب دے دیتی مگر اس وقت یوں بول رہا تھا کہ اسے
انکار میں خطرہ محسوس ہوا۔ منہ بنایا لیکن نلکا چلانے کے ساتھ ساتھ۔ اس نے عینی کے ہاتھ سے
ٹرے لی اور چائے کے دونوں کپ پی لیے۔

اماں چھت کی مرمت کر رہی تھیں۔ یہاں ہوتیں تو ضرور ہی کچھ نہ کچھ اگلوا لیتیں۔

چائے پیتے ہی وہ اٹھا اور بغیر نہائے باہر نکل گیا۔

مہرو اور عینی نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا پھر کندھے اچکا کر اپنے اپنے کاموں
میں لگ گئیں۔

شام میں واپس آیا تو بھی موڈ خراب..... کھانا محض چکھ کر واپس کر دیا۔ چائے سے انکار،
کپڑے بغیر استری کیے ہی پہن لیے۔

لڑکیاں حیران، اماں پریشان۔ جاپانی گڑیا پریشانی کا سبب جاننے کو معروف حسن کے چاروں
لہراتی پھری۔

زیب النساء نے اس کے پسندیدہ گانوں پر ریڈیو کی آواز بڑھا کر دیکھ لی۔ مہرو کے ہاتھ سے
برتن گر گر کر شور مچاتے رہے مگر کمرے کی تاریکی میں کوئی ہلچل نہ مچی۔

تب اماں اس کے پاس گئیں، بالوں میں انگلیاں چلائیں، ماتھا چھو کر دیکھا۔ یوں کمرے میں
بند رہنے کی وجہ پوچھی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں۔" مختصر جواب۔

اماں کو یقین تو نہ آیا۔ بس اس پہ اعتبار کر کے باہر آ گئیں۔ گرما گرما چائے تیار کی۔ نمکو
کے ساتھ ڈسپرین کی گولی لے کر اس کو کھلانے آ پہنچیں۔

وہ بجھا بجھا سا اٹھ بیٹھا۔

آنکھوں میں سرخی لیے اماں کا دل رکھنے کو چند بسکٹ نگلے اور گولی کھا کر پھر سے چارپائی پہ
گیا۔ شام میں ذرا ٹھنڈک ہوئی تو اٹھ کر گھر سے باہر۔

رات گئے واپسی ہوئی۔

اس کی اور اماں کی چارپائی صحن میں ہوتی تھی اور لڑکیاں کمرے میں۔

آج مہرو کو جانے کیوں حبس زدہ کمرے میں نیند ہی نہ آ رہی تھی۔ معروف حسن نے ا
چارپائی سنبھالی تو آ کر اماں سے شکایت کرنے لگی۔

"اتنی گھٹن ہے کمرے میں، اتنا حبس..... ہم کیسے سوئیں؟" اماں کے جواب دینے سے قبل
معروف حسن ایک جھٹکے سے اٹھا۔ تکیہ، چادر اٹھائی اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

"ہائیں..... اسے کیا ہوا؟" اماں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں۔

"خدا معلوم۔ صبح سے کیا کھائے بیٹھے ہیں؟" مہرو چڑ گئی۔

چھت پر نہ پنکھا، نہ چارپائی، چار دیواری تک تو تھی نہیں۔

اماں ہانپتی کانپتی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچیں۔

چٹکی چاندنی میں تکیہ منڈیر پہ رکھے..... گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھا تھا۔

"یا اللہ خیر! معاملہ کیا ہے.....؟ اتنی بے چینی ناراضی آخر کس لیے؟" وہ سچ مچ ہول گئیں۔

ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔

"دیکھ معروف حسن.....! آرام سے بتا دے مجھے، کیا پریشانی ہے؟ ورنہ میں پیٹ ڈالوں
تجھے..... سمجھے؟"

کس مان بھرے لہجے میں ڈانٹا تھا انہوں نے۔

معروف حسن چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار ہی سسک اٹھا۔

"مجھے اپنا بیٹا مان لیں اماں! میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔" ان کے دونوں ہاتھ بڑی
جکڑ رکھے تھے، لہجے میں التجا۔

"ماں صدقے جائے۔ کون بھیج رہا ہے تجھے، جب تک نوکری ہے جب تک تو یہاں
رہنا چاہتا ہے رہ..... تجھے کون روکتا ہے.....؟ اماں کا دل پسیج گیا۔ آواز بھر آ گئی۔

کتنی ہی دیر تک وہ اسے اپنے ممتا بھری محبت اور خلوص کا یقین دلاتی رہیں۔ وہ آنسو پونچھے
شرمندہ شرمندہ سا بیٹھا رہا..... کیسی بات کہہ دی تھی۔

"مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔" معلوم نہیں اماں سمجھ نہیں پائی تھیں یا سمجھ کر انجان بن گئیں۔ سارا وقت
معروف حسن کی مرحومہ ماں کی اپنے ساتھ دوستی اور مروت کے قصے سناتی رہیں..... اس نے بھی اسی
پہ اکتفا کیا۔ کافی وقت بیت گیا تب اماں اسے سمجھا بجھا کر نیچے لے آئیں۔

مہرو بڑے مزے سے معروف حسن کی چارپائی پہ استراحت فرما رہی تھی اماں نے فوراً آگے
بڑھ کر اس کے بازو پہ چٹکی بھری تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا.....؟" ہرنی جیسی آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہونہہ..... جادوگرنی....." معروف نے منہ پھیر لیا۔

اماں نے مہرو کو اپنے بستر پہ دھکیلا پھر اس کے بستر کی ساری شکنیں درست کیں..... وہ پہلو
کے بل لیٹ گیا۔

پھر۔

نجانے کتنا وقت بیت گیا۔ رات بھیگ گئی..... ہوا میں مستی سی آ گئی..... آنگن میں بکھری
چاندنی دھیرے دھیرے سانس لینے لگی۔

تب ساتھ کی چارپائی پہ کسی نے کروٹ بدلی.....

چوڑیاں ہولے سے کھنکیں..... چارپائی چرچرائی..... بہت دیر سے جاگتے ہوئے معروف حسن
نے گردن گھما کر دیکھا۔

وہ اماں کے دوسری جانب لیٹی تھی۔ نیند میں گم صرف اماں کے گرد حمائل بازو دکھائی دے رہا
تھا..... دودھیا کلائی میں بھری چوڑیاں۔

"جانے کس رنگ کی ہیں.....؟" اس نے سوچا پھر کروٹ بدل لی۔

نیند تو اب بھی نہ آئی تھی۔

بستر سے اٹھتی کوئی لطیف سی خوشبو۔ معروف حسن کو لگا وہ ساری رات اسے جگائے رکھے گی۔

○ ○ ○

صبح معمول کے مطابق ہوئی تھی۔ بس آج معروف حسن کو جگانے کے لیے اماں کو کوئی تردد نہ
کرنا پڑا تھا۔ وہ خود ہی سیر سے آ کر نہا دھو کر..... اپنے معمول کے وقت سے پہلے تیار ہو چکا تھا۔

شروع شروع میں ہر روز پراٹھے کے ساتھ آملیٹ موجود ہوتا تھا۔ براؤن براؤن سا..... خستہ
کرارا ہری مرچوں کا ذائقہ لاجواب ہوتا تھا۔

ایک دن یونہی زیبی کو کہتے سن لیا۔

''عینی کی بچی! پورے پانچ روپے کا انڈا..... اور تم مزے سے تل کر کھا گئیں۔ اماں نے گِن کر
رکھے تھے۔'' تین روز تک معروف حسن کے ناشتے میں مکمل بے فکری۔

اسے دکھ ہوا تھا۔

''خوامخواہ میرے لیے اتنا تردّد اتنی فکرمندی۔''

کوئی کمانے والا تو گھر میں تھا نہیں، سلائی، کڑھائی سے ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

اگلی صبح ناشتے میں آملیٹ کی پلیٹ پرے کھسکا کر پراٹھے پر اچار رکھا اور مزے سے کھا گیا۔

''روز آملیٹ کھا کھا کر گرمی ہوگئی ہے۔'' بہانا اچھا تھا، سو بعد میں اچار، پراٹھا اور چائے
رات کی ترکاری۔

''اور آج.....؟'' اس نے ناشتے کی ٹرے سامنے کھسکائی۔

خوشبودار آملیٹ کے ساتھ دو پراٹھے ہضم کیے چائے کا بڑا سا پیالہ۔

اماں اسے ناشتے میں مگن دیکھ کر باہر جا چکی تھیں۔

کافی دیر بعد وہ باہر نکلا..... ساز و سامان سے بھرا بیگ ہاتھ میں۔

اماں عینی کے ساتھ مرغیوں کو لہسن کھلا رہی تھیں۔

زیبی کڑھائی میں جتی ہوئی، مہرو ریڈیو کھولے بیٹھی تھی..... پیچ کس ہاتھ میں، کتنے دنوں
اس کی آواز بند تھی سمجھو کاروبار دنیا ہی معطل ہو کر رہ گیا تھا۔

صحن کے بیچ میں آ کر وہ کھنکھارا۔

یونہی سرسری سی نگاہیں اٹھیں..... پھر جیسے اس پر ٹھہر سی گئیں۔

''یہ کیا.....؟'' اماں کا اشارہ ہاتھ میں پکڑے بیگ کی طرف تھا۔

''تبادلہ ہوگیا ہے، واپس جا رہا ہوں۔'' بیگ ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

اماں ایک پل کے لیے خاموش ہو رہیں۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس تک آئیں۔

''اللہ سکون آشنا رکھے..... جہاں بھی رہو خوش رہو۔ تنگی، ترشی میں بری بھلی کاٹی
نے..... دل میں گلہ شکوہ مت رکھنا۔ ہم سے جہاں تک بن پایا.....؟

''اماں! شرمندہ مت کریں۔ بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' اس نے بے قرار
ٹوک دیا تھا۔

اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ جانے کیا کشش تھی اس بچے میں کہ دل کھنچتا تھا اس کی جانب
اس گھر میں پیدا نہ ہوا تھا مگر اسی چاردیواری کا باسی لگتا تھا آگے بڑھ کر پیار بھری تھپکی

دعاؤں سے نوازا۔

جاپانی گڑیا کی ناک خوامخواہ سرخ ہوئی جا رہی تھی..... زیبی دھاگے میں آئی گرہ کو پریشانی سے
تک رہی تھی..... ریڈیو کے ننھے منے پیچ بکھر گئے تھے..... مہرو سب کی طرف سے رخ موڑے
ابھی کھوج رہی تھی۔

معروف حسن نے ایک الوداعی نظر سب پر ڈالی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ڈیوڑھی پار کر گیا۔

چاروں نفوس خاموشی کی چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ لیکن گھر مختلف آوازوں سے گونجتا رہا۔

''ارے جاپانی گڑیا..... رات بھر میں تمہاری ناک مزید جاپانی کیسے ہوگئی؟''

''ارے اماں! اچار کا جھنجھٹ کیوں.....؟ آموں کا مربہ بنائیے..... گٹھلیاں میں نکال دیتا
ہوں۔''

''کچھ لوگ کتنے نخریلے، نک چڑھے اور بدمزاج ہوتے ہیں۔''

''اس گھر کی چائے لاجواب' لطف انگیز۔''

زندگی سے بھرپور لہجہ' خوش آواز اپنائیت کی چاشنی۔

اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر سبزی لینے چل دیں۔ عینی افسردہ بیٹھی تھی۔

مہرو نے ریڈیو بند کرنے کے بعد چلانے کی کوشش کی..... بٹن گھمائے دو چار دھپ لگائے
لیکن ہلکی سی کھڑ کھڑ کی آوازوں کے بعد خاموشی چھا گئی..... اس نے بے دلی سے ریڈیو ہیں
برآمدے کے تخت پہ چھوڑا اور باورچی خانے میں آ کر لکڑیاں سلگانے لگی۔

O O O

معروف حسن کو گئے دو سے تین دن بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک اجنبی خاتون آن وارد ہوئیں۔

''جان نہ پہچان..... میں تیرا مہمان۔'' وہ ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں داخل ہوئیں۔ زیبی اور
مہرو کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔

عینی اس ناآشنا چہرے کو دیکھ کر گھبرا گئی جو بڑی بے تکلفی سے آنگن میں کھڑی چہار جانب دیکھ
رہی تھیں۔ بھاگم بھاگ کمرے میں گئی۔ سوئی جاگی اماں کو اٹھا کر مہمان کے روبرو لا کھڑا کیا۔

''پہچانا نہیں بہن.....!'' اماں نے بغور جائزہ لیا۔

''معروف حسن نے بھیجا ہے..... دیوار سے دیوار ملی ہے ہمارے گھر کی۔'' تعارف مختصر لیکن
جامع تھا۔ اماں انہیں کمرے میں لے گئیں۔

''خیریت تو ہے ناں؟ معروف حسن کو گئے چند روز ہی تو بیتے ہیں۔''

"ہاں ہاں..... خیریت ہی خیریت ....." خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا پھر کمرے کا جائزہ
لینے میں مصروف ہو گئیں۔
چارپائی پہ ہلکے سبز رنگ کی جھالروں والی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیے پہ پر پھیلائے ناچتے مور کی
تصویر کڑھی ہوئی تھی..... میز پوش پہ رنگ برنگے دھاگوں میں پھدکتی چڑیاں، دائیں جانب دیوار
کے ساتھ چھ کرسیاں۔ ان کے اوپر مصنوعی پھولوں کی بیل دیوار پر دور تک جا رہی تھی۔
داخلی دروازے کے ساتھ دو موڑھے پڑے تھے ان کے ساتھ چھوٹی سی میز پر سرخ تہبند
کرتے میں، مٹکا پکڑے مٹی کی مٹیار..... کمرے میں لگا وال کلاک اپنی سوئیوں کی گھسی ہوئی آواز
ٹک ٹک سے کمرے کی خاموشی میں لحظہ بہ لحظہ ارتعاش پیدا کر رہا تھا..... چھت پہ گھومتے مٹیالے
پنکھے کی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں۔
بہت پُرسکون کمرہ تھا۔
خاتون ٹانگیں سیدھی کر کے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔
اماں اس دوران اٹھ کر کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد چائے کے ساتھ آمد ہوئی۔
بازار کی دہی پکوڑیاں..... گھر میں بنی آلو کی ٹکیاں ..... میٹھے بسکٹ اور ابلے ہوئے
انڈے، بھاپ اڑاتی الائچی میں پکی خوشبودار چائے۔
سفر کی تھکاوٹ پل بھر میں دور ہوتی محسوس ہوئی۔
"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ آج کے دور میں مہمان نوازی..... سمجھو میرے اور تمہارے جیسے سفید
پوش طبقے میں ہی باقی رہ گئی ہے۔ ہماری ایک خالہ زاد لاکھوں کی کوٹھی میں رہتی ہیں..... نوکر چاکر
روپیہ پیسہ کسی چیز کی کمی نہیں پھر بھی ہمیشہ خالی بوتل پر ٹرخا دیا۔ میں تو کہوں کھانے کا لالچ کے
ہے۔ اپنے گھر میں سب ہی کھاتے پیتے ہیں یہ تو بس اپنے اپنے دل....." وہ ادھر ادھر کی باتوں
میں الجھیں۔
اماں کے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ ان کی آمد کا مقصد ابھی تک سمجھ سے باہر تھا۔
اس وقت زیبی اور مہرو بھی آ گئیں..... سلام دعا ہوئی۔
خاتون عینک کے پیچھے سے جھانکتی رہیں۔
"اے بہن.....! منجھلی کون سی ہے.....؟" بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
"خیر سے دونوں ہی بہت پیاری ماشاء اللہ مغل شہزادیوں سی....." ان کے تو گویا منہ میں پانی
بھرا جا رہا تھا۔
اماں کے اشارے پر مہرو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا..... تھوڑی بہت گفتگو ہوئی۔ پھر

حیران..... اماں جز بز۔
"بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کو بٹھا لیا اپنے پاس۔" وہ تلملاتی رہیں..... اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا
تھا۔ چوری چھپے مہرو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنے کپ میں پڑی باقی ماندہ چائے حلق میں انڈیلنے
لگیں۔ مہرو اٹھ گئی۔ تب خاتون نے مدعا پیش کیا۔
"بڑا بھائی شہر سے باہر..... ماں باپ کا سایہ سر پہ نہیں اس بچے نے بڑی ذمہ داری سونپی
مجھے۔ میں اس کی شکر گزار اب آپ کے سامنے بیٹھی ہوں، دامن پھیلائے۔ ہماری عرض قبول کیجیے
بن ماں باپ کا بچہ اس کا گھر بس جائے گا۔" ان کے لہجے کی لجاجت، نرمی، عاجزی۔
اماں کا دل بھر آیا۔ ہیرے موتی سے بڑھیا چیزیں گھر میں سنبھال رکھی تھیں، گدڑی میں لعل۔
"دیکھا بھالا لڑکا ہے..... بچپن سے آج تک کبھی کوئی غلط بات ان دونوں بھائیوں میں نہ
دیکھی، ہم نے پان سگریٹ تک کو تو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔" اماں کو چپ دیکھ کر انہوں نے بات آگے
بڑھائی۔
"وہ تو ٹھیک ہے..... خیر سے میری زیبی بھی..."
"نہ بہن! مہرو کی بات کرتی ہوں....." انہوں نے ایک دم اماں کو ٹوک دیا تھا۔
"لیکن زیبی، مہرو سے بڑی ہے۔" اماں کی پریشانی ناحق نہ تھی۔
"معروف حسن کی یہ ہی خواہش ہے..... مہرو کا نام لیا تھا اس نے..... سچ پوچھو تو اتنا بے چین
و بے قرار میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آسمان پہ بنا ہے ان کا جوڑا، جو ایسی ہڑک اس کے دل
میں جاگی..... ورنہ زیبی کسی طور مہرو سے کم تو نہیں اللہ کا نام لے کر رشتہ جوڑ دو..... زیبی کے لیے
میں خود کوشش....."
اماں کی آنکھیں بھر آئیں..... دل بے چین ہو گیا وہاں سے اٹھیں..... سیدھی غسل خانے
میں..... رو رو کر آنکھیں لال انگارہ کر لیں.....
"زیبی کیا کہے گی.....؟ کیا سوچے گی.....؟ اپنے ہاتھوں چھوٹی بہن کی رخصتی..... دل کو کیا
کیا نہ ٹھیس پہنچے گی..... ارمان، خواہش، خواب۔" ہچکیاں لیتی رہیں۔
عینی نے دوبارہ آ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔
"اماں! نکلیے بھی..... مہمان کے لیے کھانا۔" ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا لمبی سانس بھری
اور غسل خانے سے باہر نکل آئیں..... آدھے صحن میں دھوپ بھری تھی..... آدھے میں
پھوار..... گندم دھو کر دھوپ میں ڈالی تھی..... اب پوری طرح سوکھ چکی تھی۔
"عینی سے کہتی ہوں، بوری میں بھر دے پسوانے بھیج دوں۔"

انہوں نے دوپٹے میں بندھی گرہ کھول کر پیسے گنے۔

منڈیر پہ بیٹھا کوا کائیں کائیں کیے جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں برتنوں کی کھٹ پٹ..... زیبی کی باتیں' مہرو کی کھلکھلاہٹیں' عینی کے مشورے۔

"خود ہی کوئی انتظام کر بیٹھی ہیں شاید۔"

وہ تھکے تھکے قدموں سے ڈیوڑھی تک آئیں..... دروازے سے باہر جھانکا۔ گلی کے لڑکوں کا ٹولہ سامنے سے گزر رہا تھا۔ ایک بھلے لڑکے کو پکار کر پیسے اسے تھمائے۔

"ایک کلو مٹھائی۔"

"خیریت خالہ جان.....!" خوشدلی سے استفسار کیا گیا۔

"ہاں.....!" آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے کو بے تاب "تمہاری آپا مہرو کی بات طے ہو گئی ہے۔"



ٹھن..... ن..... نزدیک ہی کہیں زوردار آواز کے ساتھ تھالی فرش پہ گری اور گول گول گھومتی ہی رہی پھر یک لخت ہی کسی نے اس منحوس آواز کا گلا دبا دیا جو تیسرے دن کی دلہن کو مدھری نیند سے بیدار کرنے جا رہی تھی بلکہ بیدار کر کے جا رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی دل زور زور سے دھڑکا' پورے بدن میں ایک لمحے کے لیے کپکپی سی دوڑی..... اگلے ہی پل اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس بھیانک' کریہہ آواز پر ہزار لعنت بھیجی' اور پھر سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

چند لمحے بیت گئے..... باہر سے کھٹر پٹر کی آوازیں آئیں۔

آنکھیں ایک بار پھر جھٹکے سے کھلیں..... پلکیں پٹپٹائیں..... دوسرے لمحے بستر سے نیچے اتری چپل اڑسی..... دوپٹا گھسیٹا اور باہر کو لپکی۔

دن خوب نکھر چکا تھا۔

اماں کی نصیحتیں' ڈراوے' سکھائی پڑھائی پٹیاں سب یاد آ گئیں۔

باورچی خانے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے ادھر جھانکا۔

تیسرے دن کے دولہا میاں محض ٹراؤزر بنیان پہنے' دلہن کو اپنے ہاتھ سے بنا ناشتہ کرانے کے شوق میں آٹے سے لتھڑے ہاتھ لیے اب قدرے شرمندہ شرمندہ کھڑے تھے۔

"وہ..... میں۔" ہکلا کر آئیں بائیں شائیں ہونے لگی۔

وہ انگلیاں مروڑنے لگی..... شرمندگی کے اظہار کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔

"نہیں..... ہر روز تو ایسا نہیں ہوتا..... وہ تو بس آج ہی....." دوسری جانب سے وضاحتی سلسلہ جاری تھا۔ چائے ابل کر چولہے پر آ رہی تھی..... ٹوٹا ہوا انڈا فرش پہ..... پرات سے باہر سوکھے' گیلے آٹے کی بہار..... چینی' پتی کے ڈبے کھلے ہوئے۔

او..... اوکر کے چولہا بند کرتے ہوئے ذرا سی چائے ہاتھ پر بھی گرا لی۔

"اوف۔" وہ ہاتھ دبا کر دہرا ہو گیا اور بس اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔

سونے کا کنگن چولہے چوکی میں میلا پڑ جاتا..... اتار کر میاں کے ہاتھ میں دیا..... زرتار دوپٹہ اتار کر اس کے کندھے پہ رکھا..... چوٹی کو بل دے کر جوڑے کی شکل دی..... ہاتھ منہ دھویا قمیص کے بازو چڑھائے اور شروع ہو گئی۔

بڑے بھیا نے باورچی خانے میں جھانکا۔

میاں صاحب سرخ آنچل اوڑھے کھڑے ہیں۔ بیگم صاحبہ کے نازک' مہندی لگے ہاتھ فٹافٹ پراٹھوں کے بل ڈال رہے ہیں۔ دوسرے چولہے پر آملیٹ بن رہا تھا۔

وہ کچھ سمجھے' کچھ نہ سمجھتے آملیٹ کی ذائقے دار خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے نہانے چل دیے۔

"روزانہ ناشتہ کہاں سے آتا تھا؟" ناشتہ کرتے ہوئے وہ معروف حسن سے پوچھ رہی تھی۔

"چوک کے ہوٹل سے چائے اور پاپے یا پھر ڈبل روٹی یا کبھی کبھار انڈہ کسی نہ کسی شکل میں بھیا کے ہاتھ سے بنا۔"

"ہائیں اور وہ جو گزشتہ دو دنوں سے ناشتے میں کباب' پراٹھے' مکھن کھا رہے ہیں اور دوپہر میں پلاؤ گوشت وہ سب؟"

"اچھا..... وہ؟" اس کی حیرت پر وہ ہنسا۔ "پڑوس والی خالہ بی کو شادی کے جوڑے بنانے کے لیے جو رقم دی تھی اس میں سے کچھ روپے بچ رہے..... کہنے لگیں..... دو چار دن کے کھانے کے کام آئے گی۔

دلہن کو آتے ہی گھر کے کاموں میں لگا دو گے کیا.....؟ مجھے کہاں منظور تھا۔ فوراً مان گیا اور پھر میں تو تمہیں بہت سست اور کاہل سمجھتا تھا۔ اماں بی سارا دن چیخا کرتی تھیں۔" وہ گزشتہ کسی بات کو سوچ کر ہنسا تھا۔ مہرو برا مان گئی۔

"اماں کی تو عادت تھی۔ حالانکہ گھر داری ہمیں گھول کر پلا چکی تھیں..... اتنی سی عمر میں گھر سنبھالنا شروع کر دیا تھا..... ہاں کچھ کاموں سے چڑتی تھی..... اماں وہی کرانے کے درپے ہو

جاتی تھیں..... میں نے بھی وہ کام کر کے نہ دیے..... نہ ہی آئندہ کروانے کی امید رکھی جائے۔"
عجب ڈھٹائی تھی قبل از وقت تنبیہ کی جا رہی تھی۔ معروف حسن سر جھکائے مسکراتا رہا۔



شادی کی چھٹیاں ختم ہوئیں۔ معروف حسن نیا نویلا جوڑا پہن کر مبارکبادیں وصول کرنے دفتر جا پہنچا تو مہرو نے بھی گھر کی صفائی ستھرائی کا قصد کیا' چھوٹا سا گھر تھا۔

چار کمرے' ایک باورچی خانہ' ایک غسل خانہ۔ تازہ تازہ قلعی کیا ہوا گھر دن کی روشنی میں خوب چمکتا تھا تو رات کو ہلکی سی چاندنی اس کا اجلاپن برقرار رکھتی تھی۔

دو کمروں میں اس کے جہیز کا سامان سیٹ تھا۔ ایک بیڈ روم' دوسرا ڈرائنگ روم' تیسرے کمرے میں کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ چوتھے پہ یہ بڑا سا تالا جھولتا تھا۔

معروف حسن خوب سمجھا بجھا کر گیا تھا۔

"خبردار اس کمرے کو ہاتھ بھی مت لگانا..... بڑے بھیا جلالی آدمی ہیں ایسی غلطی پر زمین و آسمان ایک کر کے تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس گھر سے نکال دیں گے۔ اس کمرے کو اپنی سلطنت کی حدود سے باہر ہی سمجھو۔"

اب معلوم نہیں اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ..... لیکن مہرو نے واقعی اس کمرے کو چھوڑ کر باقی سارا گھر شیشے کی طرح چمکا ڈالا تھا۔ جہیز کے بکسوں میں سے گلدان نکال کر میزوں پر سجائے نقلی پھولوں کی بیلیں سفید دیواروں پر بہار دکھانے لگیں۔ دروازوں پر جالی دار پردے لہرا گئے۔

"آہ..... اپنے گھر کا سکون' آزادی' خود مختاری۔" کام کرنے کا مزہ ہی الگ تھا۔

نہا دھو کر فارغ ہوئی۔ گیلے بال تولیے سے جھٹک جھٹک کر سکھائے..... دوپٹہ اتار کر ایک طرف رکھا اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ پیٹ پوجا کا انتظام بھی کرنا ہی تھا۔ اپنی ہی ترنگ میں جا کر بند الماری کے پٹ کھولے۔

"ہائیں!" اگلے پل دھک سے رہ گئی۔

نہ دال نہ اناج..... چند ایک خالی ڈبے..... کچھ برتن..... اور..... اور.....

"نہیں....." بھوک کی شدت اس صورت حال میں کچھ اور بڑھ گئی۔

اِدھر اُدھر تانک جھانک کی..... نہ اچار' چٹنی..... دودھ' دہی' چینی اور پتی البتہ موجود تھی۔ آٹے کا کنستر خالی..... گھی کا ڈبہ ندارد..... صبح پراٹھے خدا جانے کس مانگے تانگے آٹے سے بنے تھے۔

چپ چاپ' ٹھس ہو کر کمرے میں آ بیٹھی۔ ایک گھنٹہ گزرا..... دو گھنٹے' اڑھائی پھر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی اسٹول پہ چڑھ کر دیوار پار جھانکا آنگن میں خاموشی تھی۔

"کسی کو پکاروں' بلاؤں.....؟" دل میں سوچا مگر شرم سے کٹ کر رہ گئی۔

"اف' کیا سوچیں گے لوگ..... نئی نویلی دلہن..... اور دیوار پہ ٹنگی روٹی' پانی مانگ رہی ہے۔"

بے بسی سے ہاتھ ملتی واپس ہوئی..... پلنگ پہ گر کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند بھی کہاں آئی..... کبھی باہر کوئی کھٹکا سنائی دیتا کبھی معروف حسن کی گنگناہٹیں..... کبھی ذرا جھپکی آئی بھی تو اماں گرج اٹھیں۔

"اف معروف حسن! ایسا کیا گناہ تھا میرا..... جو یوں بھوکوں مار رہے ہو۔" کروٹ بدلتی رہی۔

"یا اللہ! میری بھی کوئی ساس ہوتی..... نندیں' دیور' جیٹھ بھرا پرا گھر ہوتا تو یوں فاقے کی سی نوبت تو نہ ہوتی..... کونوں کھدروں سے بھی کچھ نہ کچھ کھانے کو مل ہی جاتا۔" آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں میں تاریکی سی اترنے لگی تھی۔

"یا اللہ! ابھی مرنے کی عمر تو نہیں۔ معروف حسن تمہیں خدا سمجھے۔"

سورج غروب ہونے لگا تھا۔ اسے اپنی زندگی کا آفتاب بھی واپسی کا سفر طے کرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔



سیٹی پہ کوئی شوخ دھن بجاتا' جگمگاتی آنکھیں لیے وہ گھر میں داخل ہوا۔ آج دفتر سے گھر تک کا فاصلہ میلوں پھیل گیا تھا۔ حالانکہ اسے کتنی جلدی تھی گھر جانے کی۔ وہ چھوٹی موئی سی نازک لڑکی' نئی نویلی بنی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

کیا خوب رونق ہوگی گھر میں۔

بے آباد گلشن میں بہار..... لالہ صحرائی' رنگینی چمن' عجیب تشبیہات سوجھ رہی تھیں..... مگر گھر میں قدم رکھا تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔

کہاں تو وہ تصور میں روشنیوں سے جھلملاتے گھر میں اسے اِدھر سے اُدھر تتلی بن کر اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور کہاں برآمدے میں مریل سی زرد روشنی کو کونے کھدروں میں پہنچانے کی کوشش کرتا ساٹھ پاور کا بلب۔

صحن میں اندھیرا..... تو کمروں میں گھپ اندھیرا۔ اور پھر سنسان سی تنہائی۔

نہ حسب توقع بیر بہوٹی سے ملاقات ہوئی نہ کوئی تتلی بن کر آس پاس منڈلایا۔

"یا اللہ! کیا افتاد آن پڑی۔" اس کا دل ہول گیا۔ بھاگ کر کمرے کی بتی جلائی۔ خالی کمرہ۔ کوئی وہم پھنکارا' کسی خوف نے ڈسا۔ "مہرو۔" وہ بے قرار ہو کر پکارا۔ جواباً ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

"مہرو' مہرو۔" بے تابانہ انداز میں واپس پلٹا..... تپائی سے گھٹنا ٹکرایا..... پیر کے انگوٹھے دروازے کے کھلے پٹ سے ٹھوکر کھائی تب کہیں باورچی خانے میں پہنچا۔ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پہ بیٹھی وہ مسلسل سسکیاں بھر رہی تھی۔

"مہرو! مہرو کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ خیریت' ارے بھئی کچھ منہ سے پھوٹو کیا تماشا ہے یہ.....؟ گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ غصہ بھی بڑھا تو اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

جواباً وہ تڑخ کر بولی۔

"مر گئی آپ کی مہرو.....! کس جہنم میں چھوڑ گئے تھے مجھے؟"

"کس جہنم میں..... کیا مطلب' ہوش میں تو ہو؟"

"ہوش' مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں زندہ کیسے ہوں صبح سے' اف خدایا' اتنے گھنٹوں سے سوائے پانی کے....." ہچکیاں' آنسو ٹپاٹپ برس رہے تھے۔

"اوہ تو....." معروف حسن مارے صدمے کے گنگ ہو گیا۔

ایک پل کے لیے تو جی چاہا۔ اٹھے اور پوری قوت سے اپنا سر سامنے کی دیوار سے مارے۔

"اب کیا بتاتا اسے۔ یہاں تو برسوں سے یہ ہی صورت حال تھی۔ گھر میں کبھی کھانا بنانے پکانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی..... اور کھانا بنتا بھی کس کے لیے' بڑے بھیا ٹھہرے سدا کے مسافر..... سال کے چند دن گھر میں گزارتے..... چائے' بسکٹ' کافی' یہ ہی ان کا لنچ تھا' یہ ہی ڈنر..... بہت ہوا تو بازار سے کبھی کبھار بریانی یا برگر آ جاتا اور وہ تو ہمیشہ سے کھانے کا چور صبح اٹھ میں چائے ہوٹل سے آ جاتی دوپہر کا کھانا دفتر کی کینٹین سے رات کو کوئی ایک آدھ پھل اس کی جیب میں ہوتا کھایا پانی پیا اور اللہ اللہ خیر صلا۔

یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ پھولوں کی شہزادی کچھ کھاتی پیتی بھی ہے۔

"او بیچاری مہرو! اماں بی کے گھر میں کیسی خوشحال تھی۔ چٹنی' سلاد' تازہ سبزی۔"

اپنا جرم قبولتے ہوئے انتہائی نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا' پانی پلایا' کمرے میں بٹھایا

"ابھی آتا ہوں" کہہ کر باہر نکل گیا۔

اور..... مہرو نڈھال سی بیٹھی رہ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد واپسی ہوئی خوب بھرا ہوا شاپر ہاتھ میں۔ تلافی کے طور پر ساری بھاگ دوڑ خود ہی کی۔ برف لا کر کولر میں ڈالی آئسکریم کے کپ نکال کر برف میں رکھے۔

پلیٹیں' چمچ' گلاس' پانی۔

گرما گرم نان' چکن ہانڈی' رائتہ سلاد..... کباب وہ ازل کی بھوکی یوں شروع ہوئی۔ جیسے کبھی دم نہ لے گی۔

پیٹ بھرا تو زبان بھی فراٹے بھرنے لگی۔

آپ نے یہ کیا..... آپ نے وہ کیا۔ ہرگز معافی نہ ملے گی۔ ظالم جابر بھلکو بے پروا جن اور جانے کیا کیا۔ معروف حسن کھسیانی ہنسی ہنستا اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

"منظور..... قبول..... شکریہ۔"

سب کھا چکنے کے بعد ٹھنڈی ٹھار آئس کریم نوش کی گئی معروف حسن نے سونے کا قصد کیا۔

مہرو وضو کر کے مصلے پہ آ گئی۔ جی بھر کے اللہ کا شکر ادا کیا.....

"دن بھر بھوکی رہی تو کیا ہوا.....؟ ایسا مزے کا کھانا اللہ تیرا شکر۔"

خوب بل بل کر عبادت کی..... پھر آ کر معروف حسن کو جگایا..... اپنی زبان درازی پر معافی مانگی۔

"پاگل.....!" وہ نیند بھری آنکھوں سے مسکراتا کیسا اچھا لگ رہا تھا..... اپنا اپنا سا' مہرو تا دیر اس غافل کو دیکھتی رہی۔ پھر چارپائی پر آ لیٹی آسمان پر پورا چاند روشن تھا۔ مہرو کو بہت گہری نیند نے آ گھیرا تھا۔

O O O

"اوئی ماں! یہ سب کیا ہے.....؟" اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دالیں' سبزیاں' گوشت' دودھ' چاول اور انواع اقسام کے مصالحہ جات۔

"روفی بھائی کہہ گئے تھے آج سے گھر میں چولہا جلے گا..... سامان پہنچا دینا۔" کوئی نوعمر سا لڑکا تھا' بڑے اشتیاق سے اس کے مہندی رنگے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بل اور بقیہ پیسے بھی اسے تھمائے۔

"اوہ..... لیکن اتنا سب کچھ اچھا خیر ٹھیک ہے۔" اس نے لڑکے کو ٹالا پھر سوچ میں پڑ گئی۔

"اتنا سب کہاں رکھوں' کیسے سنبھالوں.....؟" الگ فکر آن پڑی۔ واپس ڈبوں میں ڈال کر رکھ دیں چاول اور بقیہ چیزیں بھی۔

"دو ڈھائی کلو دودھ گوشت اور ہری بھری سبزیاں۔ ارے مجھ سے پوچھ گئے ہوتے تو آرام سے ہی بنا دیتی..... دو بندوں کا خرچا ہی کیا ہوگا.....؟ اور یہاں محترم ہزار ڈیڑھ ہزار تو خرچ کر آئے ہوں گے۔"

ایک پل کے لیے سوچا..... آس پڑوس کے کسی فریج میں رکھوا دے..... پھر ایک نئی ترکیب سوجھی دیوار سے خالہ بی کو پکارا۔

"اتنے روز سے یہاں پڑی ہوں۔ کوئی بی بی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ ذرا قریب کے دو چار گھروں میں دعوت تو کہہ آیئے۔"

"ہائیں! تم کیوں کرو گی دعوت.....؟ وہ خود بلائیں گی تم کو دعوت پر۔"

"ارے نہیں ناں.....! میں سارا انتظام کر چکی۔ آپ مہربانی فرمایئے۔" اس نے اصرار کیا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

"کوئی پوچھنے' بتانے والا ہی نہیں..... کم عمری کی سمجھ..... میاں کا پیسہ یونہی لٹا دے گی۔" خالہ بی نے منہ بنا کر سوچا۔

شام گئے معروف حسن اپنی ہی ترنگ میں گھر میں گھسا۔ پھر ایک پل کو ٹھٹک کر رہ گیا۔

"ایسا اجتماع ہمارے گھر میں....." شرقاً غرباً نگاہیں گھمائیں۔

بہت سی خواتین کے بیچ میں وہ بھی نظر آ گئی۔

ہلکے کاسنی رنگ کا جوڑا پہنے خوب خوش باش لگ رہی تھی۔

کئی خواتین نے مڑ کر ایک ساتھ اسے دیکھا تو وہ ان ہی قدموں باہر آ گیا۔ بہت جھجک محسوس ہو رہی تھیں۔

سامنے ہوٹل پہ بیٹھ کر کچھ وقت بتایا..... خواتین ایک ایک کر کے گھر سے باہر نکلیں تب اس نے گھر کی راہ لی۔

محلے کی ایک بوڑھی بیوہ جھوٹے برتن دھو رہی تھی۔ ایک نوعمر لڑکی جھاڑو میں مشغول وہ خود کرسی پہ بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

"مہرو! یہ کیا ہے؟" اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ مہرو کا دل ایک پل کے لیے کانپا۔

"شاید غلطی ہو گئی....."

"وہ اصل میں.... ساری چیزیں خراب ہونے کا ڈر..... ویسے بھی میں نے سوچا۔ یہاں

تو کچھ تعلقات۔"

"ذرا ادھر آؤ نا!" وہ رعب سے کہتا کمرے میں چلا۔

مہرو کی جان پہ بن آئی۔

"دیکھیں..... کوئی ایسا خاص خرچا تو....." گھبرائی گھبرائی سی اس کے پیچھے داخل ہوئی تھی کہ اس نے جھٹ سے کلائی تھام لی۔

"یہ کاسنی رنگ پہلے کبھی کیوں نہیں پہنا..... ظالم غضب کی لگ رہی ہو۔"

"ہائیں' کاسنی رنگ؟" اس نے معروف کا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں شرارت سے دمک رہی تھیں۔

"ڈرامے باز....." اس نے آنکھیں دکھائیں پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کاسنی رنگ تو میں اکثر پہنتی ہوں۔ ہاں یہ سبز رنگ آج پہنا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" معروف نے کندھے اچکائے۔

o o o

بڑے بھیا تبریز حسن کئی مہینے بعد گھر لوٹے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ' صفائی ستھرائی بے مثال۔

معروف حسن گھر پہ نہیں تھا اور مہرو کہیں کمرے میں۔ وہ دیر تک کھڑے آس پاس دیکھا کیے۔

دیواروں سے لپٹی بیلیں' کیاریوں میں موتیے اور چنبیلی کے پودے' قریب ہی صاف ستھرے کونڈے میں بھرے پانی پہ ننھی چڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو' چڑیوں کی چہکار آنگن میں بندھی ڈور پہ پھیلے رنگین آنچل ان کے لبوں پہ بھولی بسری مسکراہٹ آن ٹھہری۔

اپنی مرحومہ والدہ کی یاد آ گئی..... ان کی زندگی میں گھر یونہی سجا سنورا رہتا تھا۔ معروف حسن تو بہت ہی چھوٹا تھا ان دنوں..... مگر وہ خود خاصے ہوش مند تھے۔ اماں کا نین نقشہ خوب اچھی طرح یاد تھا۔ ان کا پیار' ان کی محبت' شفقت انہیں یاد تھا سب ذرا ذرا۔

"بہت لمبا عرصہ تھا۔ لیکن بالآخر یہ گھر بھی بس ہی گیا۔" وہ گرد آلود جوتے جھاڑتے پلٹے تو اسے سامنے کھڑے پایا۔

آنچل سر پہ رکھے۔ شرماتی جھجکتی۔

انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا..... نجانے کیوں آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ کہے بناء اس کا ماتھا چوما اور جا کر اپنے کمرے کے دروازے پہ لٹکتا تالا کھولنے لگے۔

"بڑے بھیا! آپ خیریت سے تو رہے..... اتنے روز؟"

"ہاں خیریت رہی....." وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

"آپ کے لیے کھانا لاؤں یا چائے؟"

"نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے نرمی سے انکار کیا۔

وہ واپس پلٹ آئی۔

"اتنے دنوں بعد آئے ہیں..... کچھ نہ کچھ تو....." اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔ آئے گئے والا گھر تھا اب تو کچھ نہ کچھ بنا کر فریج میں رکھتی تھی۔ کباب نکال کر تلے..... آلو کے چپس بنائے اور املی کی چٹنی کے ساتھ رکھ کر ان کے کمرے میں لے آئی۔

پہلی بار ان کے کمرے میں آئی تھی۔ حیران پریشان کھڑی رہی۔

اخباروں' کاغذوں کے بڑے بڑے انبار..... کتابیں' کمپیوٹر' ہر چیز پر منوں مٹی۔ وہ بڑا سا چادر اٹھا کر اس کی مدد سے کرسی جھاڑ رہے تھے۔ کھڑکیاں بند..... سارا کمرہ گرد سے بھر گیا۔ اسے بے اختیار ہی کھانسی آ گئی تب وہ چونکے۔

"رہنے دیجیے بڑے بھیا! میں کر دوں گی ناں!"

"ہاں' نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔" انہوں نے کرسی سنبھال لی وہ ٹرے ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل آئی۔

○ ○ ○

"اف خدایا! یہ بڑے بھیا آخر چیز کیا ہیں؟ سارا سارا دن کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ چڑیا جتنا کھاتے ہیں۔ رات' رات بھر کمرہ روشن رہتا ہے اور کمرہ دیکھیے جا کر..... دم گھٹنے لگتا ہے۔ پل بھر ٹھہرنا مشکل....." وہ آنگن میں چارپائی پہ جا بیٹھی' معروف حسن کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔

"بس شروع سے ایسے ہی ہیں۔ اخبارات میں لکھتے لکھاتے ہیں۔ چار' چھ مہینے کمایا' اور رسالہ بھر اڑایا۔" وہ نیم غنودگی کے عالم میں بول رہا تھا۔

"لیکن اڑاتے کہاں ہیں..... اور اتنا عرصہ غائب؟"

"ملکوں' ملکوں پھرتے ہیں..... دیس دیس کی خاک چھانتے ہیں۔ مگر نجانے کیوں ڈھنگ قرار نصیب نہیں یہ تو تمہارے بھاگ ہیں کہ اس بار جلد لوٹ آئے ورنہ تو۔" وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

مہرو بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یوں بھی کوئی زندگی گزارتا ہے۔ حد ہو گئی بھئی۔" ان کے طرز زندگی سے اسے وحشت سی ہونے لگی..... دو روز بمشکل گزارے پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسٹور میں گھس گئی۔

"کم از کم کمرہ تو ان کے رہنے کے قابل بناؤں۔" اسٹور کا سب سامان ٹھکانے لگا کر کمرہ رگڑ رگڑ کر دھویا۔ دیواریں' چھتیں صاف کیں۔ پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر وہاں تک لائی۔

اپنے کمرے میں بند بڑے بھیا پہلو پہ پہلو بدلتے رہے۔

"اس لڑکی کو بھی کسی طور چین نہیں۔ خوامخواہ ہنگامہ کیے رکھتی ہے۔" وہ ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ لکھتے لکھتے کئی بار قلم اٹھا کر میز پہ پھینکا۔ ماتھے پہ تیوریاں بڑھیں۔ اس سے کچھ کہنے سننے کو اٹھے مگر کمرے سے نکلے تو گھر کی دہلیز پار کر گئے کمرہ پیچھے کھلا رہ گیا تھا۔

مہرو کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔

جھٹ کمرے میں گھسی..... ڈھیر ساری کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ انہیں اٹھایا جھاڑا' پونچھا' دوسرے کمرے میں لے جا کر ترتیب سے رکھا اخبارات کے بنڈل بنا کر باندھے ادھورے مسودے خالی کاغذات' کیسٹیں' سی ڈیز' رسالے' زنگ آلود پستول' الماری میں بے شمار کپڑوں کا ڈھیر..... جو عرصہ ہوا شاید ہی کبھی استعمال ہوئے ہوں گے..... بے شمار البمز لاتعداد تصویریں۔

"یا اللہ! کتنے زمانوں سے ہر چیز یہاں سنبھال رکھی ہے۔"

کوئی چیز اٹھا کر باہر پھینک دینے کا تو حوصلہ نہ تھا سو وہیں ترتیب دیتی رہی۔ رائٹنگ ٹیبل صاف شفاف کر دی' ٹیبل لیمپ بھی ٹھکانے پہ رکھا۔

سر شام ان کاموں سے فارغ ہوئی جہیز کے ٹرنک کھول کر بستر کی اچھی سی چادر نکال کر پلنگ پہ بچھائی..... گلدان سجائے اور دروازہ بند کر کے خود غسل خانے میں گھس گئی..... نہا دھو کر نکلی تو بدن ٹوٹ رہا تھا۔

یونہی گھڑی بھر کے لیے چارپائی پر لیٹی تھی کہ نیند آ گئی۔

کچھ ہی وقت بیتا تھا۔

پھر نجانے کیا ہوا تھا۔ شاید بادل گرجا یا بجلی کڑکی یا شاید کوئی دھماکا ہوا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر دروازے پہ رک ہوا پڑا۔ وہ بڑے بھیا تھے۔

"میں کہتا ہوں اسے جرأت کیسے ہوئی میرے کمرے میں گھسنے' میری چیزیں چھیڑنے کی..... یہاں ایک وقت میں بیسیوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مجھے..... میں کیا ہر چیز کے لیے

ہانکیں لگاتا پھروں گا۔ یہاں میز پہ سینکڑوں فون نمبر لکھے تھے میں نے جو محترمہ رگڑ کر صاف کر
گئیں..... اخباروں کے تراشے نہیں مل رہے..... وزٹنگ کارڈ غائب ہیں۔ کتابوں کی شکل بگ
نہیں دے رہی..... کیا چولہے میں جھونک دی ہیں اس جاہل لڑکی نے؟ چار دن کے لیے رہنا
عذاب ہوگیا مجھے۔ لگتا ہے کسی فلیٹ کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔''

معروف حسن بیچارہ ابھی ابھی دفتر سے لوٹا تھا۔ آتے ہی پھنس گیا۔

مہرو دروازے کی اوٹ میں کھڑی سنتی رہی۔ حیران بھی تھی اور پریشان بھی، کوئی اور ہوتا
اب تک باہر نکل کر طبیعت صاف کر چکی ہوتی۔ مگر اب تو ساکت کھڑی تھی۔ سارا جرم قصور تو اسی کا
تھا۔

معروف حسن نے تو اولین دِنوں میں ہی اسے خبردار کر دیا تھا۔ مگر یاد کسے رہا؟ بہت دیر برس
چکنے کے بعد وہ خاموش ہوئے۔ تب معروف حسن جھکا ہوا سر لیے کمرے میں داخل ہوا۔

اس سے کچھ کہے بغیر یونہی چارپائی پہ دراز ہوگیا۔

کچھ پل اس کے قریب کھڑے رہنے کے بعد وہ باہر نکل آئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبا لب
بھری ہوئی۔

تبریز حسن جبڑے بھینچے کرسی پر بیٹھے تھے۔ آنکھیں لال سرخ ایک پاؤں مسلسل حرکت میں

تب اس نے فون نمبروں سے بھری ڈائری نکال کر سامنے رکھی۔

میز کی درازیں کھول کر سامنے کیں۔

وزٹنگ کارڈ، اخبار کے تراشے بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں سلیقے سے پڑی تھیں۔

''میں نے آپ کے لیے دوسرا کمرہ سیٹ کیا تھا کتابیں بھی وہیں.....'' آگے کچھ بولا نہ

انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں، ناک سرخ۔ روٹھی روٹھی سی کھڑی تھی وہ۔ انہیں کسی ننھی
طرح محسوس ہوئی۔

طویل سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آئی، ایم سوری مہرو! مجھے عادت نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی چیز میری اِدھر اُدھر ہو جائے تو مجھے
وحشت ہونے لگتی ہے۔ اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ اتنی محنت تم میرے لیے کر رہی ہو تو میں پہلے
ہی منع کر دیتا۔'' یوں تو معذرت کر رہے تھے، مگر انداز قطعی یہ نہ تھا۔

وہ بے دلی سے باہر نکل آئی۔

ذرا دیر بعد دیکھا۔ بڑے بھیا اس سجے سنورے کمرے کا دروازہ کھولے اندر جا رہے

دل میں کچھ امید بندھی۔

''ہوسکتا ہے اتنا پیارا کمرہ دیکھ کر.....''

''ہوں، اچھا سجایا ہے..... لیکن میری کتابیں واپس کمرے میں پہنچا آؤ اور اس کمرے کو
لاک کر دو۔ پھر کبھی کام آئے گا۔''

''ہونہہ بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی کتابیں۔ پڑا سڑتا رہے یہ کمرہ بھی۔ یونہی خود کو
تھکایا۔'' بڑبڑاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

اس ایک واقعے کے زیرِ اثر بہت دِنوں تک اداس اور مضمحل سی رہی اور معروف حسن کئی روز
تک اس کا مذاق اڑاتا رہا۔

''ارے سگھڑ بی بی! سگھڑاپا دکھانے سے قبل ہم سے مشورہ ہی کر لیا ہوتا۔'' اور وہ ایسی بگڑی کہ
اگلے روز ہی اپنا بیگ تیار کر لیا۔

''چند روز کے لیے جا رہی ہوں اماں کے پاس۔ روکھی سوکھی کھانی پڑی چار روز تو خود ہی قدر
ہو جائے گی سگھڑ بی بی کی۔''

معروف حسن اگلے روز ہی اسے اماں کے ہاں چھوڑ آیا۔ رات بھر وہیں رہا خوب چہلیں
کیں..... دیر تک جاگ کر آئس کریم اڑائی..... عینی پاپڑ تل کر لے آئی۔

اماں مصلے پہ بیٹھی ''اوہوں، اوہوں۔'' کرتی رہیں مگر کسی نے سن کر نہ دیا۔ تنگ آکر وہ
دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

زیبی البتہ پہلے سے کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔

مہرو نے پوچھا تو ہنس کر ٹال گئی۔

''اب تمہارے حصے کا کام بھی مجھے کرنا پڑتا ہے اس لیے۔''

مہرو چور بن کر وہیں چپ ہوگئی۔

زیبی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے وہ بڑی تھی مجھ سے۔

پشیمانی کے احساس نے اسے ایک بار پھر آن گھیرا تھا۔

کتنا روئی تھی وہ اماں کے سامنے۔

''یہ نہیں ہوسکتا اماں! زیبی سے پہلے میں کیسے رخصت ہوسکتی ہوں مجھے نہیں کرنی شادی۔''

مگر اماں کیسی جابر بنی ہوئی تھیں ان دِنوں۔

''میرے لیے تو بوجھ ہی بوجھ ہے..... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کہ پہلے کون سا پتھر کھسکے۔''

زیبی دانستہ اس کے سامنے ہنستی رہتی۔ مگر اس ہنسی میں کھوکھلا پن کتنا واضح ہوتا تھا۔

جہیز کی سب چیزیں زیبی کے نام پر بنی تھیں..... زیبی کے ہاتھ سے بنی تھیں۔ کڑھے ہوئے میز پوش' کروشیے سے بنی چیزیں۔ ریشم سے کاڑھے جوڑے' چیری کے سوٹ' اونی جرسیاں..... کوزیاں' مگرائے اور نجانے کیا کیا؟

کس دل سے وہ چیزیں نکال کر مہرو کے حوالے کی ہوں گی۔

مہرو سوچتی اور اس سے نگاہیں چرا لیتی۔

○ ○ ○

بھادوں کا آخیر تھا۔

ساون تو یونہی بیتا۔ مگر اب جو بارشیں شروع ہوئیں تو رکنے کا نام ہی نہ لیا۔

اماں چھتوں کی لیپا پوتی میں مگن رہتیں مگر کوئی نہ کوئی نقصان ہو ہی جاتا۔ ایک روز تنگ آ کر مہرو بول ہی اٹھی۔

"کتنا زور لگایا تھا معروف حسن نے کہ چھتیں بدلوا لیتے ہیں مگر آپ نے مان کر ہی نہ دیا۔ اب دیکھیے کس مشکل میں پڑے ہیں۔ کبھی ایک کونہ ٹپک رہا ہے۔ تو کبھی دوسرا..... لوگ کس چین آرام سے رہتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ ساری زندگی انہیں مصیبتوں کے آسرے....."

"اے بی! شادی کروا کر تمہیں بہت بولنا آ گیا ہے۔ کیوں لگواتی میں اس بچے کا ڈھیر سارا روپیہ..... جب ہمارا اچھا خاصا گزارا ہو رہا ہے۔ کوئی سال بھر ہوتی ہیں بارشیں؟ یہی دو چار مہینے بیت جائیں گی' تم نے مصیبتیں جھیلی ہیں تو اب آرام ملا ہے ناں؟ زندگی میں دکھ' پریشانی آتی رہتی ہے۔ اب کیا احسان لیتے پھریں دوسروں کا۔" اماں کی اپنی ہی منطق تھی۔

"لیجیے' یوں تو بیٹا' بیٹا کہتے منہ نہیں سوکھتا۔ اور اب وہ دوسرے ہو گئے....." مہرو بس منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

"چار' پانچ روز بعد ہی معروف حسن کا فون آ گیا۔

"لینے آ جاؤں؟"

مہرو نے منع کر دیا۔

"ابھی کچھ دن رہنے دیں نا۔" اس نے ناز سے کہا۔

وہ فرمانبرداری سے مان گیا۔

پڑوس کے ہاں سے فون سن کر آئی تھی۔ اماں ساتھ ہی تھیں۔ گھر میں گھستے ہی کہا۔

"اور کتنے دن رہو گی مہرو.....؟"

"کیوں.....؟ خیریت اماں.....؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

وہ ڈرتے ڈرتے مسکرا دیں۔

"پھر خفا نہ ہونا تم..... لیکن اپنا گھر اکیلا چھوڑ کر یہاں بیٹھ رہنا..... لڑکے تو لاپروا ہوتے ہیں اور تمہارا ماشاء اللہ بھرا پرا گھر ہے۔ یونہی کھلا چھوڑ کر اندر' باہر نکل جاتے ہوں تو.....؟ پھر کھانے پینے کی بھی تنگی۔" وہ خوامخواہ فکرمند ہو رہی تھیں۔

مہرو کو ہنسی آ گئی۔

"اچھا... اب فون آیا تو کہہ دوں گی آ کر لے جائیں۔" اس کی سعادت مندی پر اماں نہال ہو گئیں۔

وہ ہفتہ دس دن مزے سے رہی اور پھر معروف کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔ یہاں ایک نئی مصیبت منتظر تھی۔

تیسرے روز معروف حسن کو کراچی جانے کے آرڈر مل گئے۔

تین ماہ کا کام تھا..... تنخواہ ڈبل۔

وہاں موجود فیکٹری کی ساری فائلز اَپ ٹو ڈیٹ کرنا تھیں۔ وقت اتنا کم تھا کہ معروف حسن کو سوچ بچار کا وقت بھی نہ ملا۔ آرڈر فائل پر دستخط کیے اور گھر آ کر سامنا باندھنے لگا۔

مہرو نے اچھا خاصا واویلا مچایا۔

"آپ نے انکار کیوں نہیں کر دیا۔ میں کیسے رہوں گی یہاں' یہ کون سا اصول ہے۔ ہماری مرضی کے بغیر۔"

"اُفوہ! صرف تین مہینے کی بات ہے مہرو..... پتہ بھی نہیں چلے گا۔ بڑے بھیا اسلام آباد سے خدا جانے کب لوٹ آئیں۔ ورنہ تم کو اماں کے پاس بھجوا دیتا اب خود بتاؤ' سارا گھر کس کے آسرے پر چھوڑیں۔ بھئی تھوڑی بہادر بنو۔ اماں بی تو ساری عمر جوانمردی سے اپنے گھر کی خود حفاظت کرتی رہی ہیں۔ تم کیا اپنے گھر کے لیے اتنا بھی نہیں کرو گی؟ صرف تین مہینے ہی تو ہیں۔ ڈبل تنخواہ..... سوچو ہم کیا کچھ مزید بنا سکتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے دھیرے دھیرے کہتا رہا۔

وہ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں میں ناراضی و شکوہ لیے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بالآخر مان گئی۔

○ ○ ○

جس شام معروف حسن کی روانگی ہوئی اس سے اگلی سہ پہر بڑے بھیا آن وارد ہوئے۔ خدا

جانے کون سا سیمینار اٹینڈ کر کے آ رہے تھے۔

معروف حسن کی زبانی پتا چلا تھا کہ جرائم پر مشتمل کہانیاں لکھتے ہیں۔ حقیقی واقعات اور
کردار۔ وہ جیلوں میں جاتے اور قیدیوں سے ملتے ملاتے ہیں۔ اخبار والوں سے دوستی ہے۔
نفسیات ان کا دم بھرتے ہیں۔ جرائم کی تہہ تک پہنچنا ان کا شوق‘ جرم کے محرک‘ اسباب‘ نتائج
کھنگال کے رکھ دیتے ہیں۔

”کئی خونی‘ وحشی مجرم ان سے اپنی کہانی لکھوانے کی خود گزارش کر چکے ہیں۔“ معروف حسن
کی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھاتی رہی تھی۔

”لو یہ بھی کوئی کام ہوا۔“

اب بھی اللہ جانے کون سے کارنامے کر کے آئے تھے کہ بغیر کچھ کھائے پیے سوئے تو اگلی
بھی اٹھتے اٹھتے دن چڑھا لیا۔

پڑوس سے خالہ بی کو اس نے پہلے دن سے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

وہ اپنی بہو سے بیزار‘ ناخوش..... بھاگی چلی آئیں۔ کبھی کبھی گھر کا چکر لگتا ورنہ دن رات بس
یہیں اونگھا کرتیں۔

اسے مشورہ بھی دیا۔

”خیر سے تبریز آ گیا ہے۔ جانا ہے تو اماں کے ہاں چلی جاؤ۔“

”ان کی تو نوکری ہی ایسی ہے خالہ بی! کبھی یہاں‘ کبھی وہاں‘ میں کب تک اپنا گھر چھوڑ کر
اماں کے ہاں بیٹھی رہوں گی۔“ اس نے خود ہی انہیں ٹال دیا تھا۔

لیکن خود اپنا یہ حال تھا کہ وجود میں عجیب بے کلی اور بے چینی سی سما گئی تھی۔ اندر‘ باہر کہیں چین
نہ پڑتا تھا۔

ڈھونڈ‘ ڈھونڈ کر کام نکالتی۔

پھر تھک ہار کر بستر پہ لیٹتی تو نیند کوسوں دور۔

”یا اللہ! اسی گھر میں معروف حسن کی موجودگی میں کیسے مزے کی نیند آتی تھی۔“ وہ کروٹ پہ
کروٹ بدلتی اٹھ بیٹھتی۔

”ہائے‘ وہ ریڈیو بھی کیا مزے کی چیز تھا۔ مجال تھی جو کبھی یوں اداسی کا دورہ پڑا ہے۔ قسم قسم کے
گانے سنتے تھے اور موج میں رہتے تھے۔“ بڑے عرصے بعد ریڈیو کی یاد آئی تھی۔

پھر ایک روز اور کچھ نہ ملا تو خالہ بی کے ساتھ مل کر صحن میں کیاریاں بنا ڈالیں۔
کسی میں دھنیا‘ پودینہ لگایا تو کسی میں موتیے‘ چنبیلی کے پودے لہرانے لگے۔

مٹی کے آبخورے پانی سے بھر بھر کر رکھتی۔ سارے صحن میں باجرا ڈالتی۔ ننھی چڑیاں آنگن
میں اترتیں تو دیر تلک ان کی چہکاریں سنا کرتی۔

اسی افسردگی اور یاسیت میں اسے ہلکے سے بخار نے آ گھیرا۔ سارا بدن کچا پڑ گیا۔ کام سے بے
زاری‘ اکتاہٹ‘ الٹا سیدھا پکا کر رکھنے لگی۔

خالہ بی کو جہاندیدہ نظروں نے جانچا مگر اس سے قبل کہ اس سے بات کرتیں وہ ایک روز چلتے
چلتے ہی چکرا کر زمین پہ ڈھیر ہو گئی۔

”خالہ بی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

بڑے بھیا کمرے میں تھے۔ اسے پوری طرح بے ہوش دیکھ کر وہ خود بھی گھبرا گئے۔ اپنی
روز کی ایک دوست کے گیراج میں کھڑی کرتے تھے۔ بھاگم بھاگ لائے اور اسے خالہ بی سمیت
ڈال کر ہاسپٹل کی طرف بھاگے۔

مہرو ہوش میں آئی تو سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر سر پہ کھڑی اسے گھور رہی
تھی۔

”کچھ ٹیسٹ کروانے ہوں گے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں بھی بس....“ وہ اللہ جانے کیا کیا کہتی
باہر نکل گئی۔

مہرو نے پہلی بار ہاسپٹل کی شکل دیکھی تھی۔ ڈری سہمی کبوتر کی طرح بیڈ کی بے شکن چادر پہ بیٹھی
رہی۔

ٹیسٹ ہو گئے۔

خالہ بی معنی خیز مسکراہٹ لیے اسے دیکھتی رہیں۔ ذرا دیر بعد ہی نرس رپورٹ لے کر بھاگی
آئی۔ نٹ کھٹ سی لڑکی تھی۔ آتے ہی ہنسنے لگی۔

”مبارک ہو..... آپ امی جان بننے والی ہیں۔“

”ہائیں!“ اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”کیسی بے شرم لڑکی ہے۔ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ بھی خالہ بی کے سامنے۔“ اسے بے اختیار ہی
شرم آ گئی۔

”میں تو آپ کے ہزبینڈ کو بھی مبارکباد اور تسلی دے آئی ہوں۔ قسم سے اتنے پریشان تھے
ناں..... غالباً پہلی بار.....“

”کیا.....!“ مہرو چیخی۔ ”تم..... بدتمیز لڑکی! وہ میرے جیٹھ ہیں۔ میرے بڑے بھیا! اف
خدایا!

مارے گھبراہٹ کے اسے اور کچھ نہ سوجھا تو گھٹنوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

''اوسوری.....!'' وہ محترمہ تو اڑنچھو ہو گئیں۔

خالہ بی خوب ہنس چکنے کے بعد اسے تسلی دینے بیٹھ گئیں۔ ذرا دیر بعد دوائیوں کا نسخہ بھی آ گیا۔ ''صرف طاقت کی گولیاں ہیں' گوشت' سیب اور انار کا استعمال کریں۔'' وہ ناک رگڑتی شوں شوں کرتی باہر نکلی۔

بڑے بھیا انہیں دور ہی سے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ نظریں چراتی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔

خالہ بی نے راستے میں پھل وغیرہ خریدنے کی تاکید کی تو انہوں نے کچھ دیر بعد ہی گاڑی روکی اور فروٹ لینے اتر گئے۔

''بڑے بھیا! میں نے فون کرنا ہے۔'' ان کے واپس آتے ہی سامنے پی۔سی۔او کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بڑے حوصلے سے کہا۔ مگر بڑے بھیا اس کی بات نظر انداز کر کے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ کتنا برا ہوا تھا دل ان کی اس حرکت پر۔

''ہاں بھئی' اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ یوں ہو گئے جیسے سنا ہی نہیں۔'' وہ دونوں گھر پہ اتریں بڑے بھیا گاڑی کھڑی کرنے چلے گئے۔

خالہ بی نے آتے ہی گوشت چولہے پر چڑھایا۔ اور سیب کاٹ کر زبردستی اسے کھلانے لگیں۔

کتنی دیر بعد بڑے بھیا واپس آئے۔

وہ آنکھیں موندے کمرے میں لیٹی تھی۔ وہ بغیر کسی کو پکارے' بلائے اپنے کمرے میں جا کر مخصوص کرسی پہ ڈھیر ہو گئے۔ ٹانگیں میز پر پھیلا کر سگریٹ سلگائی ہی تھی کہ اس نرس کی بات یاد آ گئی۔

''مبارک ہو آپ کی مسز امید سے ہیں اور بالکل خیریت سے.....'' سگریٹ کا کڑوا دھواں آنکھوں کے سامنے گھومتے گھومتے ایک چہرے میں ڈھل گیا۔

''آہ.....!'' لبوں سے بے اختیار ہی سسکی نکلی تھی۔ نیم جان ہو کر انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

''اور اگر وہ ہوتی' آج میرے ساتھ..... میری شریک سفر بن کر..... تو.....'' آنکھ کی سرخی گوشوں میں ٹھہری نمی دھیرے دھیرے انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر البم کھولی۔ بے شمار تصویریں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔

ہر تصویر میں ایک ہی چہرہ' حسن و رعنائی کا مجسمہ۔ کیا تھے وہ ایک دوسرے کے لیے..... کچھ بھی نہیں..... مگر سب کچھ.....

چھ برس تک اسے دیکھ دیکھ کر جیے تھے۔ ان کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ مگر اس کی بہت مجبوریاں تھیں۔

''صبر..... انتظار..... وعدہ..... بس تھوڑی دیر اور بس کچھ عرصہ اور مگر جب یہ عرصہ بیتا تو اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔

آنسو ڈھلک کر ان کی ٹھوڑی کو چھو گیا۔

''کیا رہ گیا ہے میرے پاس.....؟ دکھ ہی دکھ..... درد ہی درد' بے خوابی' بے سکونی' بے زاری۔ پچھتاوؤں کے ڈستے ہوئے ناگ۔ کس کس سے نہیں بھاگا ہوں میں۔ گھر سے' شہر سے' زندگی سے' دل' دماغ' روح' سب خالی..... کیا کچھ لے گئی ہو اپنے ساتھ لائبہ! اور کیا کیا ہے تم نے میرے ساتھ۔''

سگریٹ ان کی انگلیوں سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ نیم تاریک کمرے نے ان کے بے آواز آنسو' خاموش سسکیاں' چپکے سے اپنی آغوش میں لے لیے تھے۔

بہت سا وقت بیتا..... تب ہی موبائل کی بیپ سنائی دی۔

انہوں نے یونہی فون بند کر کے موبائل میز پر لڑھکا دیا۔

پھر ایک دم جیسے کوئی بات یاد آئی۔

''مہرو فون کرنا چاہتی تھی۔'' اپنی یادداشت پر افسوس ہوا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ دوا کے زیر اثر ہلکا ہلکا اونگھ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''آیئے بڑے بھیا!''

انہوں نے کمرے میں آ کر فون اس کی طرف بڑھایا تو وہ ذرا جھجک گئی۔

''ان ہی سے بات کرنی ہے۔ ذرا نمبر ملا دیجئے۔'' بات کرتے کرتے ان کی سرخ آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ بڑے دھیان سے دیکھا.....

اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتی' وہ فون اسے تھما کر خود باہر نکل گئے تھے۔

معروف حسن بھاگا چلا آیا تھا۔ تحفے' تحائف سے لدا پھندا..... اور آتا بھی کیوں نہ..... فون پہ جوں ہی مہرو نے جو واویلا مچایا تھا اسے سن کر کون رہ پاتا۔

''ساری زندگی باپ اور بھائی کے سہارے کو ترسی ہوں..... ایک عمر کے بعد آپ کا سہارا ملا تو آپ بھی چھوڑ کر چلتے بنے۔ میں نہیں رہ سکتی اس طرح میں آپ کی ذمہ داری ہوں معروف! اسے

خود نبھائیے..... آپ کے حصے کے کام دوسرے کریں۔ یہ مجھے قطعی منظور نہیں۔"

اب وہ لاکھ ادھر سے ہائیں' کیا' کیا کی آوازیں لگاتا رہا مگر وہ سنتی تب ناں۔ اپنی کہی بھڑاس نکالی اور فون بند کر دیا۔

وہ تو بھیا سے کہہ سن کر اپنی تسلی کی اور پھر دن رات ایک کر کے بقیہ کام نمٹایا' واپس آیا تو پہلے سے کافی کمزور..... رنگت زرد.....

اس پر بھی محترمہ نے خوب کھنچائی کی۔

"اب جا کر دکھائیں..... یہ فیکٹری تو سارا خون چوس گئی ہمارا۔"

اس دوران ایک بار اماں بھی چکر لگا چکی تھیں..... اسے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا مگر وہ ٹال گئی۔

اچھی خوراک' دوائیں' ٹیسٹوں کا خرچہ..... وہاں کیسے پورا پڑتا۔ یہاں تو ہر طرح کی سہولت تھی۔ روپے' پیسے کی بھی تنگی نہ تھی۔ دو' تین جانوں کا خرچہ ہی کیا.....؟ وہ چند مہینوں میں ہی اچھی خاصی بچت کر چکی تھی۔

اماں جاتے جاتے ایک اور بات اس کے کانوں میں ڈال گئی تھیں۔

"یہ معروف کا بھیا' بھلا آدمی لگتا ہے مجھے۔" ادھوری سی بات کہہ کر وہ نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

لیکن اسی شام جب وہ اماں کو رخصت کر کے ڈھلتی ہوئی شام میں اداس ہوئی بیٹھی تھی کہ نگاہ یونہی بھٹک کر صحن میں بچھی چارپائی پہ لیٹے بڑے بھیا پہ جا پڑی جو بہت دیر سے یونہی چت لیٹے خالی آسمان کو تکے جا رہے تھے۔

کھلی کھلی سی رنگت' سیاہ بال..... چہرے پہ سنجیدگی..... آنکھیں بڑی بڑی تھیں بہت پرکشش اپنی جانب کھینچ لینے والی' اپنے آپ سے بے نیاز رہتے تھے' مگر کمال کے آدمی تھے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے زیبی کو ان کے مقابل کھڑے سوچا تو دل میں بے اختیار۔ بھی ایک خواہش جڑ پکڑ گئی۔

زیبی بھی تو ایسی ہی پیاری تھی۔

شہد رنگ آنکھیں اور گندم کے سنہری خوشوں ایسی رنگت۔

"ہاں مگر بڑے بھیا! آدم بیزار..... چپ کا روزہ رکھنے والے۔ تھوڑے بدتمیز سے۔ گزارا کیسے ہو گا.....؟ کیا خبر شادی کا ارادہ رکھتے بھی ہیں یا نہیں.... خیر معروف سے تذکرہ کروں گی۔ ان کی رائے معلوم کریں...."

مگر بڑے بھیا بھی جیسے تیار بیٹھے تھے۔ اِدھر معروف حسن نے گھر میں قدم رکھا' ادھر وہ اپنا سامان سمیٹ' یہ جا' وہ جا۔



ڈلیوری کے دن قریب تھے اور اس کے لیے اٹھنا' بیٹھنا' کام کرنا دشوار..... ایک عورت آ کر صفائی ستھرائی کر جاتی مگر سارے دن میں ڈھیروں اور کام نکلتے چلے آتے۔ تنگ آ کر اس نے اماں کے ہاں جانے کا ارادہ کیا مگر معروف حسن نے جھٹ سے منع کر دیا۔

"خوامخواہ ان کو پریشان کرو گی جا کر..... یہیں کوئی بندوبست کرتے ہیں۔"

"مزید بندوبست کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے اسی روز اماں کو فون کیا۔

"جوں جوں دن قریب آ رہے ہیں۔ میرے لیے ہلنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ گھبراہٹ الگ ہے۔ پلیز اماں! آپ آ جائیں۔"

اماں نے سنا تو چپ ہو رہیں۔

"ان دونوں کو کس کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔ ایک آدھ دن کی بات ہوتی تو...." اس نے بہتیری منت سماجت کی..... جواباً اماں نے فون رکھ دیا۔

تیسرے روز جب وہ الٹی سیدھی سوچوں میں گھری بیٹھی تھی کسی نے اچانک ہی آ کر دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔

"کون.....؟" وہ ایک دم چونکی۔

ہاتھوں کی مخصوص نرماہٹ..... مانوس خوشبو..... "زیبی!" وہ ایک دم چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔



اگلے چند روز خوب ہنسی مذاق میں گزرے۔ معروف حسن طرح طرح کی چیزیں لا کر ان کے سامنے ڈھیر کر دیتا۔

"پہلی بار زیبی ہمارے گھر آئی ہے۔ اس کی خوب خاطر مدارت کرو....."

"جانے دیجیے معروف بھیا!" زیبی جزبز سی ہو کر اِدھر اُدھر کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرنے لگتی۔

کبھی کہتا..... "ہمارے گھر میں رہنے کے اصول وضوابط ابھی وضع نہیں ہوئے۔ ورنہ ہو سکتا

ہے کہ ایک لمبا سا پرچا آپ کے ہاتھ میں بھی تھما دیا جاتا۔"

"وہ ساری آپ کی چہیتی کی کارستانی تھی۔ یہ ہی آپ کو بغیر چینی کے دودھ اور پھیکی سیٹی چائے پلا کر بھگانے کے چکروں میں ہوتی تھی۔" زیبی سارا پول کھول کر رکھ دیتی۔

اور مہرو معصوم بنی کندھے اچکاتی۔ لاعلمی ظاہر کرتی۔



ان ہی دنوں مہرو نے ایک مہکتی ہوئی سرسبز سویر میں گلابی گل گوتھنے سے بیٹے کو جنم دیا۔ ماں، بیٹا دونوں خیریت سے تھے۔

معروف حسن کی خوشی دیدنی تھی۔ کھلکھلاہٹیں عروج پر..... اماں کو فون کھڑکھڑایا پھر بڑے بھیا کو..... خدا جانے کہاں تھے کہ رابطہ ہی نہ ہو سکا۔

اسی شام وہ ہاسپٹل سے گھر آ گئی۔ مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ مہرو آتی جاتی بوڑھی عورتوں کے مشورے گرہ میں باندھ رہی تھی۔

"یہ کرنا، وہ نہیں کرنا، فلاں کو گھر میں نہ گھسنے دینا..... اگلے کئی روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ زیبی کی دوڑیں لگتی رہیں مہمان نوازی کرنے میں۔

اماں اور عینی بھی آئیں..... مہرو اور بچے کے کپڑے، کھلونے، دیسی گھی میں بنایا گیا مقوی حلوہ۔

واپس جاتے ہوئے زیبی کو تیار ہونے کو کہا تو میاں، بیوی دونوں آڑے آ گئے۔

"چھوٹے بچے کا ساتھ ہے اماں! رات رات بھر جگاتا ہے اور دن میں بھی چین نہیں..... میں اکیلی کیا کروں گی....." مہرو روکھی ہو گئی۔

معروف حسن نے بھی خوب حمایت کی۔

"میں بے فکر ہو کر دفتر جاتا ہوں کہ مہرو کے پاس زیبی ہے۔ مہرو کو تو بچے سے فرصت نہیں زیبی چلی گئی تو ہم تو بھوکے مر جائیں گے....." ان دونوں کی منت سماجت دیکھ کر اماں کو رضامند ہونا پڑا۔

زیبی خاموش تماشائی بنی کھڑی رہی۔

"تم کیوں منہ بسورے بیٹھی ہو۔ ہم تمہیں اداس نہیں ہونے دیں گے۔ اب تو میں فارغ ہو گئی ہوں۔ خوب سیریں ہوں گی۔ منے کو منے کے ابا سنبھالیں گے۔" مہرو کی چہچہاہٹوں میں زندگی بولتی تھی۔

منے کو گود میں لے کر اس کے چہرے پر جو رنگ اترتے تھے انہیں دیکھ کر زیبی نظریں چرا لیتی۔ دل ہی دل میں اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتی تھی مگر کوئی انجانا سا دکھ تھا جو دل کے کسی اندر والے کونے میں ہولے ہولے سانس لینے لگتا تھا۔



بہت عجیب سا موسم تھا..... کچھ ٹھنڈا، کچھ گرم..... کمروں کی نیم تاریکی میں ٹھنڈ ہلکورے لیتی اور آنگن میں پھیلتے سایوں کی گرمائش بدن میں سستی سی بھر دیتی تھی۔

مہرو منے کو سلانے کمرے میں گئی تو اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ یہ ننھا سا وجود اسے سارا دن مصروف رکھتا تھا۔

ساتھ کے کمرے میں زیبی منے کے ننھے ننھے کُرتے سی رہی تھی۔ سلائی مشین کی مدھم سی آواز برآمدے، صحن ہر جگہ چپ پھیلی تھی۔

ظہر کی اذان ہوئی تو زیبی اپنا ادھورا کام چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ سایہ پھیل کر سامنے کی دیوار کو چھو رہا تھا۔ بائیں دیوار پہ چمک دار دھوپ..... معروف حسن کے لائے ہوئے کبوتر صحن میں بڑی زحمت سے بیٹھے اپنے پروں کو کھجلا رہے تھے۔ ننھی چڑیاں پانی کے کٹورے میں ڈوبی اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے بڑی محویت سے انہیں دیکھتی رہی۔

"مہرو سے کہوں گی۔ اب مجھے یہاں سے جلد جانے دے۔" اس نے یاسیت سے سوچا۔

"یہاں رہنا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔" وہ اپنے آپ سے ڈری ہوئی تھی۔

مہرو، معروف حسن۔

معروف اور مہرو۔

ان دونوں کا باہمی تعلق اس کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی کیسا ہیجان سا برپا کر دیتا تھا۔

کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھ کر اس کی اپنی کلائیوں میں خون گویا رکنے لگتا تھا۔

معروف حسن کا مہرو پر استحقاق۔

مہرو کی خود سپردگی..... ناز و انداز..... چھیڑ خانی..... کوئی دبی دبی سی سرگوشی۔

کوئی بلند ہوتا معنی خیز قہقہہ..... بے معنی نوک جھوک۔

وہ ان دونوں کو دیکھ کر خود بے چین ہوتی تو اپنی نمازوں کا وقت بڑھا دیتی۔

دل و دماغ کی پاکیزگی کی دعائیں مانگتی۔

شیطان کے شر سے پناہ مانگتی۔

"لیکن دل، یہ بہکا ہوا دل..... نادان، سمجھنے میں ہی نہیں آتا....."

وہ ستون کے پاس سے ہٹی اور برآمدے میں رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔

"پتا نہیں..... کون ہو وہ.....؟"

"کہاں ہوگا.....؟"

"ہوگا بھی یا نہیں.....؟"

"نہیں..... نہیں..... کوئی تو ہوگا.....اس پھیلی ہوئی کائنات میں..... کوئی تو..... صرف میرا ہوگا۔ میرے لیے ہوگا....."

"آہم....." کوئی قریب ہی آکر کھنکھارا تھا۔

زیبی نے سر اٹھا کر سوئی جاگی آنکھوں سے آنے والے کو دیکھا۔

"کون.....؟" ایک پل کے لیے سوچا۔

مقابل کھڑا شخص بھی متذبذب تھا۔

"میں..... تبریز حسن.....!"

"میں مہرو کو بلاتی ہوں....." وہ تھکی تھکی سی اٹھ کر کمرے کی طرف چل دی۔

○ ○ ○

معروف حسن منے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔

بڑے بھیا نے اس پہ نگاہ ٹکاتے ہوئے اس کے نرم گلابی ہاتھوں کو چھوا تو اس نے بے اختیار ہی ان کی انگلی اپنے ننھے سے ہاتھ میں بھر لی۔ وہ بے ساختہ ہنس دیے۔

معروف نے چونک کر دیکھا..... پھر لب بھینچ لیے۔ مبادا اس کی توجہ ان کی یہ بھولی بھٹکی مسکراہٹ بھی نہ چھین لے۔

"بعض لوگ اپنی دنیاؤں میں کتنے اکیلے اور اداس ہوتے ہیں۔ بڑے بھیا کے چہرے پر بھی اداسی نقش ہو چکی ہے۔ آنکھوں میں تنہائی بسنے لگی ہے۔ کیا کر سکتا ہوں میں ان کے لیے۔"

"بڑے بھیا! کوئی نام بتائیے؟ آپ کے انتظار میں یہ اب تک منا ہی کہلاتا ہے۔" مہرو ان کے عقب میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"معروف تم بتاؤ ناں.....؟ باپ ہو..... کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"میرے خیال میں تو حسن تبریز....."

"اونہوں....." انہوں نے بہت سختی سے ٹوکا..... پھر پل سوچ میں ڈوب گئے۔

"زعیم حسن ٹھیک رہے گا۔"

"بہت بہتر....."

مہرو زعیم کو اٹھانے آئی تو انہوں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر اس کے سامنے کیے۔

"کچھ خریدنا ہے مہرو! اپنے لیے اور زعیم کے لیے۔"

"اتنے..... لیکن بڑے بھیا.....!" مہرو نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ کچھ نہیں ہیں مہرو! کچھ بھی نہیں.....اس کے مقابلے میں جو تم نے اس گھر کو دیا۔ تم نے اسے بنایا ہے، بسایا ہے، پہلے یہاں آتا تھا تو چار سو گرد اڑتی تھی۔ دل دکھتا تھا اس کا اجاڑ پن دیکھ کر.....اب یہاں خوشبوئیں بستی ہیں۔ ہزار کوس دور بھی ہوں تو یہاں کے سناٹے میرا تعاقب نہیں کرتے۔ مطمئن رہتا ہوں کہ معروف حسن کا خیال رکھنے والا کوئی ہے۔ آدھی پونی چھاؤں میں زندگی گزار دی ہم نے..... لیکن اب ہمارا پورا سایہ ایک اسی کے لیے تو ہے۔"

انہوں نے جھک کر زعیم کی پیشانی چومی اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے لہجے کی اداسی پر مہرو کا دل بھر آیا۔ رگڑ کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور زعیم کو کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔

صحن کے ایک کونے میں بیٹھ کر چاول چنتی زیبی کا ہاتھ بہت دیر پہلے تھم چکا تھا۔ اس کی بھٹکتی نگاہیں کچھ دیر تک بند دروازے کے آس پاس چکراتی رہیں..... کسی دلفریب خوشبو کا جال دھیرے دھیرے اسے اپنی آغوش میں لینے لگا تھا۔

"نہیں....." وہ ہلکا سا کپکپائی، ذرا سے چاول برتن سے گر کر آس پاس بکھر گئے۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے ان بکھرے چاولوں کو دیکھے گئی۔ اسے اپنا آپ ان ہی چاولوں کی طرح بکھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"مہرو!" اس نے ایک دم گھبرا کر پکارا۔

مہرو نے فوراً پلٹ کر اسے دیکھا۔ معروف حسن بھی تکیے سے سر اٹھا کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"مہرو! میں واپس کب جاؤں گی....." اس کی آواز میں کسی گہرے خوف کے ساتھ ساتھ ڈوبتی شام کی اداسی بھی بھری ہوئی تھی۔

○ ○ ○

کاش کہ میرا بھی ایک گھر ہوتا

جس کے زینے پہ خوشبوؤں کی معطر چاپ ہولے سے ابھرتی
دیواروں پر پھولوں کا سنی رنگ ہلکورے لیتا
آنگن میں پازیب چھنکتی
سنگھار میز کے آئینے میں کوئی روپ سنورتا
گجرے کے پھولوں سے کمرہ بھر جاتا
کاجل کا رنگ شام کی آنکھ میں سج جاتا
چاندنی کا رنگ جیون رات جلا دیتا
وہ ہوتی.....!
اور.....
میں ہوتا.....
دکھ سکھ کی ہر سانجھ میں جیون کٹ جاتا
اے کاش..... کہ میرا بھی ایک گھر.....

○ ○ ○

رات بہت بیت گئی تھی..... کمرے میں حبس ہو گیا تھا۔ انہوں نے تھکے ماندے وجود کو بمشکل گھسیٹا اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

باہر کا موسم قدرے خوشگوار تھا۔

لمبے لمبے سانس کھینچ کر اندر کی گھٹن کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کھڑکی تک گئے تھے۔

بے معنی سوچوں میں گھرے، صحن کی کیاریوں میں لگے سرسراتے پودوں پر نظر دوڑاتے وہ ایک پل کے لیے چونک سے گئے۔

صحن میں پھیلی ہوئی اجلی چاندنی میں کسی سائے نے حرکت کی تھی۔

"کون ہو سکتا ہے.....؟ اس وقت.....؟" وہ دروازہ کھول کر ننگے پاؤں ہی باہر نکل آئے۔

پرلی دیوار چاندنی میں پوری طرح روشن تھی۔

نیم تاریکی کی آخری حد میں سیڑھیوں پہ بیٹھا وجود اب پوری طرح ساکت تھا۔ وہ چلتے چلتے بہت قریب آ گئے تھے۔

لمبے بالوں کی چوٹی سیاہ ناگ کی طرح دائیں کندھے سے لپٹی نظر آئی۔

"زیبی!" ان کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

زیبی نے چونک کر سر اٹھایا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو..... اس طرح سے.....؟" وہ حیرت سے کہتے ہوئے ذرا سا اس کی طرف جھکے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم رو رہی ہو.....؟"

اس تاریکی میں بھی اس کے آنسو دکھائی دے گئے انہیں..... وہ مارے شرم کے کٹ کر رہ گئی۔ برق رفتاری سے ان کے قریب سے گزرنا چاہا تھا مگر وہ بہت عجلت میں اسے کلائی سے تھام کر اپنے مقابل لے آئے تھے۔

زیبی کو گویا کسی انگارے نے چھو لیا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر دیوار سے جا لگی۔

سسکیوں میں تیزی..... آنسوؤں میں روانی..... لبوں پہ خاموشی..... تبریز حسن اپنی جگہ بت بنے کھڑے تھے۔

ایک ایک لمحہ کائنات کے دل پر دستک دے رہا تھا۔ انہیں لگا، ان کے ہارے ہوئے وجود میں کوئی مرد انگڑائی لے رہا تھا۔

"مجھے جانے دیجیے....." آواز کی لرزش آنسوؤں کی نمی سے لبریز تھی۔ آنچل ڈھلک گیا تھا۔ چاندنی مجسم ان کے سامنے تھی۔

تبریز حسن کو اپنی لہو سے معمور پوروں میں تپش اترتی محسوس ہوئی تو وہ ہلکی سی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔

اس کا لو دیتا مومی وجود پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

وہ انگلیوں کے شکنجے میں اپنا سر دیے وہیں سیڑھیوں پر ڈھے گئے۔ سانسوں کی رفتار کے ساتھ خون کی گردش دھیمی ہوئی تب انہوں نے سر اٹھایا۔

"کیسی حرارت ہے یہ۔" انہوں نے حیرت سے بھیگتی چاندنی کو دیکھا۔

آسمان پر چودھویں کا چاند بادلوں کا ہم سفر تھا۔ آس پاس بکھری خوشبو انجانی مگر دلفریب تھی۔

"زندگی کا سفر تو جاری و ساری تھا۔ پھر آج.....؟ یہ دل..... کس واردات کا منتظر تھا، یہ مجھے کس اور لیے جا رہا تھا.....؟" وہ خود سے ہم کلام تھے، متعجب و پشیمان۔

اور جواب میں ایک مہیب چپ، دل کو کونوں کھدروں میں دم سادھ کر بیٹھی چپ..... انہیں لگا، رات کی ٹھنڈک ان کی سلگتی آنکھوں میں جگہ پانا چاہ رہی ہے۔

○ ○ ○

بند کمرے سے باہر ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ چڑیوں کا شور ہی کم نہ تھا۔ اس پر کبوتروں کی غٹرغوں اور سب سے بڑھ کر مہرو کی چہکاریں..... معروف حسن کے چھت پھاڑ قہقہے اور منے کی غوں غاں سگریٹ کے دھوئیں سے بوجھل فضا میں زندگی کا پتہ دیتی۔ ان آوازوں سے انہیں بیک وقت نفرت اور بے حد کشش محسوس ہوئی تھی۔

رات بھر خود کو کھوجتے رہنے کے بعد اب دل جیسے ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

ادھ جلی سگریٹ کو پیروں تلے مسل کر انہوں نے دروازے کی چٹخنی گرائی اور باہر نکل آئے۔ صحن تک آتے آتے ان کے قدم خود بخود سست پڑ گئے تھے۔

صابن ملے پانی کے ٹب سے جھاگ' ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔

معروف کندھے پر تولیہ ڈالے زعیم کے ننھے چکنے وجود کو ہاتھوں سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مہرو اس کی اس ناکام کوشش پر ہنستے ہنستے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ زعیم کو نہلانے کی کوشش میں وہ دونوں خود بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ ٹب کے قریب بے بی شیمپو' بے بی آئل اور بے بی سوپ کی گلابی شیشیاں لڑھکی ہوئی تھیں۔

کیسی بھرپور زندگی تھی.....

میاں' بیوی..... دکھ سکھ کے ساجھی۔

اور ان کی آرزوؤں' امنگوں کا مرکز' ننھا سا چہکتا مہکتا وجود۔ ایک ایسی تکون' جس کا ہر کونہ دوسرے سے زیادہ چمک دار' زیادہ روشن' زیادہ خوبصورت.....

وہ برآمدے کے ستون پہ ہاتھ رکھے اپنی جگہ کھڑے رہ گئے تھے۔

"کائنات نیا جنم لے رہی ہے تبریز حسن! اور تم کن تاریک غاروں میں بھٹک رہے ہو۔"

انہوں نے حیران حیران سی نظروں سے سامنے کے منظر کو دیکھا۔

برہنہ شاخوں پر نوخیز کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں سے سبز پتے توڑ رہی تھیں۔ سفید کبوتری اپنے انڈوں کو سینے کی گرماہٹ سے سہلا رہی تھی۔ گلہری کا شرارتی بچہ اپنی ننھی دم کو چبا رہا تھا۔ کیاری میں ادھ کھلے گلابوں کی چمک ہی نرالی ٹھہری تھی۔

"کیا واقعی کائنات' نیا جنم لے رہی ہے؟

بدنصیبی کا سیاہ گدھ اپنے پر سمیٹ لینے کو ہے.....؟"

سامنے کے منظر سے پرے ایک چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

زرد دوپٹے کے ہالے میں مرجھایا ہوا چہرہ۔

بڑی بڑی آنکھوں میں نا امیدی کا جھولا جھولتی حسرت و یاس۔

ہونٹوں پہ کپکپاہٹ.....

اور نگاہوں کا مرکز وہی ایک منظر..... جو ان کے دل کی دنیا ہی بدلے جاتا تھا۔ جاندار سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

کشتی بے پتوار ڈولتے' ابھرتے بالآخر کنارے سے جا لگی تھی۔

ان کی نظریں خود بخود اس بند دروازے پر جا پڑیں۔ جو انہوں نے خود اپنے لیے بند کر چھوڑا تھا مگر آج نجانے کیوں یہ بند دروازہ کھولنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے دوسری جانب ماحول پرسکون لیکن خاموش اور بے آباد تھا۔

"میں اسے آباد کرنا چاہتا ہوں....." بند دروازے کے سامنے کھڑے وہ ہولے سے بڑبڑائے تھے۔

"بڑے بھیا!" مہرو انہیں وہاں دیکھ کر بھاگی چلی آئی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے مہرو! اب سارے دروازے کھل جانے چاہئیں۔"

"ہائیں....." مہرو نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھے گئی۔

"کیسے بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔" اس نے اپنا سر کھجایا۔

"بند دروازوں کے پیچھے صرف تاریکی ہوتی ہے یا مقید باس..... زہریلی چپ' گھنی خاموشی..... بے آباد تنہائی۔ زیبی سے کہو' یہ دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولے۔ کھڑکیاں' روشندان' ہر چیز کہیں کوئی تاریکی نہ ہو۔ اسے کہو ہر طرف روشنی ہی روشنی کر دے۔ صرف روشنی..... کیونکہ وہ کر سکتی ہے اپنے لیے' میرے لیے۔"

"زیبی.....؟" مہرو نے آنکھیں پھاڑیں۔

"زیبی اور آپ..... یعنی.....؟"

"ہاں..... زیبی اور..... میں۔" وہ پورے قد سے اس کے سامنے کھڑے اعتراف کر رہے تھے۔

"زندگی کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔ آسرا درکار ہے۔ ملے گا؟" بہت صاف اور واضح سوال تھا۔

مہرو بوکھلائی۔ پھر بگٹٹ زیبی کی طرف بھاگی۔

وہ انجان پری معصومیت کی ردا اوڑھے کیاریوں میں بکھرے خشک پھول اکٹھے کر رہی تھی۔

"زیبی! بولو ناں.....؟ دیکھ بڑے بھیا کیا پوچھ رہے ہیں....." وہ بہت بے صبری ہو رہی تھی۔

زیبی نے پلٹ کر تبریز حسن کو دیکھا۔

'اس شخص کے ساتھ چند پل نہیں کئی صدیاں بیتی ہیں۔ اس کا لمس نا آشنا اور خوشبو انجانی
نہیں۔ میں ہزاروں' کروڑوں سالوں سے اس کے اندر بس رہی ہوں۔ یہ خود کو ڈھونڈتے ہوئے
مجھ تک ہی تو آئے گا۔ یہ زندگی کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ میں زندگی بن کر اسے ملوں گی۔
اسے آسرا درکار ہے' تو جاؤ کہہ دو۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کبھی جدا نہ ہوگا؟'

زیبی نے تبریز حسن سے نگاہ ہٹا کر مہرو کو دیکھا۔ پھر اسی خاموشی سے خشک پتوں کو اپنی انگلیوں
میں مسلنے لگی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو۔ کچھ تو کہو...... زیبی ......! زیبی......!" اس کی خاموشی سے جھنجھلا کر
مہرو اسے پکارے جا رہی تھی۔

جب کہ تبریز حسن کھل کر مسکرا دیئے تھے۔ انہیں تو جواب مل ہی چکا تھا۔

○ ○ ○

رفاقت کی تمنا سرشتِ آدم ہے۔ انسان کو ہر مقام پر رفیق کی ضرورت ہے۔ جنت بھی انسان
کو تسکین نہیں دے سکتی اگر اس میں کوئی ساتھی نہ ہو' کوئی سننے سنانے والا نہ ہو آسمان پر بھی انسان کو
انسان کی تمنا رہی اور زمین پر بھی انسان کو انسان کی طلب سے مفر ممکن نہیں۔ لامکاں میں رہنے والا
تنہا رہ سکتا ہے' لیکن زمین پر رہنے والا تنہا نہیں رہ سکتا۔

یہ انسان کی ضرورت بھی ہے اور اس کی فطرت بھی۔

❀❀❀

بہار آنے تک

صبح کا وقت ہے اور افراتفری کا وہ عالم کہ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔

یونیورسٹی والوں کی بس چھوٹی جا رہی ہے۔ اسکول والوں کی وین پاں' پاں کر رہی ہے۔ تایا ابو
دیر کرنے والوں کو گھور رہے ہیں۔ بڑے چچا دیر ہونے پر بڑبڑا رہے ہیں اور چھوٹے چچا بڑے صبر
سے منہ ہاتھ دھوئے بلکہ باندھے اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

"بھنڈی چیخ رہی ہے کہ 'ناشتے کا ایک وقت ہی کیوں مقرر ہے۔ اور کچھ لوگ رات کو ہی ناشتہ
کیوں نہیں کر لیتے۔"

خود اس کا اپنا یہ حال ہے کہ صبح صبح نہا دھو' چوٹی بنائے کچن میں جو گھسی تو اب دوپٹہ گول مول ہو
کر ایک کونے میں پڑا ہے۔ آستین کہنیوں سے اوپر پہنچ گئی ہے۔ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی گرم
گھی میں ڈبو کر لال کر لی ہے۔ چائے چھلکنے سے پیر کی انگلیاں سوج چکی ہیں مگر یہ چوٹیں معمول کی
ہیں۔ لہٰذا وہ برق رفتاری سے سب کچھ بھلائے پراٹھے بیل رہی ہے۔ سلائس جلا رہی ہے۔ انڈے
اور برتن توڑ رہی ہے۔ ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ بھابی کے سامنے۔

ایسے میں شاہ زین کی آمد کا اعلان جس کسی نے بھی سنا' بے اختیار ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ کسی کسی
نے البتہ دیوار اور در بھی تھام لیا تھا۔

○ ○ ○

"دیکھو بھلا۔ یہ مدیحہ کو کیا سوجھی....؟ گھر بھرا ہوا ہے لڑکیوں سے اور وہ بھیج رہی ہے جوان
جہان لڑکے کو رہنے کے لیے۔" تائی اماں سے ایسی ناسمجھی کی امید تو نہ تھی۔ خدا جانے کس رو میں یہ
بات کہہ گئیں۔

بڑی' چھوٹی چچی نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ تائی اماں کی یہ بات
گھر کے خرانٹ بوڑھوں تک پہنچتی اور وہ گھر کے بجائے کسی ہوٹل میں شاہ زین کے قیام و طعام کا

بندوبست فرماتے بڑی' چھوٹی چچی نے تائی اماں کو دونوں طرف سے دبوچا اور ان کے ہائیں ہائیں ارے۔ ارے کی پروا کیے بغیر انہیں پچھلے صحن میں لا چھوڑا جہاں گنگو دھوبی گھر کے پینتیس افراد کے میلے کپڑے دھونے کے لیے واشنگ مشین' ڈرائیر مشین اور واٹر پمپ ایک ساتھ چلائے بڑا مصروف تھا۔

"بڑی بھابی! یہ کیا غضب....؟ ذرا سوچیں۔" بڑی چچی کے لب تیز تیز ہل رہے تھے۔ یقیناً کچھ بول بھی رہی ہوں گی مگر تائی اماں کے پلے کچھ پڑتا تب ناں..... انہوں نے جھنجلا کر دھوبی کو دفعان کرنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیچارا چھوا چھو.... چھوا چھو.... تو اس دور میں کرنے سے رہا.... مشینوں کی گھر گھر، زوں... شوں... اور بھاری کپڑوں پہ ڈنڈے کی دھائیں دھائیں البتہ ضرور مخل ہو رہی تھی۔

چھوٹی چچی نے جھٹ اپنے گلابی کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لال نوٹ نکالا اور لے جا کر گنگو کے ہاتھ پہ دھرا۔

'یہ لو میاں جاؤ! گھڑی بھر کے لیے جان چھوڑو... کوئی چائے' پان' قلفی' شربت کھا پی لو کر۔"

گنگو کو اور کیا چاہیے تھا...؟ پیسے دبوچے... کورنش بجاتا... یہ جا' وہ جا... اتنے میں بڑی چچی بات شروع کر چکی تھیں۔

"چار ماموؤں کا اکلوتا بھانجا... اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن مدیحہ! ذرا جو آپ کی باتوں کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو ذرا سوچیے' کتنا دل دکھے گا۔ بے چاری کا...وہ پڑھا لکھا' سلجھا ہوا شاہ زین... کوئی ہماری لڑکیوں کو بھگانے' بہکانے تھوڑی آرہا ہے جیسے باقی سب بہن بھائی مل کر رہے ہیں۔ چار دن وہ بھی آ کر رہ لے۔"

بڑی چچی ذرا پردے میں رہ کر بات کر رہی تھیں۔ چھوٹی چچی کو یہ بات کچھ خاص نہ بھائی تھی۔ بڑی تائی گھر کے کرتا دھرتاؤں میں سے ایک تھیں۔ بھلا ان سے کیونکر چھپایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"بڑی بھابی! میں تو سیدھی اور صاف بات کہوں گی۔ مدیحہ کئی بار ذکر کر چکی ہے کہ شاہ زین کے لیے خاندان سے ہی لڑکی پسند کرے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دانستہ اسے یہاں بھجوا رہی ہو۔ آپ تو خیر سے بری الذمہ ہیں۔ ہمیں دیکھیے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

انہوں نے پوری کوشش کی آنکھیں پھیلا کر بے خوابی دکھانے کی' حالانکہ نوجوان نسل گواہ تھی' بستر پر جاتے ہی ہیبت ناک خراٹے لینے والی یہ ہی محترمہ تھیں۔

"دو صائمہ بھابی کی... تین میری... لڑکیاں کیا... بھاری سلیں دھری ہیں سینے پہ... بھائی صاحب سے کہہ کر کمرہ ذرا اچھا سا سیٹ کروا دیں... دو' چار دنوں کی تو بات نہیں... ابھی جگہ خریدے گا... پھر مکان بنے گا... مدیحہ کے شفٹ ہونے تک آخر وہ یہیں رہے گا ناں... اور ماشاء اللہ سے ہماری بچیاں' نیک' سلیقہ مند' با اخلاق' با کردار۔ ہو سکتا ہے۔ یہیں کہیں میل' جوڑ لکھا ہو اس کا۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے... میں بھی سٹھیا گئی... بھلا پہلے یہ بات کیونکر نہ سوچی۔ اچھا تم لوگ ذرا دوپہر کا ہانڈی' چولہا دیکھ لو... میں کچھ سوچتی ہوں اس بارے میں۔"

انہوں نے تخت پر ٹانگیں پھیلائیں اور ململ کا دوپٹہ منہ پہ پھیلا کر اونگھنے لگیں... ان کا اونگھنا بھی کمال کا ہوتا تھا... اسی اونگھ میں وہ غور و فکر کرتیں... معاملات سلجھاتیں۔ مسائل حل کرتی تھیں۔

"ماؤں کو بیٹیوں کی کتنی فکر ہوتی ہے۔" ان کی جڑی ہوئی پلکوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ خود وہ ایک اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ گھر بھر میں سب سے بڑا بیٹا شیراز حسن... اعلیٰ تعلیم یافتہ... خوبصورت... اونچا لمبا... ادھر تعلیم سے فارغ ہوا۔ ادھر پسند سے منگنی بھی کروا لی... پہلا ہنگامہ تھا گھر کا.... کیا ہی اودھم مچا تھا... لڑکے' لڑکیوں نے خوب ہی مزے کیے۔ گانے گائے' ڈھول پیٹے۔

خوشی کے نقاروں نے اس سانحے کی سسکیوں کی بازگشت ان کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ دی جس نے شیراز حسن کو ایک ٹانگ کی معذوری و محرومی دی تھی۔ محبت آزمائش بن گئی... اور ہر آزمائش پر پورا نہیں اترا جا سکتا... ان کی محبت داغ جدائی دے کر زخموں سے کھرنڈ بھی نوچ کر لے گئی اور وہ آہ کیے بغیر اپنے کمرے کا ایک لازمی سا جزو بن کر رہ گئے... اب نہ ان کا کمرہ انہیں چھوڑتا تھا' نہ وہ کمرے کو...

مجبوری لاچاری کے ان دنوں میں ٹی وی اور کمپیوٹر کا زیادہ ساتھ رہا... علم پہلے سے تھا' عقل اور شعور کو جلا ملی تو اخبارات سے وابستہ ہو گئے۔

تمام لڑکوں کی سیاسی محفل ان ہی کے کمرے میں جگہ پاتی تھی... جن دنوں لڑکے اپنے امتحانات سے فارغ ہوتے' تبصرے' گرما گرمی' کھیل' تماشے' راز بھری باتیں... وہ گھر کے ہر فرد کے دوست تھے...

"اور اگر میں کہوں... میرے بیٹے کے لیے... خوشی کی کوئی کرن... امید کا کوئی جگنو... کوئی آسرا کوئی سہارا دے دو تو شاید صائمہ اور عفت یہ بھاری سلیں اپنے سینے سے ہٹانا کبھی پسند نہ کریں۔" تائی اماں نے کروٹ بدلی۔

جامن کے درخت پر طوطوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا... اور اس سے پرے شہتوت کے درختوں پر چڑیوں کی چڑ چوں...

"بیٹیاں بھی تو چڑیوں کی مانند ہوتی ہیں... چہکتی لہکتی... پھر سے اڑ جانے والی..."

پانچوں بچیوں کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے.....

صائمہ کی بڑی بیٹی ارم تھی۔ ڈاکٹری کے آخری سال میں... دبلا پتلا جسم... لمبی چوٹی، بڑی آنکھیں اور دودھ شہد سے بنی رنگت... خوش اخلاق اور مہربان ڈاکٹر' فرماں بردار حد سے زیادہ۔

اس سے چھوٹی افشین تھی۔ گھونگھریالے بال ہمیشہ کندھوں پر گرائے رکھتی... اسے بس کا رنگوں اور تصویروں سے پیار تھا۔ آرٹ گیلریز میں اکثر آنا جانا رہتا تھا' بی ایس سی سے آگے پڑھا نہ دیا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیتی اور اپنے معاملات میں دخل دینے نہ دیتی تھی... رنگ روپ میں کسی سے بھی کم نہ تھی۔

عفت کی تین بیٹیاں تھیں... ضویا' اریبہ' فرح۔ فرح فیشن کی دلدادہ تھی۔ فربہ جسم... بیلا رنگت' بھرے بھرے ہونٹ۔ آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں مگر کاجل میں ڈوبی رہنے سے بڑی بڑی لگتی تھیں۔ گھر میں سب سے زیادہ کپڑے' خرچے اور نخرے اسی کے ہوتے تھے۔

اریبہ کم گو سی لڑکی تھی۔ مزاج سنجیدہ اور کسی حد تک تند تھا۔ اس لیے اسے کم ہی چھیڑا جاتا... شکل وصورت میں وہ بھی اچھی تھی۔ پلکیں لانبی لانبی اور خوبصورت تھیں۔ ایک ادا سے اٹھتی تھیں۔ سارا حسن قدرتی تھا... وہ خود کوئی تردد نہ کرتی تھی۔

ضویا ایم اے کے آخری سال میں تھی۔ چلبلی طبیعت' شرارتی' لڑکیوں سے کم لڑکوں اور بچوں سے زیادہ بنتی تھی اس کی۔ بے فکری' خوش حالی اور تازگی اس کی طبیعت کا خاصا تھا... سارا دن ٹی وی سے جڑی رہتی۔ بہت کام ہوتا تو یہ کہ میاں مٹھو کو بسکٹ' ٹافیاں کھلا دیں۔ کلیاں توڑ کر چائے کی میز پہ سجا دیں اور کبھی کچھ نہ سوجھا تو ربڑ کی گیند لے کر ٹپ ٹپ سارے صحن میں گھوما کرتی۔ انچاس' پچاس۔ اکاون۔ سامنے آنے والوں کو چیخیں مار کر ہٹا دیتی۔

خود گھومتی گھومتی... کبھی کسی کرسی سے ٹکراتی' کبھی برآمدے کے ستونوں سے... تو کبھی گملوں پر براجمان ہوتی... ایک بار زور کا ٹپہ لگا اور گیند اڑتی ہوئی تایا ابا کی چائے میں۔ تب گھر بھر سے ڈانٹ پڑی۔ گیند بلال بھائی کے قبضے میں چلی گئی۔ چند دن خوب ہی سکون رہا۔ پھر ایک روز جنون بڑھا... تو سنگھاڑا جو صبح وشام گھر کی صفائی کے لیے آتا تھا۔ چپکے سے اسے گیند تھما گیا۔ تب سے شام دوبارہ ٹپ ٹپ کی آواز سے آباد ہو گئی تھی۔

تائی اماں اونگھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ وہ ان کی بھی لاڈلی تھی۔

گنگو شاید واپس آ گیا تھا۔ گھرر... گھرر... زوں شوں کی آوازیں سوچوں میں خلل پیدا کر رہی تھیں۔ انہوں نے ناگواری سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا... پھر یاد آیا... پرس ان کی خواب گاہ کے تکیے تلے ہوتا ہے۔ لمبی سانس لے کر انہوں نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ اور پھر یک لخت ہی چونک اٹھیں۔ ان پانچ چہروں کے پیچھے سے ایک اور چہرے نے اپنی جھلک دکھلائی تھی۔ عظمیٰ بابا عرف اوما۔

انہیں حیرت ہوئی... چھوٹی' بڑی چچی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود بھی اسے یاد نہ رکھا تھا..

کیوں..؟

شاید اوما اس لسٹ میں کہیں تھی ہی نہیں۔ سب سے اوپر... نہ سب سے نیچے۔



"ارے میں کب کہتی ہوں کہ کوئی شہزادہ' کوئی چندے آفتاب' ماہتاب ڈھونڈ کر لاؤ۔ ہمیں تو کوئی انسان کا بچہ چاہیے بس... گھر بار ہو' اچھا کماتا ہو اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ساس' نندیں' دیور کسی پر اعتراض نہیں۔ میری بچی کو عادت ہے بھرے گھر میں رہنے کی۔ بچپن سے دوسروں کو پکاتی' کھلاتی آئی ہے۔ ایم اے پاس ہے۔ سولہویں درجے کی ملازمت کر رہی ہے۔ شکل وصورت میں کسی سے بڑھ کر نہیں تو کم بھی نہیں۔"

"امی کتنی ذہین ہیں۔ ایسی رٹی رٹائی تقریر۔ رشتے والی خالہ بدل گئیں مگر اس تعارفی بیان میں کوئی ادل بدل نہیں۔" اسے خوامخواہ ہی ہنسی آ گئی۔

اور اس رشتے کے پیچھے اس نے خود کو کتنا بدل ڈالا تھا۔

بالوں کے بڑھنے کی رفتار کوئی خاص نہیں تھی۔ لہٰذا لاغر سی چوٹی بنانے کے بجائے انہیں کندھوں تک خوبصورتی سے ترشوا لیا تھا۔ لو جی۔ پچھلے مہینے امی نے عینک کی جگہ لینس لگوا دیے تھے۔ لو جی۔ ایک اور مصیبت... لینس لگائے کون؟ اتارے کون...؟ صبح صبح کسی کو ناشتے کی فکر ہوتی۔ کسی کو کپڑوں کی... اور وہ لینس ہاتھوں میں لیے دوڑتی پھرتی... ادھر لگاتی... ادھر پھڑک کر باہر... کبھی الٹا لگ جاتا... لڑکیوں کے ہاتھ تو سمجھو لطیفہ ہی لگ گیا۔ بس نہیں لگا تو کوئی معقول رشتہ ہی اماں کے ہاتھ نہ لگا۔ چنانچہ ہر مہینے پارلر پہ حاضری لازمی کر دی گئی تاکہ مختلف کریموں سے سانولا رنگ تو کہیں دبا ہی رہے۔ وہ پوری طرح اپنے آپ کو فٹ رکھنے کی کوشش کرتی۔

عام لڑکیوں کی طرح اس بات کو نہ اپنے لیے مسئلہ بناتی نہ دوسروں کے لیے... رشتہ نہ ملنا اس کے لیے نہیں امی کے لیے مسئلہ تھا اور وہ خود ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً شادی' بیاہ

کا معاملہ... اس کا ایمان تھا' دیر سویر سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ رشتے آسمانوں پر ہی طے پاتے ہیں۔ پھر ان باتوں پہ خواہ مخواہ کی ٹینشن کیوں...؟ ہاں امی کے اطمینان کے لیے آنے والے رشتوں میں خوب ہی دلچسپی لیتی... خود لڑکے کا بائیو ڈیٹا سننے بیٹھ جاتی... ایک دفعہ صرف اس لیے رشتہ واپس کر دیا کہ لڑکے کا نام ''دین محمد'' تھا۔'' بس تب تو امی جو اس سے خفا ہوئیں تو انہیں منانے کے لیے اسے انجو مامی کا سہارا لینا پڑا تھا۔

''دین محمد'' البتہ راتوں کو خوابوں میں آ آ کر اسے ڈراتا تھا۔

○ ○ ○

''میں نے کہا... شاہ زین آ رہا ہے۔''

''کہاں ہے...؟'' تایا ابا نے سر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔

''میں نے یہ کب کہا کہ ابھی چلا آ رہا ہے۔ آ جائے گا کچھ دنوں تک...'' تائی امی نے قدرے برا مان کر کہا۔

''کافی دنوں سے سن رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔''

''جی ہاں۔ پرانی اطلاع ہے مگر بہتر ہوگا' ذرا اس پر غور فرما لیں۔''

''کس پر...؟'' ان کی تمام تر توجہ ٹی وی اسکرین پر تھی۔

''شاہ زین کی آمد پر۔''

''اس میں غور فرمانے والی کونسی بات ہے؟''

''جی نہیں۔ غور فرمانے والی بات صرف بشریٰ انصاری میں ہے...'' تائی اماں چیخ کر بولیں تو وہ سٹپٹائے۔

''ایک تو یہ عورت...'' انہوں نے پہلو بدل کر بے چارگی سے ٹی وی اسکرین پہ چہکتی صائمہ چودھری کو دیکھا۔

''ڈولی کی آئے گی بارات'' ایسا ڈرامہ نہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بیگم کی بور ترین باتوں پر توجہ دیتے۔

''مسئلہ کیا ہے؟''

''شاہ زین کو ٹھہرانا کہاں ہے''

''اس دو کنال کے گھر میں اس کے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔'' انہیں غصہ آیا۔

''دو کنال کے گھر میں 35 افراد بھی رہتے ہیں۔'' تائی اماں نے جتایا۔

''اوپر کا کوئی کمرا صاف کروا لو۔'' آسان سا حل تھا۔

''اوئے۔ مارنا ہے اسے؟''

''کیوں... اوپر کوئی پھانسی گھاٹ ہے کیا...؟''

''لاحول ولا... کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ میرا مطلب تھا' وہ ٹھنڈے علاقے سے آئے گا۔ اوپر تو غضب کی گرمی۔ اس پر لوڈ شیڈنگ۔ بچہ بے چارہ تو پگھل جائے گا۔''

''تو بچے نے یہاں کرنے کیا آنا ہے...؟ اسے نہیں معلوم یہاں کے حالات۔ اور ٹھیک ہے اس نے رہنا ہے تو برداشت کرے۔ گرمی بھی اور لوڈ شیڈنگ بھی۔''

صائمہ چودھری کا رنگ چڑھ رہا تھا۔

تائی اماں چپ چاپ باقی کی بات منہ میں لیے اٹھ گئیں... اور سیدھی بڑے چچا کے بلال کے پاس جا پہنچیں۔

وہ ٹراؤزر اور بنیان پہنے بیڈ پہ پھیلا ہوا تھا۔ دونوں بیٹے باپ کے سینے پر چڑھے اودھم مچا رہے تھے۔ رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چہرے پر مساج کر رہی تھی۔

''ارے تائی اماں! آپ۔ آیئے ناں...'' بلال جھٹ مؤدب ہو بیٹھا۔

تائی اماں بیٹھیں اور نئے سرے سے شروع ہو گئیں۔ بلال چپ چاپ سنتا رہا۔

پہلے تایا ابا کی شکایتیں۔ پھر اصل مسئلہ۔

''یہ تمہارے تایا' چچا انتہا درجے کے کنجوس... ایک روپیہ تک نہ خرچیں گے۔ لیکن وہ اکلوتا' ماں کا لاڈلہ... میں چاہتی ہوں' مدیحہ کو کوئی شکایت نہ ہو۔'' ''بس اتنی سی بات تائی اماں! آپ مجھے حکم کر کے بلا لیا کریں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔'' بلال سر جھٹک کر مسکرایا۔

اگلے روز دوسری منزل کے سب سے تاریک کمرے کو صاف کیا گیا۔ نیا کارپٹ نیا بیڈ' پردے' کشن' الماریاں' وال کلاک' منی پلانٹس... اے سی۔

''اوہ میرے خدا...! بلال بچے... تم نے اتنا خرچ کر ڈالا....''

''ارے یہ بتائیں' میری تائی اماں خوش ہیں کہ نہیں۔'' وہ انہیں باہوں میں لیے ان کا منہ چوم رہا تھا۔

''جیتے رہو میرے بچے...!'' تائی اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔

○ ○ ○

رات سے ہلکے ہلکے جھکڑ چل رہے تھے۔ صبح صادق ہوئی تو موسم اور زیادہ خوشگوار... کالے

کالے بادل۔ پرشور ہوا۔ فضا میں قلابازیاں لگاتے پکھیرو۔ لڑکیوں کے تو دل بے قابو ہونے لگے

"عائشہ چچی! ناشتے میں پورے۔ پورے صرف پورے۔" پائیں باغ میں نعرے بازی ہو رہی تھی۔ باورچی خانے میں آٹا گوندھنے کے لیے پر تولتی بھنڈی نے آٹے سے بھری پرات پوری ہی ڈرم میں الٹ دی۔

"اب عائشہ چچی جانیں اور ان کا کام۔" وہ بگٹٹ باغ کی طرف بھاگی کہ کہیں موسم کی رنگینیوں سے محروم نہ رہ جائے۔

وہاں رنگین آنچل لہرائے جا رہے تھے۔ لکن میٹی، بول میری مچھلی کتنا پانی.... مائی میری سنک پانی پی لو۔ تینوں بھابیاں بھی ننھی منی بنی لڑکیوں کے ساتھ۔

ہی... ہی... ہا میں مصروف... رنگین آنچل فضا میں لہرائے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحبہ جامن کے درخت پر تھیں۔ کسی کے گال پہ نشان پڑ رہا تھا۔ کسی کی ناک جامنی ہو گئی۔ نشانہ تو بہت ہی بہترین تھا۔

افشین اپنی دودھیا پالتو بلی کو زبردستی سبز گھاس پہ بٹھائے اس کے مختلف پوز لے رہی تھی۔ او بلال بھائی کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔

"اتنے اچھے موسم کا اس چار دیواری میں کیا مزہ۔ کہیں باہر چلیں۔" بعض معاملات میں صرف بلال بھائی کا ہی سکہ چلتا تھا۔ طلال کے پاس گاڑی نہ تھی۔ اور نہ ہی بزرگوں کی اجازت کے بغیر گاڑی استعمال کی جا سکتی تھی۔ چھوٹے چچا کا ٹیپو ابھی چھوٹا تھا اور شادی شدہ فاران بھائی اتنے سڑیل مزاج کہ اوما مر کر بھی ان سے فرمائش نہ کرتی... لے دے کر بلال بھائی ہی بچے۔

"جاؤ پہلے مرسلین سے اجازت لے کر آؤ۔" مرسلین اوما سے چھوٹا تھا مگر اسے بگ باس بننے کا شوق تھا۔ بلال بھائی جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہے تھے۔

"تو کہہ دیجیے کہ لے جانا نہیں چاہ رہے۔" خضریٰ نے دور سے ہانک لگائی۔

تبھی سنگھاڑے نے آ کر اطلاع کی۔

شیراز حسن' اوما کو بلا رہے تھے۔

"تیار رہیے۔ میں بس ابھی آ رہی ہوں۔" وہ بھاگم بھاگ شیراز کے کمرے تک آئی۔ وہ بہت سی کتابوں میں الجھے نظر آ رہے تھے۔

"اوما! لائبریری تک جانا ہوگا۔" انہوں نے فوراً اس کے آنے کا نوٹس لیا تھا۔ گھڑی بھر میں ایک فہرست اس کے سامنے تھی۔ مختلف عنوانات سے پُر۔ سامنے کتب مذکور تھیں۔

اس نے زیر لب دہرایا۔

"رومی کو ساتھ لے لو۔ وہ ابھی گھر پہ ہی ہوگا۔" انہوں نے چھوٹے چچا کے منجھلے بیٹے کا نام لیا۔

"کوشش کرنا... ذرا جلدی آ سکو۔" وہ پوری آنکھیں کھولے اس پہ نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔ بند کمرے میں موسم کا احوال انہیں کیا معلوم۔؟

اوما بھی جھٹ پٹ وہ کاغذ اور اپنی مخصوص ڈائری تھامے باہر نکل آئی۔

"میں تمہیں زحمت سے بچا رہی ہوں۔ لیکن اگر موسم زیادہ خراب ہوا تو بس صرف ایک مس کال۔" وہ آتے آتے رومی کو بتا آئی۔

لائبریری دور کہاں تھی۔ بس پندرہ منٹ کی چہل قدمی اور وہ بھی اتنے آفت موسم میں۔ وہ نہر کنارے کھلے بے تحاشا نارنجی رنگ والے پھولوں کے ساتھ ساتھ چلتی لائبریری تک پہنچ گئی تھی۔ اندر حبس تھا۔ لیکن وہ مستعد ہو چکی تھی۔ کتابوں کا ایک ڈھیر نکال کر وہ ایک مخصوص میز پر جا پہنچی۔ مطلوبہ نکات جمع کرتے کرتے اسے تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ چکے تھے۔ لیکن وہ خوش تھی۔ شیراز حسن اس کا کام دیکھ کر یقیناً اسے شاباش ہی دیتے۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سیاست' ثقافت' ادب اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ ان موضوعات پر بلا تکان بولا کرتی تھی۔ شیراز حسن اس کے اس شوق سے بخوبی واقف تھے اور بھرپور فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔

خود باہر نکلنے سے کتراتے تھے لہٰذا اسی کو پیغام بھجواتے اور وہ نہایت عرق ریزی سے ان کا من چاہا کام کر کے ان تک پہنچا دیتی۔

اب بھی وہ نہایت شاداں و فرحاں لائبریری سے نکلی تھی۔ ہلکی پھلکی رِم جِھم کے ساتھ مگر یہ ساون بھادوں کی بارش تھی منہ زور، باغی، دھواں دھار۔ وہ لائبریری کا سیاہ آہنی گیٹ عبور کر چکی تھی۔ ایک پل کے لیے سوچا۔ واپس ہولے۔ تب ہی سفید کرولا قریب آ کھڑی ہوئی۔

"جلدی کرو۔ جلدی۔"

"ہائیں... ہائیں..." بارش کی تیز بوچھاڑ میں کسی نے بازو سے گھسیٹ کر گاڑی میں بھی ڈال لیا۔

"یہ تم سب کے سب کہاں؟" ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مسلیں پھر دلچسپی سے ان سب کو دیکھا۔

"ارسلان' شرزا اور فاطمہ۔" انجو مامی کے تینوں بچے۔

"شیراز بھائی نے فون کیا تھا... فوراً لائبریری پہنچو۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں...؟ بس پہنچ گئے لائبریری۔ اور "کیوں؟" تو سامنے ہی کھڑی نظر آ گئیں۔"

فاطمہ اس کی درگت بنی دیکھ کر خوامخواہ ہی دانت نکالے جا رہی تھی۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ گھر کے گیٹ پہ تھے۔

یہاں ایک اور حیرانی۔

دونوں گاڑیاں لدی پھندی چلنے کو تیار... کہاں؟

''مدیحہ پھپھو کا فون... شاہ زین... ایئر پورٹ...'' دھائیں برستی بارش میں قریب سے گزرتی گاڑی میں سے کچھ اس قسم کی آوازیں آئی تھیں... ٹیپو بے چارہ گاڑی کا شیشہ کھولے آدھے سے زیادہ باہر لٹک رہا تھا۔

'تم لوگ جا سکتی ہو تو پھر ہم کیوں نہیں؟'' فرح اور ضویا گیٹ پہ کھڑی بچڑ رہی تھیں۔ ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو دونوں طرف سے دھاوا بول دیا۔

''ارے... رے... ہم تو...'' اوما چلائی مگر ارسلان بھی آج موڈ میں تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔



واپسی کا دو گھنٹے کا سفر از حد بور ثابت ہوا تھا۔ لاہور جانا اور پھر مہمان کے بغیر واپس آنا۔ سارا سفر ہی بے کار... جاتے ہوئے جو کھانا پینا' ہلا گلا ہوا۔ ایئر پورٹ پہ جا کر ماند پڑ گیا۔

لڑکیاں سمٹ سمٹا کر گاڑی میں ہی بیٹھی رہیں۔

لڑکوں نے ایئر پورٹ کا کونا کونا چھان مارا۔ وہ حضرت شاہ زین... اونچے لانبے گھبرو جوان... فیس بک پر ہزار بار کے دیکھے ہوئے۔ اب یہاں خدا جانے کون سا ماسک پہن کر آئے کہ کسی سے پہچانے نہ گئے۔ لڑکوں سے تو خوب ہی دوستی تھی۔ گپ شپ... مشورے مشاورت... سانجھی دوستیاں۔

مایوس ہو کر گھر کے فون کھڑکائے گئے۔ جو اول تو ریسیو نہ ہوئے اور ہوئے تو حکم ملا کہ۔

''واپس چلے آؤ۔''

''ہائیں۔ ایسے کیسے۔ بنا مہمان؟'' وہ حیران تھے مگر واپس ہو لیے۔ سارا راستہ اونگھتے' سوچتے' کوستے ہوئے گزرا۔

گھر میں داخل ہوئے تو بھنڈی انہیں دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ دینے کے لیے خضریٰ شانہ بشانہ۔

''شاہ زین بھائی سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ مدیحہ پھپھو نے چوری چوری یہاں فون کر دیا۔ شاہ زین بھائی کو کیا خبر...؟ جہاز سے اترے... ٹیکسی کی اور سیدھے یہاں... بارش ختم... ہوا ختم... اور سورج سوا نیزے پر... وہ تو جی... گرمی اور حبس سے گوڈے گوڈے گھبرا گئے۔'' گوڈے گوڈے بھنڈی کا تکیہ کلام تھا جو کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ فٹ ہو سکتا تھا۔

''پہلے تو کالونی میں گھوم پھر کے گھر ڈھونڈا... چکر کھا کھو کے آخر یہاں پہنچے تو آگے سے گنگو ٹکر گیا۔ گنگو بے چارہ کانوں سے بہرہ... وہ بولیں... یہ سنے نہ... وہ پوچھیں تو یہ ہنس دے... تنگ آ کر خود ہی مال اسباب اٹھا کر اندر گھس گئے۔ ارم باجی سامنے سے آ رہی تھیں۔ پر ان کو کہاں دکھائی دیں۔ وہاں تو پسینہ گوڈے گوڈے بہہ کر آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ خود تو آگے گزر گئے۔ گملا پیچھے لڑھکا دیا۔ اب پتا نہیں لڑھکایا تھا یا لڑھک گیا۔ مگر اپنی ڈاکٹرنی صاحبہ پیر کے انگوٹھے پہ ہلدی' تیل لگا کر پٹی باندھ رہی ہیں۔'' وہ دانت نکالتی داستان سناتی رہی۔

لڑکے تو کب کے شاہ زین کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے اٹھ گئیں... کچھ نے جا کر ارم کی مزاج پرسی کی۔ کچھ سونے کے لیے لڑھک گئیں۔ اوما شیراز حسن کے کمرے سے ہو کر اپنے پورشن میں آ گئی تھی۔ سارے دن کی تھکان کے بعد وہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی تھی۔



''نہ... شاہ زین بھائی! آپ کو آخر سوجھی کیا؟ ہم تو کئی دنوں سے بنیروں پہ بتیاں بال رہے تھے کہ شاہ زین آ رہا ہے۔ آ رہا ہے۔ اور آپ آئے بھی تو یوں۔ اور بیچاری ارم آپی کا کیا قصور...؟ ابھی تک ہلدی... تیل...'' یہ خضریٰ تھی۔ اوما اور مرسلین سے چھوٹی دوپہر کے ان دیکھے سانحے کو تخیل کے پردے پہ دیکھ دیکھ کر ہنستی جا رہی تھی۔

شاہ زین بے چارہ شرمندہ سا بیٹھا تھا۔

سب ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ ایک گھنٹہ تو پورا تایا ابو نے لگایا سب کو تعارف کرانے میں... اور اس کے بعد سے نوجوان پارٹی اسے گھیرے بیٹھی تھی۔ شاہ زین غالباً تیرہ اٹھارہ سال بعد آیا تھا۔ اور فی الحال ذرا چپ چاپ بیٹھا ان کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

سب لوگ عجب رنگوں کے تھے اور ہر رنگ اپنی جگہ منفرد۔ نکھرا ہوا۔ شوخ... بات سے بات نکالتے تھے۔ فقرہ ابھی کہنے والے کے منہ میں ہوتا اور باقیوں کی ہنسی اسٹارٹ۔ بہت سی بے تکی باتوں کے درمیان بلال بھائی اچانک بڑی سنجیدگی سے کہتے۔

''میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

ساری قوم اپنی بولتی بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

"کریم والے بسکٹ میں کریم ہوتی ہے لیکن ٹائیگر بسکٹ میں ٹائیگر نہیں ہوتا۔" ہاہاہا۔

کبھی جھاڑو دیتے سنگھاڑا کو اچک کر لے آتے۔ وہ بھی شوقین مزاج۔ گہری سیاہ رنگت پر سفید دانت لشکارے مارتے تھے۔ شاید اسی لیے سنگھاڑا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر لمبی تان لگاتا۔

رحمت دا دریا الٰہی!

تے ہر دم وگدا تیرا

تے اک قطرہ بخشے مینوں

تے کم بن جاندا میرا

میاں محمد بخش، کلام باہو، ہیر وارث شاہ۔ چل سو چل...

مروا کے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے... بے آواز۔ چنبیلی مہکنے لگتی... وہ سب دم بخود بیٹھے رہتے۔

سنگھاڑے کی جوان آواز شام سمے کا دکھ روتی۔ کہیں احساس زیاں جگاتی کہیں انجانا دکھ بھر دیتی۔ نوجوان دل تازہ محبتوں کی یاسیت سے رسنے لگتے۔ ہر چہرہ اپنے رنگ پہ آ جاتا۔

ایسے میں شاہ زین حسن ٹکر ٹکر ان کھوئے ہوئے انسانوں کو دیکھتا رہتا۔

○ ○ ○

"چھوٹی چچی پوچھ رہی ہیں۔ چائے کمرے میں پئیں گے یا ہال میں۔"

"نہیں یار! ابھی کچھ سونے کا موڈ ہے۔ چائے کچھ دیر کے بعد۔" شاہ زین سنگھاڑے کو ٹال کر بیڈ تک آیا۔

"بڑی چچی نے کہا ہے۔ چائے دم پہ رکھی ہے ابھی بھجوا دیں یا...؟"

ٹیپو جھانک رہا تھا۔

"پلیز... ابھی تھوڑی دیر بعد... میں کچھ ریسٹ چاہ رہا تھا۔"

شاہ زین نے قدرے ندامت سے دوبارہ انکار بھجوایا۔ وہ آج صبح سے مختلف ہاؤسنگ کالونیوں کا جائزہ لینے کے بعد کچھ دیر قبل ہی گھر لوٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر ایک بار پھر کھٹ پٹ ہوئی۔ "چائے کچھ دیر بعد..." اس نے نعرہ لگایا اور تکیہ سر پر۔

"اچھا... اچھا۔"

"ہائیں..." اس نے تکیے کے نیچے سے جھانکا۔

تائی اماں بے چاری دبے پاؤں واپس لوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک جست لگا کر ان تک پہنچا۔

"آئیے... آئیے... سوری۔ معذرت... میں سمجھا۔" اس نے انہیں کندھے سے تھاما اپنے پاس لا بٹھایا۔

"تم شاید آرام کر رہے تھے...؟" بڑا میٹھا لہجہ تھا۔

"نہیں جی۔ میری کیا مجال...؟ مم... میرا مطلب ہے، آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی تائی جان! مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"جیتے رہو... جیتے رہو... میں تو بس تم سے کچھ باتیں..." اور پھر باتیں شروع... وہ بھی تائی اماں کی۔

شاہ زین جمائیاں روکنے کی کوشش میں ہلکان... آنکھوں میں نیند کی سرخی لیے... وہ ان کی باتیں سن رہا تھا اور سنے جا رہا تھا۔

سب باتوں کی ایک ہی بات......

"مغربی لڑکیوں کی خرابیاں اور ان سے دوستی کے نقصانات..."

معلوم نہیں اتنے نکات کہاں سے جمع کیے تھے انہوں نے.... ہاں بھئی.... بیٹا لکھاری، صحافی... تو اماں پر بھی کچھ تو اثر ہونا ہی تھا ناں۔

"شاہ بیٹا! کہیں تم نے تو وہاں کی لڑکی سے.... کوئی چکر وکر تو نہیں چلا رکھا۔ میرا مطلب ہے۔ یہ دوستیاں وغیرہ۔"

"جی؟ لڑکیوں سے دوستی..." وہ کہتے کہتے ایک دم رکا۔

تائی اماں کی آنکھوں میں سو خدشے، وہم خوف سرسرا رہے تھے۔ شاہ زین کو فوری طور پر اپنے جواب میں ترمیم کرنا پڑی۔ اقرار کی صورت میں تو بخیے ادھڑنے کا ڈر تھا۔

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں... لڑکیوں سے دوستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... میں ایک پاکستانی گھرانے کا چشم و چراغ... میں اور ایسی حرکت... توبہ... توبہ..." اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر احساس ہوا کہ ضرورت سے زیادہ بول دیا ہے۔ سر کو دو چار بار جھٹکا۔ اف خدایا۔

"یہ فضا کا اثر ہے یا ماحول کا... نیند کے سامنے ایسی بے بسی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی... شاید بریانی کی خوراک۔"

تائی اماں نے بھی غالباً اس کی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ سو اسے آرام کرنے کا کہہ کر اٹھ کھڑی

ہوئیں... پھر جاتے جاتے پلٹیں۔

''میں نے کہا اگر چائے۔''

''ضرور... کیوں نہیں... چائے بھجوا دیں... اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

اور کچھ ہی دیر بعد... ڈھیر سارے لوازمات کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس نے بہت سوچ
مگر یاد نہ آسکا کہ وہ کس ریاست کا نواب تھا۔

o o o

یہ بڑی سی میز تھی اور انواع واقسام کے کھانوں سے پُر۔

رات کے کھانے کا وقت تھا۔

ٹیپو کی آنکھیں حیرت کے مارے کھل گئیں اور رومی کا منہ۔

''یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟'' رومی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے پوچھا۔

''کچھ پڑھ کے پھونک رہے ہیں کھانے پر... سب کے ہاتھ کیوں بندھے ہوئے ہیں...؟''
ٹیپو نے سرگوشی کی۔

''شاید بھیا کا انتظار ہے۔ آدھ گھنٹہ قبل پیغام آیا تھا۔ ''آرہا ہوں۔''
اب معلوم نہیں... کہیں بھول بھلیوں میں کھو گئے... یا چھکڑے پہ بیٹھ کر آرہے ہیں۔''

''اوہ...'' رومی نے کھانے کی میز پر نظر دوڑائی۔

''ہم لوگ شروع کرتے ہیں ناں... وہ بھی۔''

''ناں... ناں'' تینوں خواتین یک لخت ہی چلائیں... ٹیپو بے چارے کے ہاتھ سے
چھوٹ کر دور جا گرا۔

''مہمانوں کے بغیر کھانا کھانے کا رواج کب سے شروع ہو گیا ہمارے ہاں! انتظار کر رہے
سب لوگ کر رہے ہیں۔''

ٹیپو نے جھاڑ کھائی اور پھر اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہا۔ کیونکہ وہاں سب ہی اپنا اپنا منہ لے
بیٹھے تھے۔ ادھر شاہ زین صاحب گہری نیند سے بیدار ہو کر نہائے' دھوئے' بال بنائے۔ سیڑھیوں
سے نیچے اترے تو جدھر کچھ آوازیں آئیں' ادھر کو ہو لیے... ابھی یہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آ
دن بھی نہ ہوئے تھے۔ نہ ہی سارا گھر گھومے پھرے تھے.. پھر سب ہی پورشن ایک سے...!
چھوٹا سا کوریڈور عبور کر کے بائیں جانب مڑے تو ماحول میں کچھ اجنبیت سی محسوس ہوئی۔
یہاں رات کی رانی اور چمپا کے ساتھ ساتھ مولسری کی خوشبو فضا میں حاوی تھی... ایک کمر

ی جالی دار کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی... وہ اسی کمرے میں جا گھسے۔ یہاں بھی
احول مختلف... کہاں تو کھانے کے لیے پیغام پہ پیغام آرہے تھے اور کہاں کھانے کا نام ونشان
بھی نہیں۔ جنگ وجدل اور چیخم و دھاڑ البتہ وہی تھی جو اس گھر کے ہر اس مقام پر دکھائی دیتی تھی
جہاں دو یا دو سے زیادہ افراد پائے جاتے تھے۔

''میرا جینا محال' سونا دشوار' حال بے حال ہو چکا ہے۔ ایک الماری پہ چھپکلی چپکی ہوئی ہے۔
دوسری پہ مکڑی لٹک رہی ہے۔ دراز پہ بچھو رینگ رہا ہے۔ میرے اللہ! اس کمرے میں کسی انسان
کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' وہ لڑکی سخت خفا انداز میں بول رہی تھی۔ جبکہ دوسری گھٹنوں پہ ٹھوڑی
ٹکائے کھی کھی کیے جا رہی تھی۔

''اس سے زیادہ گھٹیا اور بے ہودہ شوق شاید ہی کوئی ہو گا۔ کل دراز سے ڈسپرین ڈھونڈتے
ہوئے وہ کم بخت لال بیگ میرے ہاتھ سے ہی چپک کر رہ گیا۔ امی آپ فوراً سے بیشتر میرے لیے
کسی دوسرے کمرے کا بندوبست کر دیں... ورنہ میں اس کو اٹھا کر آگ میں ڈال دوں گی۔''

''اوہ تو یہ معاملہ ہے۔'' شاہ زین نے اب سمجھا تھا... ماحول گرم کیوں ہے۔ امی بے چاری
نے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اٹھایا۔ تو شاہ زین نے عائشہ چچی کو پہچانا۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔

تینوں نفوس نے اجنبی دستک پر چونک کر دیکھا۔ چچی کے چہرے پہ ہلکی سی ندامت ابھری۔

'کب سے فضول بکے جا رہی تھی۔ خدا جانے کیا سنا ہو گا اس نے۔'

ماں کی آنکھوں میں ہلکی سی تنبیہ ابھری۔ بیٹی نے غیر محسوس انداز میں کندھے اچکا کر اپنی بے
پروائی ظاہر کی اور پھر اسے اندر آنے کی دعوت دینے لگی۔

''سوری... یہاں شاید کوئی اور معاملہ چل رہا ہے... یا پھر میں ہی غلط وقت پر آیا ہوں۔''

''ارے نہیں بیٹا! کوئی معاملہ نہیں۔ بس ان دونوں بہنوں کے آپس کے جھگڑے۔
آؤ... بیٹھو۔'' عائشہ چچی نے فوراً جگہ کشادہ کی۔

''کیا لو گے بیٹا۔ چائے۔ ٹھنڈا۔ یا کھانا لگوا دوں'' وہ کچھ تذبذب کے عالم میں تھا۔ مگر
بہر حال بیٹھ گیا۔

''کہاں تو بھنڈی نے کھانے کے لیے دروازہ بجا بجا کر توڑ دیا۔ اور اب پوچھا جا رہا ہے کہ
...اور باقی اہل خانہ...؟

عائشہ چچی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

وہ الجھا سلجھا جواب دیتا رہا۔

اسے تو یہ ہی معلوم تھا کہ کھانے کے وقت تمام اہل خانہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اجتماعی کھانا کھانے کی نوبت ابھی تک کم ہی آئی تھی۔

ذرا سی دیر میں تلی ہوئی مچھلی' کباب اور ابلے چاول اس کے سامنے تھے۔ تھوڑی دیر میں تازہ تڑکا لگی دال اور گرم گرم چپاتیاں بھی... خضریٰ کھانا لا کر اب اس کے پاس بیٹھی کتر کتر باتیں کیے جا رہی تھی۔ اور یہ کوئی اضافی خوبی نہ تھی۔ سارا خاندان ہی باتونی تھا' یہ شاہ زین کو آتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔

''آپ تو بہت جنٹل مین بنتے ہیں۔ مم میرا مطلب ''ہیں'' بہت ہی بیبیے بچے ہیں بیبیے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ... آں... اوماذرا بیبیے کی انگریزی تو بتانا۔'' وہ بیچ میں ہی پکارتی پھر دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑتی۔

''آپ ذرا اپنے گھر بار کے چکروں سے نکل آیئے۔ پھر آپ سے چٹ پٹی سنیں گے۔''

''خضریٰ! اٹھو اور چائے بنا کر لاؤ۔'' عائشہ چچی نے اسے اٹھا دیا۔ تو شاہ زین نے پہلی بار ڈھنگ سے کھانے کی طرف توجہ دی۔

کھانے کے بعد چائے۔ اسی دوران مرسلین کی آمد ہوئی۔ وہ ایم بی اے کے آخری سال میں تھا۔

سنجیدہ مزاج نوجوان۔ گفتگو بھی خاصی سلجھی ہوئی۔ چائے کے دوران خاصی اچھی گپ شپ رہی دونوں کی۔ بعد ازاں وہ اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کی عادت تھی اس کو۔

○ ○ ○

اگلا روز خاصی گرما گرمی لیے ہوئے تھا۔ چھوٹی' بڑی چچی کے بڑے بڑے منہ پھول' سوج کر اور بھی بڑے ہو چکے تھے۔

''یہ زیادتی ہے بڑی بھابی! ہم لوگ بیس' بیس کھانے بنائے منتظر۔ سارے بچے بھوکے انتظار کرتے رہے اور وہ محترمہ اسے گھٹنے سے لگائے دال' چاول کھلاتی رہیں۔

تائی اماں نے خاموشی سے ان کا شکوہ سنا تھا۔

عائشہ بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کر گئی تھیں اور تائی اماں رہیں سدا کی منصف۔ انہیں کہیں سے بھی عائشہ چچی قصور وار نظر نہ آئیں۔ سو انہوں نے بات وہیں پہ ٹھپ کر دی۔ لیکن بگڑے ہوئے موڈ سنور نہ سکے۔

اتفاقاً اس روز شاہ زین گھر پہ تھا۔

چہروں کے بگڑے ہوئے زاویے۔ روکھا پھیکا' سرد ماحول۔

''یہ کیا ہو گیا ان لوگوں کو...؟'' شاہ زین سر کھجاتا... بددلی سے ممانیوں کو دیکھتا رہا۔ بھید تو تب کھلا... جب بھنڈی اس کے دھلے ہوئے کپڑے لے کر کمرے تک آئی۔

''رات آپ نے اچھا نہیں کیا۔ سارا ٹبر گوڈے گوڈے بھوکا بیٹھا رہا اور آپ مزے سے مچھلی' کباب کھا یہ جا وہ جا۔''

شاہ زین یک لخت ہی چوکس ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور پھر کرید کرید کر بھنڈی سے پوچھتا اور گرہیں کھولتا رہا۔

''عائشہ چچی کا پورشن الگ تھلگ کیوں؟ کھانے میں اس گھرانے کی شمولیت کیوں نہیں؟ اور کھانا ''ادھر'' سے کھا لینے پر اتنی ناراضی کیوں؟''

بھنڈی نے ہزاروں قسمیں دے کر اپنا نام صیغہ راز میں رکھتے ہوئے بتایا۔

''وحید چاچو باقی بھائیوں کے سوتیلے بھائی ہیں۔ اس پر مستزاد' شادی بھی زور زبردستی اپنی پسند سے کروائی عائشہ چچی سے... گھر والوں کا سلوک وحید چاچو سے کبھی بھی اچھا نہ رہا... لہٰذا وہ آج سے کئی برس قبل دل برداشتہ ہو کر دبئی چلے گئے۔ بیوی' بچوں کو بلانے کے لیے راضی نہیں ہوئے' خود البتہ کبھی کبھار چکر لگا لیتے ہیں۔ بچے تو آپس میں شیر و شکر ہیں۔ اور بڑے بھی بظاہر تو ٹھیک ہیں لیکن سوتیلے پن کی گرہیں کبھی نہیں کھلتیں۔'' یہ آخری نادر خیالات بھنڈی کے اپنے تھے جن کا اظہار کیے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھی۔

شاہ زین کو البتہ حیرت تھی کہ اس کی ماں نے کبھی بھی اپنے خاندانی پس منظر کو اس سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔ شاید آج تک ان دونوں ماں بیٹوں کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

○ ○ ○

کل ہی ارم نے سب لڑکیوں کے وزن کیے تھے اور کل ہی ہانک کر واک کے لیے بھی لے گئی۔ تائی اماں چلاتی رہ گئیں۔

''بھابیوں میں سے کسی کو ساتھ لے لو... ارے اکیلی جاؤ گی کیا...؟ تمہارے تایا' چچا...''

اتنے میں منہ زور لڑکیاں کھٹ کھٹ کرتی گیٹ سے باہر۔

''ہماری ماؤں کے ذہن نہیں بدلے جا سکتے۔ لڑکیاں آٹھ دس بھی ہوں تو اکیلی...'' وہ بڑے مزے سے گپیں ہانکتی ساری کالونی کے چکر لگاتی رہیں۔ تازہ ہوا نے سب ہی کے مزاجوں پر خاصا

خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ بات بے بات ہنسی قہقہے لگاتی واپس آکر تائی اماں کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

"دیکھ لیجیے۔ سب کی سب صحیح سلامت واپس۔ اپنا محلہ' اپنے لوگ پھر کاہے کا ڈر۔"

ان کا روز کا معمول بن گیا۔ تایا' چچا' بلال' فاران بھائی اس وقت تک گھر پہ نہیں آتے تھے۔ لہٰذا اس معمول میں کوئی مخل نہ ہوا۔

الٹا بڑی چچی نے بھی حمایت کی... "اچھا ہے گھڑی بھر کے لیے تازہ ہوا میں گھوم پھر آئیں... اسکول کالجز کے بعد سارا دن گھر میں بند ہی تو رہتی ہیں۔"

لیکن پھر اس معمول کو کسی اور نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔

شب بارات کی آمد آمد تھی۔ اور چھوٹے موٹے پٹاخے رات کو ادھر ادھر چھوٹتے رہتے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تیز تیز قدم اٹھاتی معمول کے راستوں پر رواں دواں تھیں۔ جب ایک موڑ مڑتے ہی یکایک پانچ سات پٹاخے عین ان کے قدموں میں آکر چھوٹے۔ ان سب کی تیز چیخوں نے کالونی کے در و دیوار کو ایک پل کے لیے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چیخ رہی تھی۔ کوئی کانوں پہ۔ ضوبیا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور خضریٰ نے باآواز بلند رونا شروع کر دیا تھا۔

وہ تین لڑکے تھے جو اس شرارت یا بدتمیزی کے بعد سامنے قطار میں بنی کوٹھیوں میں سے کسی ایک کے اندر گھس گئے تھے اور اب غالباً یہ تماشا دیکھ کر محظوظ بھی ہو رہے تھے۔

"ادھر آؤ۔" اوما کے حواس ایسی کسی بھی صورت حال میں ذرا جلدی بحال ہو جاتے تھے اس نے کسی کو ہاتھ سے پکڑا۔ کسی کو بازو سے کھینچا۔ کسی کا پلو دبوچا اور اس سے قبل کہ آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر نکلتے۔ وہ ان سب کو لے کر برابر کی پتلی سی گلی میں گھس گئی تھی۔

"یہ تم اپنا باجا تو بند کرو۔ گھر والوں کو ذرا سی بھنک پڑ گئی اس بات کی تو وہ بے عزتی ہوگی کہ یاد ہی کرو گی۔ اب چپ کر کے نکلو ادھر سے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

بات تو سچ تھی۔ وہ دم سادھے چلیں تو گھر کے گیٹ پر ہی جا کر دم لیا۔

نیچے رکنے میں خطرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی آئیں ذرا اوپر میں ہی چھت پہ ایک دائرے میں بیٹھی تھیں سر تھامے۔

"شکر کرو کہ آج بھنڈی ساتھ نہیں تھی۔ ورنہ وہ ڈھول ابھی تک بج رہا ہوتا۔" تائی اماں نے کسی خاص ڈش کی تیاری کے لیے اسے گھر پر ہی روک لیا تھا۔

ناک اور آنکھوں میں ابھی تک دھواں گھسا ہوا تھا۔

"میرے پیروں پر جلن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جل گئے ہیں۔ ارم! کہیں نشان ہی نہ بن

جائیں۔" فرح از حد فکرمند تھی۔

"شاہ زین کا کمرہ خالی ہے۔ وہاں چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" ارم دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

'ناحق بے چاریوں کو ساتھ لے کر خوار کرتی رہی۔'

شاہ زین معمول کے مطابق اس وقت باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سب آزادی سے اس کے بیڈ پر ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔ کسی نے صوفہ سنبھال لیا۔

اریبہ اس وقت سب سے معقول دکھائی دے رہی تھی لہٰذا اسے نیچے بھجوا دیا گیا۔

"تائی اماں کو کہہ دینا کہ ہم سب شیراز بھائی کے کمرے میں ہیں۔" بہانہ بتا کر روانہ کر دیا گیا۔

یہاں روشنی میں سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رنگ اڑے ہوئے۔ چہرے زرد... ہونٹ خشک... آنکھوں میں خوف کچھ کچھ غصہ۔

اوما کے لبوں سے ہنسی ایک فوارے کی صورت میں چھوٹی تھی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے سب کے قہقہے نکل گئے۔

"اوئی امی جی۔" خضریٰ کی نقل اتاری گئی۔

"ہائے میں مر گئی۔ ہائے میں مر گئی کہہ کر ڈانس کون کر رہا تھا۔" فرح کو چھیڑا گیا۔

"اف خدایا! لگتا ہے ایک پٹاخہ افشین کے بالوں میں چھوٹا تھا۔" اس کے گھونگھریالے بال بے تحاشا بکھرے پڑے تھے۔

"اتنے دنوں کی واک نے بھی کوئی اثر نہیں ڈالا۔ موٹیوں کو کھینچ کھینچ کر کے میرے نازک بازو جواب ہی دے گئے۔ اف خدایا! میں کتنی ذہین واقع ہوئی ہوں۔ اگر بروقت تم لوگوں کو وہاں سے نکال کر نہ لے آتی تو ابھی تک ہم وہاں لوگوں کے نرغے میں پھنسے ہوتے۔ اور اس کے بعد تایا۔ چچاؤں کی پیشیاں بھگت رہے ہوتے۔"

"یہ سب کیوں ہوا؟"

"کیسے ہوا؟"

"کس نے کیا؟"

"کس کی اجازت سے ہوا۔؟" اوما ناک پر عینک جمائے۔ بالکل تایا ابو ہی لگ رہی تھی۔

"ہاں تو پھر بتائیں ناں۔ کیا' کیوں' کب اور کیسے۔؟ کوئی اس کے عین سامنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔

''اوئی ماں! آپ کہاں سے نکل آئے؟''

اوما نے گڑبڑا کر سکھیوں کو دیکھا۔

''شاہ صاحب! میرا مطلب ہے شاہ زین بھیا! آپ تو اس وقت....؟''

''باہر نہیں ہوتا۔ آج شہزادیاں محل میں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ خیریت نہیں رہی... چہروں سے تو یہ ہی لگ رہا ہے اور باقی باتیں بھی اتفاق سے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے سن چکا ہوں۔ جو رہ گیا۔ وہ آپ بتایئے۔'' اب بھاگنے کی گنجائش کہاں تھی۔ اوما نے مختصر بتا دیا۔

''اب آپ کسی سے نہ کہہ دیجیے گا۔ مرد حضرات سارے کے سارے تائی چچیوں پہ چڑھ دوڑیں گے کہ ہمیں گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا؟''

''ٹھیک ہے نہیں کہوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے... بیڈ شیٹ جھاڑ کر درست کر دیجیے گا۔ صوفے کے کشن ترتیب سے اور کارپٹ پر ڈسٹنگ بھی اصل میں ڈسٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ نہایت اطمینان سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

''ہائیں۔'' لڑکیوں کو قدرے حیرت ہوئی۔ پھر جھک جھک کر پہلو بدل بدل کر دیکھا جانے کن کن راستوں سے واپس ہوئی تھی۔ سب کے پیر دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

''یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ رفتہ رفتہ کھلیں گے۔'' فرح نے پُرسوچ نظروں سے شاہ زین کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کو دیکھ کر کہا تھا۔

اگلی شام کا وہ لمحہ ان سب لڑکیوں کو حیران کر دینے والا تھا۔ جب شاہ زین اور طلال ان کے سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔

''واک کرنے کون کون جا رہا ہے؟''

چند لمحے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشاورت کے بعد اوما سب سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے۔ باقی سب۔

طلال نے جاتے جاتے مرسلین کو آواز لگائی۔ مرسلین نکلا تو رومی اور ٹیپو بھی ساتھ ہو لیے تھے۔



شاہ زین نے بنا بنایا گھر خرید لیا تھا۔ وہ سب کے سب مل کر گھر دیکھنے کے لیے گئے۔ ''حادی'' کی ڈیزائننگ نے سارے شہر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اور گھر بھی ان کا ڈیزائن کیا گیا تھا۔ قدیم و جدید کا امتزاج۔ وسیع و عریض لان کے داہنی جانب ایک حوض تھا۔

''شاہ زین بھائی! فوراً سے پیشتر مالی کو بلوایئے۔ آم، انار اور لیموں کے درخت ہونے چاہئیں

بلکہ انار کا درخت اس طرح ہو کہ اس کی شاخیں بڑھ کر حوض کے پانی میں اپنا عکس دکھائیں۔ اور جب میں یہاں آیا کروں گی ناں تو حوض کنارے بیٹھ کر ''اداس نسلیں'' اور ''آنگن'' پڑھا کروں گی۔'' اوما اپنی رائے کے اظہار اور مفت مشورے دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتی تھی۔

''حوض میں سفید بطخیں ہونی چاہئیں۔ یہ مطالبہ بھی پیش کر دو۔'' فرح نے ہلکا سا طنز کیا۔

''وہ کمی تو تمہارے آنے سے پوری ہو جایا کرے گی۔'' اوما کے بجائے ضویا نے جواب دیا۔

''اور یہاں پر ایک بک شیلف ہونا چاہیے۔ اور ادھر گلاس وال کے بائیں جانب اسٹیریو پڑا ہو تاکہ برستی ہوئی بارش میں یہاں بیٹھ کر جگجیت، نور جہاں اور نصرت فتح علی خان کی غزلیں سنی جا سکیں۔''

اوما کے لہجے میں جو بات سب سے پہلے محسوس کی جا سکتی تھی، وہ اس کا کھرا پن تھا۔ کسی بھی کھوٹ، بناوٹ سے عاری، صاف ستھرا لب و لہجہ۔ جس سے کسی بھی ''جذبے'' کو اخذ کیا جا سکتا تھا۔

شاہ زین بے حد دلچسپی اور شوق سے اسے سن رہا تھا۔

اور ایسے ہی جذبے اور لگن میں چوبی زینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''اگر یہ میرا گھر ہوتا۔ تو میں یہاں۔''

تو شاہ زین نے فرح اور اریبہ کے ساتھ افشین کے چہروں کے بگڑے زاویوں کو بخوبی محسوس کیا تھا۔

''بلی کو چھیچھڑوں کے خواب۔'' کسی نے ہلکی سرگوشی کی اور بلند قہقہہ۔

اوما نے قدرے چونک کر ان سب کو دیکھا۔ اس کا دھیان بٹانے کی لاشعوری کوشش کے طور پر شاہ زین نے اسے زینے سے اوپر جانے کی پیشکش کی لیکن وہ اوما تھی۔ ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئی۔ ان ہی میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ وہ بنا سنے بتا سکتی تھی کہ کیا کہا گیا۔ اور کس مفہوم میں کہا گیا؟

شاہ زین نے اس کے چہرے کا رنگ ایک پل کے لیے بدلتا محسوس کیا مگر دوسرے لمحے وہ بالکل نارمل ہو چکی تھی۔

''میں صرف اپنا بیڈروم ڈیکوریٹ کر رہا ہوں۔ باقی سب کام والدہ محترمہ خود آ کر کریں گی۔ میری اور ان کی چوائس بہت ڈفرنٹ ہے۔'' شاہ زین کہہ رہا تھا۔

''ان کا انتظار کیوں۔ آپ اوما سے ہیلپ لے لیں۔ یہ بہترین ہوم ڈیکوریٹر ثابت ہو گی۔'' کہنے والی نے جانے کس انداز سے کہا تھا لیکن اوما نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا تھا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

○ ○ ○

شعبان المعظم کا آخری عشرہ شروع ہونے کی دیر تھی کہ تائی اماں سستی و بیماری کے سارے چولے اتار' رمضان المبارک کی تیاریوں کے لیے ہٹی کٹی ہو بیٹھیں۔ بند پیٹی کھلوائی گئی جو سال کے سال بس رمضان المبارک میں ہی کھلتی تھی۔ فنائل کی خوشبو میں ڈوبے تکیے' چادریں' کشن نکالے گئے۔ سفید چادریں ایک بار پھر نیم گرم پانی میں ڈبو ڈبو کر نکالی گئیں۔

ہال کمرہ جہاں سارے زمانے کے لڑکے' لڑکیاں' بچے اپنا اودھم مچائے رکھتے تھے خالی کرا لیا گیا۔ سنگھاڑے نے خوب ہی رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ فنائل میں بھگو بھگو کر پوچے مارے۔ الماریاں صاف کی گئیں۔ یہاں قرآن پاک' سپارے' تسبیح' جائے نماز کھجور کی گٹھلیوں سے بھرے پیالے' عطر' اگر بتیاں سج گئیں۔ دیوار سے دیوار تک صاف ستھرا دبیز قالین بچھ گیا۔ چادریں' تکیے' کشن عین وقت پر رکھے جانے تھے۔ لیجیے یہ کمرہ عبادت کے لیے تیار۔ اب مہینہ بھر گھر کی عورتیں یہیں نماز با جماعت ادا کریں گی یہیں تراویح ہوں گی۔ ماہ رمضان میں بچوں کو ادھر ادھر گپیں لگانے' کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تائی اماں یا چچی انہیں اپنی نگرانی میں بٹھا لیتیں اور وہ نہایت شوق سے کھجور کی گٹھلیاں لے کر ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔

باورچی خانے کا انتظام عائشہ چچی کے سپرد تھا۔ وہ سودا سلف لانے کے لیے ایک ایک کو پکڑتیں۔ اس بار شاہ زین نے انہیں فکر مند دیکھا تو مزے سے انہیں گاڑی میں بٹھا کر یہ جا' وہ جا۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ جب موصوف ادھ موئے ہو کر لوٹیں گے تو ان کی خوب ہی درگت بنائی جائے گی۔ مگر خلاف توقع شاہ زین خاصا ہشاش بشاش واپس آیا تھا۔ اس کے لیے تیاریاں نئی مگر بہت دلچسپ ثابت ہو رہی تھیں۔

اوما نے دو دن سے اپنی شکل نہ دکھائی تھی۔ سحری اور افطاری کی ابتدائی تیاریاں لڑکیوں کے ذمے تھیں اور لڑکیوں میں سے اوما کو باورچی خانے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ باقیوں کی بس چھٹی۔

"دہی بڑوں کے لیے ماش اور مونگ کی دال پسوا کر رکھ لی ہے۔ کباب تیار ہو کر فریزر میں پہنچ گئے۔ میکرونیز اور چکن رول کا مصالحہ تیار۔ املی کی چٹنی بن گئی۔ کیچپ بازار سے آ گیا۔ اب اگر کسی اور چیز کے لیے کسی کو تکلیف ہو تو وہ خود ہاتھ پیر ہلا سکتا ہے۔"

پہلے روزے سے دو دن قبل نماز مغرب کے فوراً بعد اعلان کرتے ہوئے وہ دھپ سے فرح کے بیڈ پہ جا گری تھی۔

"ہائیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں اسی میں جواب دے گئے کیا؟" حیرت بھری آواز پر وہ سٹپٹا کر اٹھی۔

شاہ زین مناسب جگہ نہ ملنے پر کونے کے اسٹول پر اٹکا ہوا تھا۔ ٹانگیں البتہ طلال کی گود میں تھیں۔

"ارے آپ بھی یہیں پائے جاتے ہیں...." اس نے غیر محسوس انداز میں دوپٹہ کھینچ کر پھیلایا جو آتے کے ساتھ ہی بیڈ پر اچھال دیا تھا۔

"جی ہاں! خوش قسمتی سے یہاں چھوٹے' بڑے سب ہی پائے' پائے جاتے ہیں۔" طلال نے فقرہ بنایا... شاہ زین کا قہقہہ۔

"اور آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہوا بھلا؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ڈیڑھ' دو سو کباب کا قیمہ پیس کر اور پھر کباب بنا کر دکھایئے تو مانیں۔ اتنی ڈھیر ساری تو سبزیاں ہی کاٹی ہیں۔ بند گوبھی سمیت۔"

"یار طلال! یہ پاکستانی لڑکیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔" نہایت ترحم آمیز لہجے میں کہا گیا تھا۔

جواب کسی اور طرف سے آیا تھا۔

"بس جی کیا کریں.... پاکستانی جو ہوئے۔ ہماری قومی و نسلی خصوصیت ہے.... نازک مزاجی اور آرام طلبی.... ہم بیس بائیس برس انگریز کے ملک میں گزار کر بھی پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ لوٹ کر آئیں تو یہ خصوصیات کہیں نہ کہیں سے عود کر آتی ہیں پھر ہم جوتے سنگھاڑے سے رگڑواتے ہیں۔ رومال' جرابیں گنگو کے سر پہ دے مارتے ہیں۔ ناشتہ بارہ بجے اپنے موڈ کے مطابق بنواتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کے لیے چچی' تائیوں کی دوڑیں لگواتے ہیں اور رات گئے تک گھر بھر کو کھانے کی میز پہ انتظار کرواتے ہیں اور پھر کوئی سچی بات کہے تو برداشت بھی نہیں کر سکتے اور نیلے پیلے' لال ہونے لگتے ہیں.... کیونکہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستانی تو ہوتے ہی نازک مزاج ہیں۔"

شاہ زین کو تو خدا جانے سانس بھی آ رہی تھی کہ نہیں۔ وہ خود البتہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے کا دروازہ پار کر گئی۔

کمرے میں بیٹھے نفوس نے بڑی دیر بعد اپنی رکی ہوئی سانس خارج کی۔ حواس وقیاس بحال کیے پھر پلٹ کر شاہ زین کو دیکھا۔

"ارے.... ارے.... وہ تو بس یونہی۔" شاہ زین کو لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھ کر لڑکیاں اپنی جگہ بوکھلائیں۔

طلال اور ٹیپو منہ چھپائے ہنسی روک رہے تھے... شاہ زین دھپ دھپ زمین پہ پاؤں مارتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"کتنی بدتمیز ہے یہ اوما...." فرح کا دل اس قدر دکھا کہ بس رونے والی ہی ہوگئی۔ کسی بھی خوبصورت اور ڈیشنگ بندے کی اس قدر بے عزتی کم از کم اس کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً اس وقت جب وہ بندہ کنوارہ ہو اور رشتے کی تلاش میں بھی ہو۔

"حد کر دی بھئی۔ یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔" یہ اریبہ تھی۔

"زیادہ ہی بد دماغ اور بدمزاج ہے یہ لڑکی۔" ایک اور رائے۔

وہ مہمان ہے اس گھر میں۔ اسے اتنی اجازت کس نے دی ہے کہ۔"

اور بس بات کمرے سے نکل کر برآمدے تک.... برآمدے سے باورچی خانے... اور یہاں سے کھڑکی پھلانگ کر سیدھی عائشہ چچی تک۔

پھر جو اوما کی مزاج پرسی ہوئی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گئی۔ پھر ہکلائی' منمنائی اور آخیر میں غصے میں آگئی۔

"یہ ایک انتہائی معمولی سی بات ہے اور اسے اتنا بڑھاوا دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔" مگر اس وقت تو امی کے اندر تائی' چچیوں کی روح سمائی ہوئی تھی۔ جو تڑپ رہی تھی۔ پھڑک رہی تھی۔ اور پھڑکتی بھی کیوں نہ؟

محترم شاہ زین حسن نے سنگھاڑے کو اپنے جوتے پالش کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ چچی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر باورچی خانے میں جا کر کھانا تناول کیا گیا تھا... رات کو کھانے کی میز پر سب سے پہلے موجود... اور وہ بھی ایسے کہ منہ بنا ہوا.... سنجیدگی کی چادر اوڑھے.... ہر بات کا نپا تلا جواب.... زود رنج لڑکیوں کے دل تو رنجیدہ تھے۔ مائیں بھی اس کا موڈ بحال کرنے میں ہلکان ہوتی رہیں۔



"یہ اوما کچھ دنوں سے نظر نہیں آرہی۔" شیراز حسن نے اچانک ہی سر اٹھا کر رومی سے پوچھا۔ ان کا ٹیبل لیمپ رات جلتے جلتے اچانک ہی بند ہو گیا تھا۔ رومی اسی کے آپریشن میں مصروف تھا۔

"اوما آپی اور گھر والوں کے درمیان کچھ ناراضی چل رہی ہے آج کل۔"

"کیوں....؟" رومی نے ساری کتھا کہہ سنائی۔ وہ بھی نہایت دلچسپ پیرائے میں۔

"شاہ بھیا نے اپنی دانست میں صرف چھیڑا تھا۔ یہ نہیں دیکھا کہ کس کو چھیڑا ہے۔؟ انہوں

نے کچھ کہا' اوما آپی نے جواباً بہت کچھ کہا۔ لیکن کہہ کر جانا کہاں تھا۔ سارا گھر ہاتھ دھوئے بغیر ہی ان کے پیچھے پڑ گیا۔ عائشہ چچی نے ناک میں دم کر رکھا ہے کہ جا کر شاہ سے معافی مانگو۔ اب یہ ہو تو ہو کیسے؟ اوما آپی اور معافی تلافی۔ سورج تو ابھی مشرق سے ہی نکلتا ہے ناں بھیا۔"

رومی ہنس رہا تھا۔

شیراز حسن سنجیدہ تھے۔

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں... اگر وہ غلطی پر ہو تو بہت جلدی تسلیم کر لیتی ہے... لیکن اگر وہ اپنی دانست میں ٹھیک ہے تو پھر واقعی اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"بات تو مذاق میں ہی ہوئی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اتنا بڑا ایشو بنا لیا گیا۔"

رومی بار بار سوئچ آن' آف کر کے لیمپ چیک کر رہا تھا۔

"ایشو اس لیے بنا رومی! کہ یہ باتیں غلطی نایاب نے کہی ہیں۔ کسی اور نے کہی ہوتیں تو صرف مذاق ہی کہلاتیں۔ مان لو کہ ہم آج بھی وحید چاچو کی اولاد کو اس گھر میں دوسرے درجے کا فرد سمجھتے ہیں۔ اور یہ تینوں بچے نہایت خود داری اور آہنی ارادوں سے اپنی دو نسلوں کی غلطی بھگت رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" رومی ان کے قریب آ بیٹھا۔

"دیکھو' پہلی غلطی دادا صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کی انتہائی سادہ مزاج عورت کو ایک نہایت با اثر اور متمول گھرانے کی عورت کے مقابل لائے اور پھر تاعمر وحید چاچو کے حقوق غصب ہونے کا تماشا دیکھتے رہے۔ دوسرا غلط قدم وحید چاچو کا تھا جنہوں نے اپنی ماں کی سگی بھانجی کو زندگی کا ساتھی تو بنایا لیکن انہیں خاندان میں مناسب مقام دلوانے میں ناکام رہے۔ الٹا سارے مسئلوں سے جان چھڑانے کو کوسوں دور جا بیٹھے۔ اور میں جانتا ہوں رومی! اس سارے عرصے کے اچھے اور برے وقت کا غلطی نے کس حوصلہ مندی اور جرأت سے سامنا کیا ہے۔ وہ سب کے ساتھ ہنستی بولتی' کھیلتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں کبھی سوچ اور فکر کی تحریر پڑھنا۔ وہ تمہیں اپنی عمر سے کئی گنا بڑی نظر آئے گی۔ میرے کمرے کی کھڑکی اس کے آنگن میں کھلتی ہے۔ میں نے عائشہ چچی کو سوتے اور اسے رات' رات بھر جاگ کر ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا ضبط' اس کا ظرف باکمال ہے۔ کہنے والے کو پلٹ کر جواب نہیں دیتی۔ جذب کر لیتی ہے۔ اور ایسے لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔"

"آپ اتنا زیادہ جانتے ہیں اوما آپی کو....؟" رومی کو از حد حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔ یہ لڑکی مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا۔ اس کے بعد مجھے بہلانے کی سب سے زیادہ کوششیں اوما نے کیں۔ اور میں نے اس کی عزت نفس کے مینار بلند کرنے کے لیے

اپنے ہر دکھ کی سانجھ اس سے کی۔ میں اپنے کام کے معاملے میں اوما پر بہت زیادہ بھروسا کرتا
ہوں۔ کیونکہ اس کی ذہانت چولہے' چوکی سے کہیں بڑھ کر ہے۔
وہ سوتیلے پن اور باپ کے بزدلانہ رویے کی شکار نہ ہوئی ہوتی تو اس کی قابلیت اسے کہیں
بہت اوپر لے جاسکتی تھی۔"
"شیراز بھائی! اس گھر کے بڑے آپ کا کہا مانتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کے لیے کوئی
کوشش۔"
"نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں خود لاعلم تھا۔ چہروں کو پڑھنے کے ہنر سے ناواقف۔ مجھ پر جو حادثہ
گزرا.... اس نے مجھ پر بہت سے راز فاش کیے جن میں سے ایک راز عظمٰی نایاب تھی۔ اور اس
وقت کوشش کا زمانہ بیت گیا تھا۔"
شیراز حسن کے لہجے میں تاسف ہی تاسف تھا۔ رومی کچھ کہے بغیر چپ چاپ ان کا چہرہ تکتا رہا
تھا۔

○ ○ ○

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی مدیحہ پھپھو کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی۔
"بس عید تک رکوں گی۔ اسی دوران شاہ زین کی شادی اور پھر واپسی۔ نثار صاحب ابھی وائنڈ
اپ کے لیے راضی نہیں ہو رہے... کم سے کم بھی چھ' آٹھ ماہ ہمیں لگ جائیں گے' تب تک شاہ
زین پاکستان میں اچھی طرح سے سیٹ ہو جائے گا۔"
اور اس تمام گفتگو کے جس حصے نے توجہ جکڑی، وہ تھی شاہ زین کی شادی۔ دبا دبا سا جوش ایک
بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
فرح کا سلم ہونے کا بخار اک بار پھر زور پکڑ گیا۔ روزہ رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سارا دن
چوری چھپے پھل' سلائس' قہوہ لیتی رہتی۔ بڑی چچی عید کے بہانے ارم اور افشین کو پارلر کا چکر لگوا
لائیں۔ اریبہ نے اپنی پلکوں کی جاذبیت بڑھانے کے لیے کیسٹر آئل کا متواتر استعمال کرنا شروع کر
دیا تھا۔
بھنڈی بغور ان کے چہروں کو دیکھتی پھر خضریٰ اور ضویا کے سر ہو جاتی۔
"وہ سب تو گوڈے گوڈے لشکارے' چمکارے مار رہی ہیں۔ اور آپ دونوں اس سڑی ہوئی
حبس زدہ شام میں لان کی مٹی گٹا پھانک رہی ہیں۔ نہ آپ کی پھپھو نے نہیں آنا۔"
"بھنڈی یار! تنگ نہ کر۔" ضویا چڑ کر اسے وہاں سے ہٹا دیتی۔ وہ اپنے اسٹیج ڈرامے کی

ہر سل میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرتی تھیں۔
عائشہ چچی باقی سب لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھتیں اور پھر اوما کے چہرے پر نگاہ ٹکا دیتیں۔
"میری بیٹی کسی سے کم تو نہیں۔" ماما نچھاور ہو جاتی۔
"ستارے کی چمک دمک کتنی ہی ہو۔ سورج کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔"
حقیقت سے نظریں چرانا کہاں ممکن تھا۔ وہ اور کچھ نہ کر پاتیں۔ تو نماز' تسبیح کے بعد دعا کے
لیے ہاتھ اٹھا دیتیں۔
"یا اللہ! میری بیٹی کے بھاگ نصیب اچھے لکھ دے۔ سب سے خوبصورت قسمت' اس نے
بہت کچھ کھویا۔ اپنے شوق' خواہشات.... اب اسے مالا مال کر دے۔ وہی دے جو اس کے حق میں
ٹھیک اور بہتر ہو۔"
وہ افطاری کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی' ادھر سے ادھر جاتی اوما کو دیکھے جاتیں۔ تایا ابا کا حکم تھا
کہ سحری و افطاری اکٹھے کی جائے' سب محمود و ایاز ایک ہی صف میں.... محمود و ایاز دستیاب نہ تھے لہٰذا
بھنڈی اور سنگھاڑا خوب قریب قریب ہو کر بیٹھتے ایک ہی صف میں۔ چنانچہ تائی اماں نے مردوں
اور خواتین کی افطاری کے لیے الگ الگ جگہیں متعین فرما دیں۔ جس کا باقیوں کا تو خدا جانے مگر
فرح کو خاصا قلق ہوا۔
پہلے دو روزوں کی افطاری میں اچھا خاصا شاہ زین کے مقابل بیٹھتی رہی تھی۔ آنکھوں کی پیاس
بجھائے نہ بجھتی تھی۔
"یا اللہ! کس قدر خوبصورت ہے شاہ زین!"

○ ○ ○

پھپھو کی آمد کے بعد تو گویا تائی' چچیاں اپنی اپنی ذمہ داری سے ہی بری الذمہ ہو گئیں۔ باتیں'
عبادت' پھر باتیں اور پھر عبادت.... بس یہ دو ہی کام تھے۔
عید کے لیے کپڑوں کی خریداری بھابیوں کے سپرد تھی۔ اور بھابیوں کے بغیر لڑکیاں بازار
جانے کا سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔ رابعہ اور بخت بھابی ہر روز ایک پارٹی کو ساتھ لے کر نکل جاتیں۔
نادران بھائی کی بیگم نائمہ کی گود میں دو ماہ کا صائم تھا لہٰذا وہ گھر میں بچوں کی نگرانی کرتیں۔
ان ہی دنوں انجو امی نے ایک شام افطاری کی دعوت دے ڈالی۔
لڑکیوں کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔
بڑے عرصے بعد کوئی اچھی دعوت آئی تھی۔ بیرونی دعوتیں تو بس تائی' چچی ہی بھگتا آتی تھیں کہ

لڑکیوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ لے دے کر یہ دو ہی گھرانے تھے جو ایسی خوشی کی جھلک دکھلائے تھے۔ ایک انجو مامی۔ جن کی دعوت کبھی کبھار لیکن نہایت اعلیٰ پائے کی ہوتی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی تھیں اس زمانے میں' اور اکڑی ہوئی گردن کی وجہ سے کسی بھی تعلیمی ادارے میں دور سے پہچانے جاسکتے تھے۔ پرائیویٹ کالجز اور اسکولز کا ان دنوں ایسا رواج نہ تھا۔ میٹرک کے بعد ہر ادارے کے طالب علم گورنمنٹ کالج میں ہی پائے جاتے تھے۔ اور یہاں کانونٹ زدہ طبقے کا طوطی بڑھ چڑھ کر بولتا تھا۔ اور انجو مامی کا طوطی ابھی تک بولتا تھا۔

الف تا ے انگریزی۔

اور اس انگریزی کے متاثرین میں تائی چچیوں کے ساتھ ساتھ بھنڈی بھی شامل تھی۔

''جب دیکھو۔ گوڈے گوڈے انگریجی۔''

چھوٹی چچی تو انہیں دیکھتے ہی کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو جاتیں۔

''اب کون بیٹھ کر اس کے ساتھ دماغ کھپائے۔ حال بھی پوچھو تو جواب آئے گا۔ ''اللہ کا شکر'' منہ بھی نہیں تھکتا ان کا۔''

انجو مامی کے تین ہی بچے تھے۔ شنزا' ارسلان اور فاطمہ۔

ارسلان جیالوجی میں ایم فل کر رہا تھا۔ صرف اور صرف انجو مامی کے کہنے پر۔ ورنہ یار دوست تو کب کے ملازمت سے وابستہ ہو چکے تھے۔ وہ برملا کہا کرتا تھا۔

''میری ماں پاگل ہے۔''

''پی۔ ایچ۔ ڈی سے پہلے تمہیں چھوڑوں گی نائیں میں۔''

''فاطمہ کی اردو حد درجہ کمزور تھی۔ اسے آج تک یہ ہی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ناک' اخبار اور میز ہوتا ہے یا ہوتی ہے۔ ارسلان نے اسے چیلنج کیا ہوا تھا۔

''قسم سے فاطمہ! ایک بار اردو میں پاس ہو کر دکھا دے۔ پورا ایک ہزار تیرا۔''

اور فاطی جی جان سے یہ چیلنج قبول کرنے پر تیار۔ تینوں بہن بھائی نہایت سادہ' مخلص' بے ریا تھے۔ ان کے گھر جانے میں لطف ہی کچھ اور تھا۔

دوسری دعوتیں عائشہ چچی کے گھر ہوا کرتی تھیں۔ وہ پکانے اور کھلانے کی بے حد شوقین تھیں۔ اکثر و بیشتر ہی کھانے پینے کا اہتمام کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی حلوہ پوری پہ دعوت ہو جاتی۔ کبھی پاپڑی چاٹ اور دہی بھلوں کی محفل ہوتی اور کبھی کبھار بس آلو بھرے سموسے اور چائے ہی ان کے لطف کا سامان بنتی تھی۔

ایسے موقعوں پر خوب ہی ہنسی مذاق اور لطیفے بنتے۔ آج بھی خوشی کا وہی عالم تھا انجو مامی کی

طرف دعوت۔ کسی پکنک سے کم نہ تھی۔ دعوت پہ جانے کو سب ہی تیار تھے۔ روزہ دار بھی اور روزہ خور بھی۔

لڑکیاں الماریاں کھولے بند سوٹوں کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ کوئی آئی بروز بنانے بیٹھ گئی' کسی نے منہ پر ماسک مل لیا۔ کوئی میچنگ جوتی کی تلاش میں نکل گئی۔ کسی نے ہم رنگ ٹاپس کے لیے منت ساجت شروع کر دی۔

سہ پہر کو بلال بھائی گاڑی میں تائی چچیوں کو لے کر انجو مامی کی طرف روانہ ہوئے تو عظمیٰ ناباب عرف اوما ابھی تک لینز ہاتھ میں لیے پھر رہی تھی۔

''دائیں طرف کے سب لوگ پیچھے پیچھے ہٹ جائیں۔'' انگلی کے پوروں پر لینز لیے وہ دہائی دے رہی تھی۔ تیسرے کمرے میں کہیں جارم دکھائی دی۔

''اوہ خدایا۔ شکر ہے۔ پوری دنیا دکھائی دینے لگی۔'' اس نے بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں۔ احتیاطاً عینک بھی پرس میں رکھ لی تھی۔

گاڑی میں ٹھنس کر بیٹھتے ہوئے بھی وہ ساتھ بیٹھی افشین کو مسلسل کہنیاں مارتی رہی۔

''اپنے بال سمیٹو... میرے لینز۔''

''آہستہ ہنسو۔ میرے لینز۔''

''ارے کھڑکی تو بند کر دو یار! تیز ہوا میں لینز اڑا اڑا گیا تو اماں سے بس جوتے ہی پڑیں گے۔''

''اف خدایا۔ کہاں سے آ گیا۔ بے ہودہ لینز۔ اوہ! نکال اپنی عینک۔ تم تو پہلے ہی پہچانی نہیں جا رہیں۔ وہاں دعوت پر تو لوگ تمہارے چہرے پہ آنکھیں ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔'' طلال چڑ گیا تھا۔

وہ جواب دیے بغیر نخرہ دکھاتی۔ اٹھلاتی آگے بڑھ گئی۔

سب کی سب ٹھیک ٹھاک ہو کر آئیں۔

لان کے دیدہ زیب رنگوں والے آنچل۔ لمبی قمیص۔ کلیوں والے کرتے۔ فراک' ہم رنگ چٹیلیں۔ خوشبوؤں میں بسے کنوارے نوخیز وجود۔

انجو مامی کا لان اس شام تتلیوں سے بھر گیا تھا۔

''کتنی خوش ہیں بچیاں۔ کبھی کبھار ان کے باہر نکلنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔''

مدیحہ پھپھو کی نظریں ان کے شاداب کھلتے چہروں سے ہٹتی نہ تھیں۔

''اللہ ان ہی میں سے کسی کو میرے بیٹے کا نصیب بنا دے۔'' انہوں نے دل سے خواہش کی

تھی۔

''آج کسی کو جانے کی اجازت نہیں ملے گی رات بھر۔'' شزا خوش تھی اور خوب شور مچاتی ان سب کو اپنے کمرے تک لے جا رہی تھی۔ جہاں اس نے عید کے کپڑوں کے لیے نت نئے ڈیزائن اپنے کمرے کی دیواروں اور دروازے پر چسپاں کر رکھے تھے اور اب کئی گھنٹوں تک وہی ڈسکس ہونا تھے۔

اوما حسب عادت باورچی خانے میں آ گئی تھی۔

انجو مامی سیاہ ساڑھی میں تمام انتظامات کے آخری مراحل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''مامی کوئی کام؟'' اس نے حسب عادت ڈھکن اٹھا اٹھا کر ساری چیزوں کا جائزہ لیا۔

خانساماں کی مدد سے ساری ڈشز انجو مامی نے خود تیار کی تھیں۔ صرف کوفتوں کا پتیلا صبح عظمیٰ نے مرسلین کے ہاتھ بھجوایا تھا کہ ماموں ریاض کو کوفتے بس اسی کے ہاتھوں کے پسند تھے۔

''عظمیٰ ڈیر! تم سب چیزوں کو ایک بار چکھ ضرور لینا۔''

وہ سر ہلاتی سلاد کی طرف متوجہ ہو گئی۔

روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی وقت تھا۔ وہ تین طرح کے سلاد اور افطاری کے لیے کھجوروں میں بالائی بھر کر فارغ ہوئی تو بیرے سرسبز لان میں ٹیبل لگا رہے تھے۔

''اوما۔ اوپر۔ اوپر۔ ہم سب یہیں ہیں۔ آ جاؤ۔'' وہ لاؤنج میں داخل ہی ہوئی تھی جب کہ طرح طرح کی آوازیں گونج رہیں۔

افشین‘ فرح اور فاطمہ کھڑکی میں جھکی ہاتھ ہلا ہلا کر لگ جاتی تو اسے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی اور ایسی محفلوں میں بھلا اوما کے چٹکلوں کے بغیر مزا کہاں۔

''آ رہی ہے اوما بھی....'' لڑکیاں سرعت سے کھڑکی پر جھکیں۔ اور اس کے بعد پلک کی گنہگار آنکھوں نے جو منظر دیکھا۔

اس میں عظمیٰ نایاب عرف اوما کا دبلا پتلا‘ نازک اور خوش قسمتی سے سجا سنورا‘ خوشبوؤں سے لبریز وجود شاہ زین کے مضبوط‘ وزنی‘ کسے ہوئے بازوؤں میں سمایا ہوا تھا۔

''ہائے۔''

''نہیں۔''

ابھی چند ثانیے پیشتر تو اوما سب سے بلند سیڑھی پر تھی اور زین شاہ محض جینز اور بنیان میں ملبوس۔ دو قدم نچلی سیڑھی پر.... پھر.... یہ اب۔

اف پلکیں جھپک جھپک کر دوبارہ اس منظر کی تردید چاہی مگر کہاں۔

اسٹار پلس کا ڈرامہ ہوتا تو اوما و شاہ زین کے ساتھ ساتھ بحیثیت ناظرین دس‘ پندرہ منٹ کے اس رومان پرور حادثے سے لطف اندوز ہو لیتے مگر یہاں تو عظمیٰ نایاب عرف اوما تھی۔

کیا ہی بجلی کی رفتار ہو گی جس طرح تڑپ کر اس کے حصار سے آزاد ہوئی تھی اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ گھن گرج تو ہوتی ہی ہے۔ سو وہ گرجی بھی اور برسی بھی شاہ زین معصوم تو ارے‘ ارے ہی کرتا رہ گیا۔

آج سے پہلے تو کسی نے اس قدر وضاحت سے اسے مشرقی و مغربی روایات کے درمیان فرق نہیں سمجھایا تھا۔ نہ ہی اخلاقیات‘ اقدار‘ روایات‘ شرم و حیا پر لیکچر....

''ہائیں! یعنی کہ....'' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ان سب چیزوں کا یہاں کیا تذکرہ۔

وہ تو صبح سے یہیں قیام پذیر تھا اور اب نہانے کے بعد شزا سے اپنی شرٹ لینے آیا تھا۔ جواب سے چار گھنٹے قبل استری کرنے کی غرض سے دی گئی تھی۔

اب اس سے دو قدم اوپر جاتی عزیز‘ اوما اگر پاؤں رپٹ جانے کے سبب سیدھی اس کی بانہوں میں آ سمائی تھی تو اس میں اقدار و روایات اور مشرق کہاں سے آ گئے؟ اور اگر اوما ڈیئر کو سیڑھیوں پر فٹ بال کی طرح اچھلنے‘ لڑھکنے سے بچانے کے لیے انہوں نے نادانستہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی‘ جو حواس بحال ہوتے ہی کمزور بھی پڑ گئی پھر اس میں اخلاقیات اور شرم و حیا؟

وہ اس کے سر پہ چڑھے ہیڑ دھپڑ کچھ بولے جا رہی تھی۔

پھر جب خفت مٹائے نہ مٹی تو وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ کر چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔

شزا نے بھاگ کر شرٹ اسے تھمائی اور کمرے کی طرف دھکیلا۔

تب وہ سمجھا۔ محترمہ اس بات پر خفا ہو رہی تھیں کہ صرف بنیان پہن کر باہر آنے کی جسارت کیوں کی؟ شاہ زین نے شرٹ جھٹک کر گویا اپنا غصہ اتارا اور دندناتا ہوا ارسلان کے کمرے میں جا گھسا۔

انجو مامی کو کسی نے خبر کی تھی۔ وہ ساڑھی سنبھالتی اوپر لپکیں۔

''او مائی گاڈ‘ اوما! یہ کیا بیٹا۔ بری بات۔''

وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے پچکارتی‘ سہلاتی‘ واش روم تک لے آئیں۔

روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی منٹ تھے۔ اس نے خود کو سنبھالا دے کر انجو مامی کو واپس بھیجا اور خود واش بیسن پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔ رونے کے سب اثرات ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش

کی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے زور زور سے پلکیں جھپکیں۔ پھر معلوم ہوا رونے کے دوران جو آنکھیں رگڑیں تو لینز دغا دے گیا تھا۔ اس نے خفگی سے دوسرا لینز اتار کر واش بیسن میں دے مارا۔ اور عینک لگا کر نیچے اتر آئی جہاں سائرن ہونے کے ساتھ ہی سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ وہ بھی لپک کر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ کھانے کے بعد محفل نعت لان میں ہوئی۔

کھلے لان میں جب ہوا سرسرا رہی تھی اور سفید بادل ٹکریوں کی شکل میں چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ خوشبودار فضا میں مرسلین کی پرسوز آواز میں انہوں نے کتنی نعتیں اور دعائیں سن ڈالیں۔ مرسلین کے کتابی چہرے پر سنجیدگی اس کی عمر سے کچھ زیادہ چھلکتی تھی اور اس کی آنکھیں بہت گہری اور خوبصورت تھیں اور ان آنکھوں میں ایسا مقناطیس جڑا تھا کہ مقابل کو دیکھتا اور وہ ایک پل میں اپنا سب کچھ ہار جاتا تھا۔

مدینے میں صبا جانا تو اتنا کام کر دینا

رسول اللہ ﷺ کو میری غریبی کی خبر دینا

تایا ابا دونوں ہاتھوں میں چہرہ دیے ہولے ہولے سسک رہے تھے۔

"انسان بہت کم مایہ ہے۔ گناہوں کی پوٹ.... لیکن کتنے فخر سے دندناتا پھرتا ہے۔"

کسی نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔

ایسی پرنور محفل تھی کہ اکثریت کے دل خدا کی کبریائی کے سامنے جھکے ہوئے عاجزی سے فریاد کر رہے تھے۔

یہ کہہ دینا ہزاروں عیب رکھتا ہوں ہنر دینا

مرسلین کی آواز جیسے سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اور اسی پرنور بندھن میں بندھی ضویا نے گویا پہلی بار مرسلین کو دیکھا تھا۔

وہ حیران تھی۔ اور پریشان بھی۔

یہ وہی مرسلین ہے جسے اس نے ہمیشہ اپنے آس پاس بولتے، کھیلتے، ہنستے، دیکھا تھا۔ رنگین دھاگوں سے کڑھا سفید دوپٹہ سر پہ اوڑھے.... دونوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے وہ گم صم بیٹھی تھی۔ جب قریب بیٹھی خضریٰ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں کیا؟"

محفل ختم ہو چکی تھی۔ سب لوگ اٹھ چکے تھے۔ ضویا چونکی پھر نہ صرف وہ اٹھی بلکہ خضریٰ کا ہاتھ تھام کر دوڑتی ہوئی سب سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

"خضریٰ! میرا دل دیکھو۔" اس نے خضریٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پہ رکھا۔

"کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ یوں جیسے ابھی باہر آ جائے گا۔"

"مجھے تو کچھ نہیں محسوس ہو رہا؟" خضریٰ نے ناک چڑھائی۔

"بدتمیز! اچھا سنو۔ عائشہ چچی نے کہیں مرسلین کا رشتہ وشتہ تو نہیں دیکھ رکھا۔"

ہائے! کم عمری بڑی بے صبری۔ وہ اتھل پتھل سانسوں میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" خضریٰ ہونق سی ہو گئی۔

"دیکھو۔ میں تمہاری دوست ہوں ناں پلیز.... مجھے اپنی بھابی بنا لینا۔"

"آہ.... ہاہ...." خضریٰ کا منہ آپوں آپ کھل گیا تھا۔ "کیا کہا تم نے...." اپنی سانس بحال کرنے میں خضریٰ کو خاصا وقت لگا۔

ضویا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

خضریٰ نے اسے جھنجھوڑا تو معلوم ہوا' آنسو زار و قطار بہہ رہے ہیں۔

"ارے!" خضریٰ کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی تو پھر تو' وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

○ ○ ○

"توبہ.... توبہ ہماری لڑکیوں کو تو ایسے کام نہ آئے۔" چھوٹی چچی خواہ مخواہ ہی کلس رہی تھیں۔

"کن کاموں کی بات کر رہی ہیں۔ ماشاء اللہ ہر ہنر ہر کام سے واقف ہیں ہماری بچیاں۔" بڑی چچی نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"افوہ! آپ کو تو لگتا ہے کچھ خبر ہی نہیں۔" وہ کھسک کر بڑی چچی کے قریب ہوئیں اور کل کی شادی میں اوما اور شاہ زین کے "حادثے" کو مرچ مسالہ لگا کر بتایا۔

"آئے ہائے۔ یہ کب کی بات ہے' ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"لیجیے۔ اب یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی جو ٹی وی ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں۔ اوما پاؤں پھسل کر گرنے لگی تھی۔ شاہ بھیا نے بچا لیا گرنے سے بات ختم۔ آپ لوگ تو خواہ مخواہ ہی بات کو افسانہ' ڈرامہ بنا رہی ہیں۔

لیکن خیر آپ کا بھی کیا قصور؟ اسٹار پلس سے ہمیں یہ ہی کچھ تو سیکھنے کو ملا ہے۔" یہ ضویا تھی آنکھیں بند کر کے اوندھی لیٹی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔

"جانے دو لڑکی! یہ سب "طریقے" ہوتے ہیں لڑکوں کو پھانسنے کے۔ تمہیں بھلا کیا خبر۔ رات شادی سے آ کر بستروں پر پڑیں اور دھت ہو رہیں۔ اور وہ اوما تُن بھر بھر لائی تھی انجو کی طرف

سے۔ یہ بڑی سی ٹرے سجائی اور سیدھی جا گھسی شیراز کے کمرے میں پھر رات گئے تک ٹرٹر کی آوازیں۔ جانے کون کون سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔'' بڑی چچی نے قدرے نیچی آواز میں دل کی بھڑاس نکالی تو ضویا قدرے چڑ سی گئی۔

''کمال ہے۔ اس گھر میں اول تو ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ پھر اگر کوئی دوسروں کا خیال کرے تو وہ آپ کو لوفر آوارہ لگنے لگتا ہے۔ اوما کے سوا کسی اور کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ شیراز بھائی نے عین وقت پر آنے کا کہا مگر عادت سے مجبور ہو کر آئے نہیں اور گھر میں تھا کون؟ جوان کے لیے افطاری بناتا۔ تائی اماں مارے مروت کے چپ رہیں۔ اوما نے خود انجو ماسی سے کہہ کر شیراز بھائی کے لیے کھانا نکلوایا اور پھر رات گئے وہ ٹرٹر کرنے کے لیے اکیلی وہاں نہیں تھی۔ خود بلال بھیا' ارسلان' شاہ زین اور رابعہ بھابی بھی وہیں موجود تھیں۔''

''نہ تمہیں کیوں اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ آ گئی اٹھ کے کہیں سے وکیل صفائی۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ یہ دوسروں سے ہمدردی کرتی رہ جائیں گی اور وہ اپنے داؤ پیچ لڑا کر لے اڑیں گی لڑکے کو۔''

''گھر بھرا ہوا ہے لڑکوں سے.... اتنے داؤ پیچ آتے تو پہلے ہی لڑا لیتیں۔ خوامخواہ عائشہ چچی کے سینے پہ مونگ دل رہی ہیں اب تک۔ اور لے بھی اڑیں تو ہمیں کیا غم۔ بڑے بڑے لوگ پھرتے ہیں آس پاس۔ بس نظر آنے کی بات ہے۔''

''چل ہٹ کم بخت! کیا بڑھ بڑھ کر بولے جا رہی ہے۔'' پیٹھ پہ زور کی دھپ پڑی تو وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ آپ تو بس یونہی۔'' وہ ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

بڑی چچی نے کچھ پرخیال نگاہوں سے دروازے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھا۔

''یہ کیا کہہ گئی بھابی! کون پھرتا ہے آس پاس؟ کس کی بات کر گئی ہے؟''

''سنگھاڑے کی بات کر رہی ہو گی۔ ایک وہی عاشق ہے اس پر۔ دس گیندوں کو آگ میں جھونکا۔ اگلے دن کم بخت مارا نئی گیند بغل میں دبا کر لے آتا ہے۔ کہتا ہے مجھے ضویا بی بی کا شوق بڑا اچھا لگتا ہے۔ میرے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام ضویا ہی رکھوں گا۔ لو بتاؤ بھلا۔ منگنی نہ شادی۔ بچوں کی باتیں کر لو۔'' چھوٹی چچی جلی بھی بیٹھی تھی۔

''آپ بہتر سمجھتی ہیں لیکن مجھے تو ضویا کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے آج۔''

''ہاں۔ کل ہی بال سیٹ کروا کے آئی ہے۔ اپنی عمر سے کئی حصے چھوٹی لگ رہی ہے۔''



عصر کے بعد کا وقت تھا۔

مدیحہ نماز پڑھ کر تسبیح کے دانے گھماتی راہداریوں میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ جس کمرے کا دروازہ کھولتیں۔ یا اے سی کی زوں زوں۔ یا انسانی خراٹے۔

''توبہ.... پاکستانی قوم۔ کس قدر سوتی ہے۔''

''چلتے چلتے باورچی خانے تک پہنچیں۔ انواع واقسام خوشبوئیں۔ دیگچوں' پتیلیوں کی کھٹر پٹر۔

''توبہ.... پاکستانی قوم.... کس قدر کھاتی ہے۔''

خیال تھا' ملازم افطاری کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ سر ڈال کر اندر جھانکا بڑے بڑے پتیلے' کڑاہی' چمچے' کفگیر۔ اور ان سب کے درمیان۔ اوما' بھنڈی۔ عائشہ چچی اور رابعہ بھابی۔

کچن خاصا کشادہ تھا۔ انہیں بھی کھڑے ہونے بلکہ بیٹھنے کو جگہ مل ہی گئی۔ بیٹھ کر غور فرمایا۔ دہی بڑے۔ فروٹ چاٹ' چکن رول' اور کھانے کے لیے بریانی' کسٹرڈ' چکن قورمہ' سبزیوں کی بھجیا۔

عائشہ چچی کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس میز پہ آ بیٹھیں اور کھجوروں میں بالائی بھرنے لگیں۔

''باقی سب گھر والے کیوں گھوڑے' گدھے بیچ کر سو رہے ہیں۔ اتنے لوگوں کی افطاری' کھانا۔ چلو بھنڈی! باقی لڑکیوں کو آواز دو جا کر۔''

''رمضان کے مہینے میں ہی کچھ کام بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ باقی دنوں میں تو سب اپنا اپنا ہی کھاتے پکاتے ہیں۔'' عائشہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔

''لیجئے پھپھو! ذرا جلدی سے چیک کریں۔ فروٹ چاٹ میں ذرا سی مٹھاس کم یا زیادہ ہو تو فاران بھائی کا موڈ فوراً ہی خراب ہو جاتا ہے۔''

''وہ نفاست سے بال باندھے ایپرن لگائے مگن تھی۔ خود روزے سے تھی جبکہ مدیحہ ناسازیٔ طبع کے سبب آج روزہ نہ رکھ سکی تھیں۔

''کس کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے یہ۔''

''عظمیٰ نایاب المعروف اوما دی گریٹ۔'' اس نے چمچہ لہرایا اور کڑاہی کے نیچے آگ جلائی۔

''واہ بھئی.... یہ ہے سگھڑاپا۔ روزے کے ساتھ بھی کمال کی چاٹ بنائی ہے۔ میں تو کہتی ہوں عائشہ! اوما کے ہاتھ میں ذائقہ تم سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ شاہ زین بھی کہہ رہا تھا۔'' وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھیں۔

''اف....'' بہت تیزی سے دہی بڑوں کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے چھری سے ہلکا سا کٹ انگوٹھے کی پور پہ لگ گیا تھا۔

معمول کی بات ہے۔'' اس نے خود کو باور کرایا۔

"کہ عائشہ چچی کے گھر جو مچھلی کھائی' اس کا ذائقہ ابھی تک نہیں بھولتا۔"

رول ہلکے براؤن ہو چکے تھے۔ اوما نے پلیٹ میں نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ رابعہ بھابی کا منا اٹھ گیا تو وہ قورمے کا دیگچہ بھی اس کے حوالے کر گئیں۔ بھنڈی تو شاید وہاں باندھ کر بٹھائی گئی تھی۔

"اماں! یہ کاٹیں ذرا جلدی سے۔" اس نے درجن بھر لیموں اٹھا کر ماں کے سامنے رکھے۔ قورمے کے دیگچے میں چمچہ ہلایا اور پھر رول کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کس قدر پھرتیلی ہے یہ لڑکی۔" پھپھو نے نہایت توجہ سے اس کا نازک سراپا دیکھا۔

"تمہارے انکل ایسی چٹ پٹی چیزوں کے بے حد شوقین ہیں اور شاہ زین تو۔"

املی کی چٹنی کا جار اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔

"اوہو۔" اس نے بروقت سنبھالا۔

"بہت ہی پیٹو ہے۔ دونوں باپ بیٹا اکثر ہی مختلف ڈشز ٹرائی کرتے رہتے ہیں۔ اوما بچے! رول بھی بہت مزے کے ہیں۔"

"کیا مزے کے ہیں؟" زندگی سے بھرپور آواز باورچی خانے کے دروازے پہ گونجی اور اوما کے ہاتھ میں پکڑا رول چھپاک سے گرم گرم گھی میں جا گرا۔

"آہ...." ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ چولہے سے دور ہٹی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بس...." اس نے ہاتھ جھٹک کر تکلیف دور کرنے کی کوشش کی۔

وہ تینوں پل بھر میں اس تک پہنچے تھے۔

پھپھو نے اس کے ہاتھ سے چمچہ لے لیا۔ شاہ زین فریج میں سے کوئی کریم نکال لایا۔ امی نے فوراً کرسی کھینچ کر اس کی طرف بڑھائی۔

"شاہ زین بیٹے! ٹھیک سے لگانا۔ کوئی زخم رہ نہ جائے۔ ورنہ داغ پڑ جائے گا۔" پھپھو نے ہدایت کی اور۔ وہ موصوف کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کلائی جکڑ لی گئی تھی۔ اوما "مم" مم ہی کرتی رہ گئی۔

شاہ زین بڑی سہولت سے ہاتھ پہ پڑے سرخ سرخ نشانوں پر لیپ کرنے لگا۔

"اچھا خاصا تو جل گیا۔ لوگ کہتے ہیں ان کی ذہانت چولہے چوکی سے بڑھ کر ہے' یہاں آ کر دیکھ لے۔ ایک افطاری بنانے میں ہی یہ حال ہو گیا۔"

زبان' ننھیال والوں پہ گئی تھی۔

"پتا نہیں کون لوگ کہتے تھے۔" اوما نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچا مگر گرفت پہلے سے مضبوط ہو گئی۔

وہ تو ایک پل میں ساری کی ساری ٹھنڈی پڑ گئی۔

پھپھو کا سر کڑاہی میں تھا تو امی قورمے کے دیگچے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بات اوما کے ہونٹوں پر آتے آتے دم توڑ گئی تھی۔

بڑی پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا۔

بھوری آنکھیں ایک ٹک اسے گھور رہی تھیں۔ ان بھوری آنکھوں میں کیا تھا؟ وہ ان آنکھوں میں اتر کر دل کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھید کا سرا پاتی۔ ان آنکھوں کا تاثر یک لخت ہی بدل گیا تھا۔ اور اسی تیزی سے اوما کو لوٹنا پڑا تھا۔ ایک بار پھر ہاتھ کھینچا مگر پانچ انگلیوں کے سرخ نشان کلائی میں گڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پہ بڑی دل آویز مسکراہٹ۔

اوما کے ہونٹوں کو بھی یک لخت ویسی ہی مسکراہٹ نے چھوا اور اگلے ہی پل وہ دوسرے ہاتھ کے ناخن اس کے ہاتھ کی پشت پر گاڑ چکی تھی۔

"اوہ۔" کلائی ایک پل میں آزاد ہو گئی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں اسے دیکھتی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور یک لخت ہی ٹھہر گئی۔

باورچی خانے کے دروازے پر فرح کھڑی تھی۔ حیران' پریشان' بے یقین۔

○ ○ ○

رات بھر بادل کھل کر برسے تھے۔

آنگن میں بچھے پلنگ چھوڑ کر وہ لوگ کمروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ موسم اچھا خاصا خشک ہو گیا۔ بجلی نے وفا کی تھی' پنکھا بھی ہلکی رفتار سے چلتا رہا۔

امی اور خضریٰ کب کی سو چکیں۔

مرسلین کا کمرہ البتہ روشن تھا۔

"یا تو پڑھنے میں مگن ہو گیا ہو گا یا یونہی بتی بجھائے بغیر تکیے میں سر دیے کر سو گیا ہو گا۔" اوما نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے تھکے ذہن سے سوچا۔

نیند آج کی رات اس کی آنکھوں میں اتری ہی کہاں تھی۔ جب تک بارش کی پہلی بوند زمین پر نہیں گری۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتی رہی تھی۔ کبھی اس کمرے۔ تو کبھی اس کمرے۔ کبھی تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پہ ٹک گئی۔ کبھی کھڑکی میں جھک کر اندھیرے میں

ذوبے درختوں‘ پودوں کو کھوجنے لگی۔

امی نے اس کی بے آرامی محسوس کرتے ہوئے ٹوک بھی دیا۔

”سو کیوں نہیں رہیں۔ ابھی کچھ دیر میں سحری بنانے کا وقت ہو جائے گا۔ لیٹ جاؤ گھڑی بھر کے لیے۔“

اور وہ لیٹ بھی گئی۔ آنکھیں بھی موند لیں۔ اور ان بند آنکھوں کے پیچھے جو تھا وہی تو ٹکنے نہ دیتا تھا۔

وہ بے اختیار کلائی مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

پانچ مضبوط بھاری انگلیوں کے نشان ابھی بھی ثبت تھے۔ دکھائی نہ دیتے تھے۔ محسوس ہوتے تھے۔ وہ ان پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ انہیں چھو کر دیکھتی تھی۔ ان پوروں کی حرارت ابھی تک اس کی نبضوں میں اترتی اور اس کے پورے وجود کو دل بن کر دھڑکاتی تھی۔

اور یہ ہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ قصد اور عہد کچھ اور تھا۔

حالانکہ ابھی تو کچھ بھی سامنے نہ تھا۔

نہ امید‘ نہ گمان‘ نہ اظہار۔

مگر اس کا وجدان سگنل دے رہا تھا۔ کوئی بتی بار بار جلتی تھی‘ بجھتی تھی اور بجھ کر پھر جل اٹھتی تھی۔

اور اسی جلنے‘ بجھنے میں ایک چہرہ ابھرتا تو دوسرا ڈوب جاتا تھا۔

دوسرا ابھرتا تو پہلا دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور وہ خود فیصلے کی نوک پہ کھڑی ہلکان ہو رہی تھی۔

دریچے سے آتی‘ بارش کی خنک ہوا نے اسے ٹھٹھرا کر رکھ دیا تو وہ اپنے پاؤں گھسیٹتی۔ بستر پہ آ گری۔ سر تا پا چادر اوڑھتے ہوئے اس نے تکیہ درست کیا اور ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

’ہو سکتا ہے سب میرا وہم ہو۔ ویسا کچھ بھی نہ ہو‘ جیسا میں نے سمجھا۔‘

’ہو سکتا ہے۔ ایسی کسی بھی گھڑی میں قدرت خود میری رہنما ہو۔‘

’ہو سکتا ہے ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئے۔ سب فیصلے اوپر ہی اوپر طے ہو جائیں۔‘

کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھنے لگا۔ تب کہیں جا کر نیند کا ہلکا سا خمار اس کے دماغ پر چھایا۔ اسی خمار میں اس نے امی اور خضریٰ کو باتیں کرتے‘ اٹھتے‘ دروازہ کھلتے‘ بند ہوتے محسوس کیا۔ اسی خمار میں کسی نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی‘ اسی دھند کی اوٹ میں اس نے مؤذن کو اذان دیتے سنا اور پھر دھند نے دبیز ہو کر اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

○ ○ ○

کمرے کی کھڑکی غالباً رات کھلی رہ گئی تھی۔

باغ میں بھیگے درختوں کی گھنی شاخوں میں چھپے طوطوں‘ چڑیوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا۔

قریب ہی کہیں بچوں کی چہکاریں بھی۔

اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا گیا تھا لیکن روشن دانوں اور کھڑکی سے آنے والی روشنی سے کمرا ابھر گیا تھا۔ باہر آنگن میں پانی کے بہاؤ اور جھاڑو کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں۔ غالباً سنگھاڑا صفائی کے لیے آ چکا تھا۔

”ہائیں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔

پاؤں میں چپل اڑس کر عجلت میں دروازہ کھولا۔

چٹا سفید دن۔ خوب کھلا کھلا سا۔ مخلوق ساری کی ساری مگن۔

مرلین بوگن ویلیا کی ڈھلکی ہوئی ڈالیاں درست کر رہا تھا۔ خضریٰ اور امی کہیں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

اس نے لمبا سانس لے کر دل ہی دل میں روزے کی نیت کی اور پچھلے برآمدے میں جھانکا۔

خضریٰ کبوتروں کی کابک کھولے انہیں دانہ ڈالنے میں محو تھی۔ بچے اس کے گرد جمع تھے‘ گردن گھما کر دوسری جانب دیکھا اور پھر گھڑی بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر مدیحہ پھپھو‘ امی کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھی تھیں۔ سگنل دیتی بتی پوری قوت سے روشن ہو گئی تھی۔

وہ بھاگ کر باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ یہاں پہ کھڑکی عین ان کے عقب میں کھلتی تھی۔

بہت آہستگی سے دونوں پٹ وا کر کے جھانکا۔

”ابھی صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتی ہوں۔ باقاعدہ پیغام جیسے آپ چاہیں۔ بڑے بھیا تو ہیں ہی۔ وحید سے بھی بات کرنا ہوئی تو کر لیں گے۔ لیکن جب تک آپ فیصلہ مجھے نہ سنا دیں۔ بات باہر مت نکالیے گا۔ سمجھ رہی ہیں ناں؟“

وہ غالباً دوسرے دروازے کھلے رکھنا چاہتی تھیں۔ امی کے گھٹنے پر دباؤ ڈال کر جلدی فیصلے کی تاکید کرتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور عائشہ یوں ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں‘ جیسے سر پر پرندے آ بیٹھے ہوں اور ذرا سی جنبش سے ان کی اڑان کا ڈر ہو۔

”امی!“ اس کے ذرا سا ہلانے پر وہ بری طرح چونکیں۔

"اوما! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وہ ناقابل یقین لہجے میں بول رہی تھیں۔

"امی پلیز! ابھی کوئی فیصلہ مت کیجئے گا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اپنا اضطراب کم کرنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب...." اسے دقت ہو رہی تھی۔ وہ اپنا مافی الضمیر ماں تک کس طرح پہنچائے۔

"امی! کیا اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا تھوڑا سا اختیار حاصل ہے مجھے؟"

وہ بنا کچھ بولے چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔ وہ کچھ الٹا سیدھا بولتی جا رہی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا انہیں۔

"امی! میں شاہ زین سے نہیں، شیراز حسن سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"



کہاں تو بوا جوتیاں گھسا گھسا کر تھک گئیں اور کسی کلرک تک کا رشتہ نہ ملا اور کہاں ایک خوبصورت ذہین وفطین، معاشی طور پر مستحکم ومضبوط لڑکے کا رشتہ گھر چل کر آ گیا اور لڑکا بھی اپنے ہی خاندان کا.... چھان پھٹک کی ضرورت، نہ کوئی ڈر خدشہ نہ وہم، اور اب مہارانی کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ ایک سے ایک لڑکی چھوڑ کر مدیحہ میری دہلیز تک آئی۔ خدا نے میری دعاؤں کو قبولیت بخشی اور اب اسے یاد آیا کہ شاہ زین نہیں شیراز پہلے کیا گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔"

"کیا اپنے منہ سے کہتی؟" وہ منمنائی۔

"تو اب کیا کسی اور منہ سے کہلوایا ہے۔ اب بھی تو خود ہی پھوٹیں۔"

"پہلے کون سا یہاں شادی بیاہ کے چکر چل رہے تھے۔ میرا خیال تھا شاید تائی اماں...."

"نہ۔ ان میں سے کسی نے کچھ کہا۔ شیراز نے یا بڑی بھابی نے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر....؟ جب انہیں خیال نہیں آیا تو کیا میں جا کر بیٹی پیش کروں؟"

عائشہ خوب ہی تپی بیٹھی تھیں۔

"وہ بہت بامروت ہیں۔ ہو سکتا ہے جھجکتی ہوں۔ اور ویسے یہ سب باتیں آپ لوگوں کے سوچنے کی ہیں۔ مجھ پر خوامخواہ خفا ہو رہی ہیں آپ۔" وہ بھی قدرے ناراض سی بیٹھی تھی۔

"شاہ زین باہر سے آیا ہے۔ سب کے سب اس پر نظر لگا کر بیٹھ گئے۔ گھر میں پڑے ہوئے فرشتہ صفت شیراز کسی کو نظر نہیں آتے۔ صرف اس لیے کہ وہ مجبور اور معذور ہیں۔ لیکن انہوں نے

اس مجبوری کو اپنی کمزوری اور معذوری کو اپنی محتاجی تو نہیں بنایا ناں؟ بس کچھ عرصہ کے لیے لوگوں سے کٹ گئے ہیں۔ لیکن یہ دور بھی گزر جائے گا اگر انہیں کوئی مخلص ساتھ مل گیا تو۔ لیکن ہم لوگوں کو ان کی صرف محرومی دکھتی ہے۔ ان کا بھلا سا دل، ان کا روشن دماغ، ان کی قابلیت، صلاحیت کچھ بھی نظر نہیں آتی۔"

عائشہ تو لب بھینچے گویا اسی کی تقریر سننے بیٹھی تھیں۔

"اور ہاں۔ بات آپ کے لبوں سے ادا ہو تو خیال رکھیے گا۔ آپ کا سر جھکا ہوا نہ ہو، میں یہ قدم کسی عشق و محبت یا وقتی اور سستے جذبات کی خاطر نہیں صرف اور صرف شیراز حسن کے لیے اٹھا رہی ہوں کہ مجھے ان کی بہت "پروا" ہے۔ شیراز حسن کی جگہ کوئی اور ہوتا میں تب بھی یہی فیصلہ کرتی۔"

"اس بھول میں تو بنو! تم مت رہو۔ لڑکی کی ماں اپنی زبان سے اپنی بیٹی کا بر پیش کرے تو پھر بس ایک ہی بات سوچی جاتی ہے، اور لوگوں کے ذہنوں پہ پہرے نہ تم لگا سکتی ہو نہ میں۔"

وہ بہت مرجھائے انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے سے اٹھ گئیں۔

○ ○ ○

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو گیا تھا۔ مدیحہ پھپھو اور شاہ زین اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

"کوشش کروں گی ان دنوں میں گھر کے کچھ خاص حصے مکمل طور پر سیٹ کر لوں۔ عید کے روز گرینڈ پارٹی میرے گھر ہو گی۔" اس روز انجو مامی اور ریاض ماموں بھی اپنے بچوں سمیت آئے ہوئے تھے، جب مدیحہ پھپھو نے اپنے گھر شفٹ ہونے کی بات کی۔

پھر اگلے دو دن تک سننے میں آیا کہ انجو مامی اور مدیحہ پھپھو آج کل بازار میں ہر جگہ اکٹھی دکھائی دے رہی ہیں۔

اس روز افطاری کے بعد سب بلال بھائی کی لائی ہوئی آئس کریم پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے جب اچانک ہی شاہ زین چلا آیا۔ بڑا بے نیاز سا بن کر سامنے بیٹھ رہا۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اوما بھی ڈھیٹ بنی آئس کریم کھانے میں جتی رہی لیکن نظر کا کیا تھا۔ کبھی نہ کبھی بھٹک ہی جاتی لیکن جب بھی دیکھا، دل نے اپنی دھڑکن گنوائی۔

"ضمیر مطمئن ہو جائے گا پر دل ہار جاؤ گی عظمیٰ نایاب!" اداسی قطرہ قطرہ اسے بھگونے لگی تو وہ کسی کام کے بہانے محفل سے اٹھ آئی۔

شاہ زین نے پرخیال نظروں سے اس کا تعاقب کیا۔

'محترمہ کے انداز کچھ شکست خوردہ سے لگ رہے ہیں۔ نہ شوخی نہ شرارت۔ نہ کوئی چھیڑ خانی۔'

وہ کچھ الجھا۔

نظروں کا زاویہ بدلا تو افشین کو بالکل اپنے سامنے پایا۔

کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

"اگر آپ اپنی مونچھوں کا اسٹائل تھوڑا بدل لیں تو بالکل نعمان اعجاز لگنے لگیں۔

"ہیں! شاہ زین کی مونچھیں ہیں؟" طلال فوراً اس کی طرف پلٹا۔

"اور.... نعمان اعجاز کی مونچھیں ہیں کیا؟" یہ رابعہ بھابی تھیں۔

"تو کیا نہیں ہیں؟"

"ارے سنو! بھلا نعمان...." بات کہاں سے کہاں جا نکلی تھی۔

شاہ زین کو دیر ہونے کا احساس ہوا تو جھٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ یوں بھی اب محفل میں "جان" نہ رہی تھی تو وہ کیونکر رکتا۔

○ ○ ○

"ہرگز نہیں۔ اس رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شیراز حسن نے سنا اور انکار کر دیا۔

قطعی اور فوری انکار۔

ایسا انکار جس سے پہلے کا ایک لمحہ بھی انہوں نے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ تائی اماں تو بات کر کے ابھی سانس بھی نہ لے پائی تھیں کہ شیراز حسن نے یہ ٹکا سا انکار ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"عائشہ نے بڑے مان سے کہا ہے مجھ سے۔ حالانکہ مدیحہ شاہ زین کے لیے اوما کا کہہ چکی ہے مگر وہ....."

"اماں! مجھے بہت ضروری کام ہے اس وقت۔" ایسا خشک اور کورا لہجہ۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں.... ابھی تو عائشہ ان کے کمرے میں ہی بیٹھی ہوں گی، ابھی تو دل میں بڑا خوش کن سا خیال ابھرا تھا کہ اوما اور شیراز میں دوستی ہو سکتا ہے کسی نئے تعلق کی بنیاد بن جائے.... ہو سکتا ہے کچھ ایسے جذبات ان کے درمیان جڑ پکڑ چکے ہوں جو نئے رشتے استوار کر سکیں..... مگر یہاں..... وہ چہرے پہ پتھر سی سنجیدگی لیے اپنے لیپ ٹاپ پر کھٹا کھٹ کیے جا رہا تھا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلیں۔

اور پھر یہ ہی ٹکا سا انکار اوما تک بھی پہنچ گیا۔

"لو جی..... جان چھوٹی..... ایک منٹ میں انکار..... ادھر بھابی گئیں..... ادھر واپس۔ کوئی

دوسری بات تو اس نے سنی ہی نہیں..... تم نے اپنا فرض نبھایا..... اچھا کیا۔ اب بھلا ہو تمہارا' کچھ خیال دل میں ہے بھی تو اب نکال چکو' شام کو تمہارے تایا ابو سے بات کر کے مدیحہ کو خوشی کی خبر سنا دوں گی۔" امی کی تو جیسے مراد بر آئی تھی۔

"یوں تو شیراز بھی اپنا ہی بچہ ہے.... لیکن پہلی محبت کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں' اسی سے خوف آتا تھا... اب دیکھ لو' اسی کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے' کوئی کرے تو کرے کیا۔"

اوما سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ سر جھکائے عید کے لیے لائے جانے والے سامان کی فہرست بناتی رہی۔

امی کہہ چکنے کے بعد جائے نماز بچھا کر کھڑی ہو گئیں۔

اس نے طیش میں آ کر ساری لسٹ پرزے پرزے کر کے اڑائی' باتھ روم میں جا کر ڈھیر سارا روئی۔

"اپنا دل اجاڑ کر ان کا خیال کر رہی ہوں' اور یہ ہیں کہ...."

رو پیٹ کر بھی سکون نہ آیا تو دھڑ دھڑ دو' دو سیڑھیاں الانگتی پھلانگتی سیدھی شیراز حسین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ٹھکرائے جانے کا غم سہا ہے آپ نے.... پھر بھی ٹھکرا دیا' یوں بھی کوئی کرتا ہے' بہت ظالم ہیں آپ شیراز حسن۔" آنسو تو ساون بھادوں کی بارش ہو گئے' چھاجوں چھاج برس رہے تھے۔

"بہت بڑا نقصان کر لیں گے آپ اپنا' مت انکار کریں' میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"سوچ سمجھ کا اس فیصلے سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا' سراسر نادانی' کم عقلی۔" کتاب میں مگن بڑے آرام سے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ حد درجہ معمول کے مطابق تھا۔

اس نے کتاب جھپٹ کر دور اچھالی اور بدتمیزی سے انہیں گھورے گئی۔

"کافی گرم ہے۔" انہوں نے کسی خدشے کے تحت بتایا۔

"پتا نہیں کس زعم میں ہیں آپ؟ میں روز روز آپ کی منتیں کرنے نہیں کھڑی ہوں گی یہاں..... بیٹھے رہا کریں گے یوں ہی' کرسی پہ پھپھوندی لگ جائے گی' کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوگا' ہر کوئی عظمٰی نایاب نہیں ہوتا کہ گھڑی گھڑی چائے' کھانا لے کر حاضری دیتا رہے' وہ بزرگوار والدہ ہیں، آپ کی جنہیں دنیا کے غموں سے ہی فرصت نہیں..... ہونہہ..... مردہ محبت کا جنازہ کب تک اٹھائے رکھیں گے.... وہ محترمہ چار بچوں کی اماں جان بن گئی ہوں گی اور یہاں ابھی سوگ جاری ہے' اب مسکرائے چلے جا رہے ہیں۔" وہ تھک کر کشن پہ بیٹھ گئی۔

''ہاں بھئی.... کشکول ہاتھوں میں لے کر آ گئی ہوں' میرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔''

''پگلی ہو تم اوما.... بالکل فضول بول رہی ہو۔'' انہوں نے ہولے سے جھڑکا۔

''نہیں.... آپ مجھے اس طرح نہیں کہہ سکتے.... میں نے کوئی پاگل پن نہیں دکھایا۔'' وہ سچ مچ روٹھی ہوئی تھی۔

''میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں' آپ کو ہنستے بستے۔''

''میری خوشی چاہتی ہو تو.... وہ کرو جو میں کہتا ہوں' ابا جان گھر کی بڑی ہونے کی حیثیت سے تمہیں بلا کر رائے لیں گے اور تمہیں ہاں کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔''

''مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں' میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔'' اس کا ارادہ اٹل لگ رہا تھا۔

''تو پھر یاد رکھو' میری طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ہو گی۔''

''مجھے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے دوسروں کے حوصلوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' وہ تن کر اٹھ کھڑی ہوئی' اس سے پہلے کہ کمرا چھوڑ جاتی انہوں نے سخت لہجے میں پکار لیا۔

''صرف ایک بات کا جواب دے دو۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی گہری نگاہیں اس کے چہرے کو کھوج رہی تھیں۔

''تم مجھے آباد کرنا چاہتی ہو' یا آباد ہوتے دیکھنا چاہتی ہو؟''

اس ایک سوال پر وہ لمحہ بھر کے لیے تھرا کر رہ گئی تھی۔ یوں ہی آنکھیں کھولے چپ انہیں دیکھے گئی۔

''اگر میں کسی اور کی ہمراہی چاہوں تو تم دستبردار ہو جاؤ گی؟''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''نہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا' لیکن اگر واقعی کوئی ہو تو؟''

''اف خدایا! مت امتحان لیں شیراز بھائی' اگر کوئی ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے؟ کیوں مشکل میں ڈالتے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کوئی ہے تو سہی اوما! لیکن ابھی بتانا نہیں چاہتا' لیکن یہ ہے کہ اگر تم شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دو تو اسی روز میں بھی بندھن میں باندھ لوں گا۔'' ان کی زیرک نگاہیں واضح طور پر اوما کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس کر رہی تھیں۔

جیسے پھانسی گھاٹ پر کھڑے شخص کو زندگی مل جائے' بالکل ویسی ہی چمک اس کی آنکھوں میں یک لخت ہی اتر آئی تھی۔

''یں واقعی تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اوما!' وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا' بالکل سچ؟''

انہوں نے پر یقین انداز میں سر ہلایا۔ تو وہ جیسے کسی بھاری بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے سرشاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو کیا' میں شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دوں؟''

شیراز حسن کے چہرے پہ بے اختیار ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بصد شوق' اور ہاں' یہ نظم صرف تمہارے لیے' منگنی کا تحفہ سمجھو۔''

انہوں نے ایک کتاب میں نشان لگایا پھر اسے تھما دی۔

○ ○ ○

اتنا ہی یاد رکھ مجھے
جیسے کسی کتاب میں
بیتے دنوں کے دوست کا
اک خط پڑا ہوا ملے
لفظ مٹے سے ہوں
رنگ اڑا اڑا سا بھی
لیکن وہ اجنبی نہ ہو
اٹھ کر تیرے گلے لگے
بھولے ہوئے تمام سکھ
بیتے دنوں کی سب کتھا
تجھ سے کہے اور رو پڑے
اتنا ہی یاد رکھ مجھے
بیتے دنوں کے دوست کا
جیسے کوئی خط ہوں میں
رکھا ہوا کتاب میں

اس نے کئی بار اس نظم کو پڑھا اور پھر کتاب تکیے کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی۔ رات ہولے ہولے بھیگ رہی تھی۔

○ ○ ○

آج تیسواں روزہ تھا۔

اور کل انتیسویں روزے ان سب نے گھر کی تیسری منزل کی چھت پر کیسا شور اور ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ لیکن چاند تھا کہ گھنے بادلوں کی اوٹ سے اپنی چھب دکھلانے پر راضی ہی نہ ہوا۔ ٹیپو کی نئی نکور دوربین بھی کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ وہ اس کی مدد سے ایک ایک کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

"تمہارے چہرے پہ ناک بہت عجیب لگتی ہے۔"

وہ خواہ مخواہ بھنڈی کو تنگ کرتا رہا۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے' اتنے بادلوں میں پہلی تاریخ کا چاند بھلا کہاں دکھائی دے گا۔"

رابعہ بھابی منہ اٹھائے گھنے بادلوں کی بڑھتی ہوئی تاریکی دیکھ رہی تھیں۔

"ارے دیکھ' وہ چاند۔" کوئی پکارا۔

"نہیں کم بخت! وہ تو بخاری انکل کی چندیا ہے' ہاہا..... ہا۔"

"نہیں یار' وہ تو ان کی نازک مزاج صاحب زادی کا ابرو مثل چاند دکھائی دے رہا ہے۔"

"تو بڑا پہچانتا ہے' اسی لیے آئے روز..... " پتا نہیں کہنے والا کیا بھید کھولنے جا رہا تھا۔ اسے بانہوں میں جکڑ کر منہ ہی دبوچ لیا گیا۔ اب وہ غوں غوں غاں' غاں کرتا ہاتھ کے اشارے سے دوسروں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"روزہ دارو' اللہ کے پیارو' جنت کے حق دارو!"

"عید کا چاند نظر نہیں آیا' تیسویں روزے کی تیاری کر لو۔"

ضویا بھونپو بجاتی تینوں منزلوں پہ اعلان کرتی رہی۔

"ہم سب یہاں کتنے آزاد ہیں' اور فطرت کے کتنے قریب۔" اوما دونوں بازو پھیلائے تیز ہوتی ہوا میں جھوم رہی تھی۔

"ابھی کچھ دیر بعد ہم بادلوں کے رتھ پر سوار ہوں گے..... اور....."

"دھڑام سے پائیں باغ میں جا گریں گے..... ہاہا..... ہا۔"

اور پھر رات گئے تک وہ سب ہی دائرہ بنائے محو گفتگو رہے' تاریکی بڑھتی رہی اور بادلوں کا ہجوم بھی۔ تھکنے لگے تو ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے' جہاں تائی' چچیاں آج پہلی دفعہ سحری بنانے کی ابتدائی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔

آخری روزے کی افطاری کا وقت تھا۔

تایا ابو نے رقت آمیز لہجے میں ایک طویل دعا کی تھی۔ رمضان کی مبارک ساعتیں آج رخصت ہو رہی تھیں۔ خدا جانے دوبارہ یہ مبارک مہینہ دیکھنے کو ملے نہ ملے۔ انہوں نے باقی سب کو بھی اداس کر دیا تھا۔

افطاری کے بعد کھانے کا طویل دور چلا' پھر چائے اور کافی' مدیحہ پھوپھو بھی افطاری میں موجود تھیں۔

نوجوان نسل ان سے کچھ ہٹ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوئی' تو انہوں نے تایا ابا کے سامنے اپنی گزارش نہایت موزونیت کے ساتھ پیش کر دی۔

"عائشہ سے بات کی ہے میں نے' مگر وہ چاہتی ہے کہ اس گھر کے سربراہ کی حیثیت سے فیصلے کا حق آپ کو ہی حاصل رہے۔"

تائی اماں کے توسط سے عائشہ یہ بات پہلے ہی تایا ابو تک پہنچا چکی تھیں۔ بڑی' چھوٹی چچی کو البتہ جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" نظروں ہی نظروں میں اس سوال کا تبادلہ ہوا۔

"تم لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔" تایا ابا نے دھیمے لہجے سے باقیوں کی رائے لی۔

"جو آپ مناسب سمجھیں بھائی جان! آپ کا فیصلہ ہی ہمارا ہے۔" بڑے چچا نے بڑے سبھاؤ سے ان کا مان بڑھایا۔

"ہوں۔" چند لمحوں کی سوچ پھر سوال۔

"بچوں سے رائے لی؟"

"شاہ زین نے انتخاب کا حق مجھے دیا ہے بھیا! اوما باقی لڑکیوں سے بڑی ہے' پھر باپ کی طرف سے نا آسودہ.... ہو سکتا ہے میں اس عمل سے گزشتہ رویوں کی تلافی کر سکوں۔ وحید کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہم نے۔" انہوں نے سکھا' پڑھا کر بھیجا گیا جواب دیا۔

"ہوں' بلال کو بلاؤ ذرا' فاران کو بھی۔"

دونوں آ موجود ہوئے۔

"رات کو فنکشن ہے اوما اور شاہ زین کی منگنی کا' انتظام کرو' اور بچیوں کو بتا دو۔"

"کیا؟"

"نہیں۔"

"ہائے.... اوما اور شاہ زین؟"

"نہیں، نہیں شاہ زین اور اوما۔"

"مدیحہ پھوپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت ٹھیک..... نظر کمزور ہے۔"

"آہا.... ہم تو چلے مہندی لگوانے۔" ضویا لچکتی، مٹکتی ارم کی طرف چل دی۔

"افوہ....اتنی جلدی، یہ کیا بھئی۔" اوما بڑی کسلمندی سے پڑی تھی جب اسے کھینچ کھانچ کر گاڑی میں پٹخا گیا۔

"جا کر شکل درست کرا آؤ اپنی۔" رابعہ بھابی گویا گاڑی کو دھکا لگا کر ہی واپس پلٹی تھیں۔

"کیا ہو جاتا، اگر یہ کام صبح عید کے روز رکھ لیا جاتا۔" خضریٰ اس کے ساتھ پریشان سی بیٹھی تھی۔

"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔" اوما مزے سے بیوٹیشن کے سامنے بیٹھی مسکرائے جا رہی تھی۔

واپسی پر ارسلان لینے آیا تھا۔ ساتھ میں کوئی اور بھی جلا بھنا بیٹھا تھا۔

"یہ بڑے ماموں نے میرے داخلے پر پابندی کس خوشی میں لگائی ہے۔"

"بڑے ماموں سے پوچھیے۔" ازلی بے نیازی۔

"تو میرے بغیر منگنی کیسے ہوگی؟"

"یہ بھی ان ہی سے پوچھیے۔"

"انگوٹھی کون پہنائے گا۔" ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو میں وہ خاصا غمگین لگ رہا تھا۔

"یار! اگر کوئی بے اعتباری ہے تو میں پہنا دوں گا۔" ارسلان سنجیدہ تھا۔

"بکو نہیں۔" وہ سچ مچ رنجیدہ تھا۔

"اچھا بھئی کرتے ہیں کچھ، ویسے اوما آج خوب صورت لگ رہی ہے۔" ارسلان نے آنکھ دبا کر شاہ زین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح۔" وہ چہکی، مگر سامنے جذبے لٹاتی دو آنکھوں نے بے اختیار ہی نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

○ ○ ○

پائیں باغ میں روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

ہنسی، لطیفے، مذاق، قہقہے، باتیں۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔

ہوا پچھلے پہر ہونے والی بارش کی نمی سے بوجھل ہو رہی تھی، ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ معطر ہوا لڑکیوں کی نوخیزی چھوتی تو وہ خوامخواہ ہی اپنے آپ میں سمٹنے لگتیں۔

انجو مامی اور ریاض ماموں بھی بچوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔

"یہ اچھا کیا بڑے بھیا نے جو کھانے کا انتظام کر لیا، دیکھیے کچھ دیر میں سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔"

عائشہ چچی نے بلال بھائی کو برتن لگواتے دیکھ کر کہا تھا۔

"یار پلیز! میرا بھی کچھ کرو نا۔" ضویا، خضریٰ کے کندھے دبا رہی تھی۔

"ذرا انتظار میری بچی! ہم قربانی بس بڑی عید پر ہی کرتے ہیں۔" خضریٰ اسے تھپکی دینے لگی۔

شیراز حسن، فاران بھائی کے ساتھ سیٹ سنبھالے بیٹھے تھے۔

"بھئی لے کر آؤ، کہاں ہے اوما، چلو بھئی مدیحہ! رسم کرو، وہ لڑکے ادھر اندھیرے میں کیا کر رہے ہیں؟ بلاؤ سب کو۔" تایا ابا آئے تو آتے ہی تھرتھلی مچا دی۔

"جلدی کرو، تایا ابو ڈانٹ.... " رابعہ بھابی کی دہائی، اوما کی سینڈل پہنی اور بھاگ کر مرکزی سیٹ سنبھال لی۔

"لاؤ بھئی، اب کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے مدیحہ کے ہاتھ سے انگوٹھی جھپٹی، گھما پھرا کر دیکھی، اس سے قبل کہ خود ہی پہنا دیتے کوئی سیاہ چادر میں لپٹا وجود ان پہ جھکا۔

"دکھایئے تو ذرا۔" تایا ابا کی ایک ثانئے کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگوٹھی ان کے ہاتھ سے بڑی سہولت سے اچک لی گئی تھی۔

"والدہ حضور.... تھوڑی جگہ...." والدہ حضور ہنستی ہوئی پرے کھسکیں۔

اس کے ساتھ ہی سیاہ چادر اتار کر لڑکوں کی طرف اچھالی گئی، موصوف بال سنوارتے گھٹنوں کے بل اوما کے عین سامنے بیٹھے۔

"اجازت ہے؟" شرارت بھرا انداز۔

تایا ابا بڑی دیر بعد اپنی حیرت سے نکلے، اور پھر اکیسویں صدی کی نوجوان نسل سے سمجھوتا کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اوما کی انگلی میں منتقل ہو گئی تھی۔ لڑکوں کی ہاؤ ہو اور مبارک باد سے سارا ماحول گونج اٹھا تھا۔

"چلو بھئی' اب تم اٹھو یہاں سے' نیکسٹ۔"

"ہائیں۔" کسی نے اوما کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اور اگلے ہی پل ارم شرماتی' لجاتی اس کی جگہ فٹ ہوگئی تھی۔

"کیوں بھئی شیراز حسن تمہارا کیا ارادہ ہے؟" تایا ابا نے برابر بیٹھے شیراز کو دیکھا اور شاہ زین کی نقل میں اسی انداز میں پوچھا۔

"اجازت ہے؟"

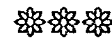
اس بات پر سب ہی نے قہقہہ لگایا' اور تایا ابا نے ارم کو شیراز حسن سے منسوب کرتے ہوئے انگوٹھی اسے پہنادی تھی۔

"اف بدتمیز! وہ تم تھیں' چھپی رستم' نہ بتایا' نہ پوچھا' الٹا میری جان مصیبت میں۔" اوما مٹھیاں بھینچے ارم کی طرف لپکی۔

باقی سب کھانے میں مصروف تھے۔ ارم آنکھوں میں نمی لیے بس مسکراتی جارہی تھی۔

"کل مدیحہ پھوپھو کے ہاں دعوت طعام کی عام دعوت ہے۔ خاص دعوت صرف اوما جی کے لیے اور ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ حوض کنارے انار کا درخت لگ چکا ہے' اس کی شاخیں البتہ ابھی پانی میں نہیں جھکیں۔ تاہم پرزور اصرار پر جناب حضرت شاہ زین شاخیں ہاتھ میں لے کر پانی میں جھکائے رکھیں گے' مزید اطلاع .... کہ گلاس وال کے پاس اسٹیریو بھی رکھ دیا ہے۔ جگجیت صاحب کی سی ڈی نے چلنے سے انکار کردیا' فی الحال جو سی ڈی چلنے کے لیے تیار حالت میں پڑی ہے وہ نور جہاں صاحبہ کی ہے اور گانا .... ٹیپو .... رومی کی پکار اور پھر ان کی بے ہنگم آوازیں۔

میں تے میرا دلبر جانی
بلیاں تے پیار کہانی
سانوں وچ آیا ای طوفان
موسم ہویا اے بے ایمان



یہ جو زندگی کی کتاب ہے

موسم بدل گیا۔

دن میں پنکھا چلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور رات کو کھلے آنگن میں سونے والوں کے بستر' تکیے اوائل اکتوبر کی نم آلود راتوں سے بھیگ جاتے۔

دوپہریں عجب بھید بھری تھیں۔ نیم تاریک کمروں میں بسی پراسراری ٹھنڈک بلاوے دیتی ہوئی محسوس ہوتی تو دل' آنگن میں چلتی خوشگوار ہوا کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈک میں رچا بسا نیم گرم ماحول' ذہن و دل کو مدہوش سا کرتا ہوا۔ پرسکون خاموشی میں لپٹی یہ تنہائی اس موسم میں بہت لطف دیتی تھی۔

عفیفہ' حمزہ کا پرانا سویٹر نکال کر پچھلے برآمدے میں آئی تو دھوپ برآمدے کی سیڑھیوں میں آ کر ٹھہری گئی تھی۔ وہ تخت پر بیٹھ کر اپنی سوچوں میں مگن سویٹر ادھیڑنے لگی۔ بالکل نیا سویٹر مگر حمزہ کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ ایک موسم کے کپڑے اگلے موسم میں اس کے کام نہیں آتے تھے۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اسی سویٹر کو ادھیڑ کر اجالا کے لیے نیا بنا دے گی۔ تخت کے کونے پر اون کی ڈھیری سی لگ گئی تھی۔ اس نے بھی قدرے تھکاوٹ محسوس کی تو کمر سیدھی کرنے کے لیے یونہی آڑی ترچھی سی لیٹ گئی تھی۔ پرسکون ماحول' اعصاب کو تھپکنے لگا تھا۔

وہ نیم وا آنکھوں سے درختوں کی شاخوں پہ بیٹھی درجنوں پھولی پھولی چڑیوں کو دیکھنے لگی' جو اپنی ننھی ننھی چونچوں سے اپنے پروں کو کھجلا رہی تھیں۔ درختوں کے پتوں کو چھو کر گزرتی خوشگوار ہوا ان کی ہلکی پھلکی چہکاروں سے لبریز ہوئی جارہی تھی۔ ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہوئی تو اس کی پلکیں خود بخود بند ہونے لگیں۔

اسی حالت میں کسی کے قدموں کی مدھم سی چاپ اسے اپنے آس پاس ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قریب ہی ایک سرسراہٹ سی بکھری۔ مانوس خوشبو' پلکوں میں خود بخود ذرا سی جنبش ہوئی۔ اس کا معصوم اور بھولا سا چہرا آ ٹھہرا تھا۔ نیم وا ہونٹ' پرکشش آنکھوں میں ہچکچاہٹ۔

وہ اسے سوتا سمجھ کر کشمکش و پیچ میں تھا۔ پکارے یا نہ پکارے۔۔۔۔۔۔۔ عفیفہ کے ہونٹ بے ساختہ مسکراہٹ روک نہ پائے۔ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ جھینپ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"اسعان! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اچھا۔۔۔۔۔۔؟" وہ ذرا سا مسکرائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کی باجیاں گھر پر نہیں ہیں کیا؟"

"اونہوں۔۔۔۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کچھ اسکول گئی ہیں۔ کچھ کالج۔"

"اور مما۔۔۔۔۔۔؟" اس نے سوال کرتے ہوئے بھابی کے پورشن کی طرف دیکھا، جہاں حسب معمول اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"وہ سو رہی تھیں۔"

"ہوں۔۔۔۔۔۔ مما سو رہی ہیں' اور یقیناً انہوں نے آپ کو بھی سونے کے لیے اپنے ساتھ لٹایا ہوگا۔ اور جونہی ان کی آنکھ لگی۔ موصوف موقع سے فائدہ اٹھا کر ادھر بھاگ آئے۔" اس نے خوشگوار موڈ میں اسے گدگدایا تو وہ ذرا سا مسکرا کر پیچھے کھسک گیا۔

"میں کیا کرتا۔۔۔۔۔۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔" اس نے توجیہ بیان کی تو وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ادھڑی اون کے گولے بنانے لگی۔

"مما سے کہنا آپ کو اسکول میں داخل کروا دیں۔ وہاں بہت بچے آپ کے دوست بنیں گے' تو آپ کا دل بھی لگا رہے گا۔"

اپنی ازلی سنجیدگی میں ڈوبا وہ بغیر کوئی جواب دیے ادھڑی ہوئی اون کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتا' ادھیڑتا رہا۔

ساری اون الجھ گئی تھی۔ اسے گولہ بنانے میں دقت پیش آنے لگی' تب اسعان کو احساس ہوا۔ ازحد پریشان چہرے کے ساتھ اس نے عفیفہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر اسے اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر اپنے آس پاس بکھری ساری اون سمیٹ کر شرافت سے اس کے سامنے رکھ دی۔ عفیفہ نے جھکی نگاہوں سے اس کی ساری حرکت کو بغور دیکھا تھا۔ وہ اب ٹانگیں جھولا رہا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے چہرے کو کھوج رہا تھا جہاں کہیں گولہ بنانے میں ذرا سی رکاوٹ ہوئی' وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟ نہیں بن رہا۔۔۔۔۔۔۔ اب یہ ٹھیک نہیں ہوگا؟"

"میری جان پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ اون ذرا الجھ گئی ہے۔ میں ٹھیک کر لوں گی۔" اس کے تسلی دینے پر بھی وہ مطمئن نہ ہو سکا تھا۔

(تم ہزار بھی اسے الجھاؤ تو میں اسے ہزار بار سلجھاؤں گی۔ اس آس پر کہ اسعان کے ننھے ہاتھ اسے ایک بار پھر الجھا دیں۔ اور میں گرہ لگی الجھی اون کو بہت سنبھال کر اپنے پاس رکھ لوں)

اس نے دل سے اٹھی ہوک دباتے ہوئے اسعان کی پیشانی سے بال ہٹائے اور اون اٹھا کر ایک طرف ڈال دی۔

"اسعان! سینڈوچ بنا رکھے ہیں۔ کھاؤ گے۔۔۔۔۔۔۔؟"

وہ نفی میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔

"چاچی ایک بات پوچھوں؟" اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ پوچھو۔۔۔۔۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔ وہ چند لمحے رکا۔ پھر مدھم آواز میں پوچھنے لگا۔

"چاچی! پہلے میں آپ کا ہوتا تھا؟"

اس کے ننھے منے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

"بتایئے نا۔۔۔۔۔۔؟ پہلے میں آپ کا ہوتا تھا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی معصوم ہلکورے لیتی خوشبودار سانسیں عفیفہ نے اپنے گالوں سے ٹکراتی محسوس کیں تو بے اختیار ہی اسے کھینچ کر اپنی گود میں ڈال لیا۔

"جی نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ صرف اپنی مما کے ہو۔۔۔۔۔ پہلے بھی۔۔۔۔۔ اور اب بھی۔۔۔۔" دل سے اٹھتی ہر آواز کا گلا دباتے ہوئے اس نے اسعان کو پیار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"بالکل اسی طرح جس طرح حمزہ اور اجالا میرے ہیں۔ اسی طرح آپ اور فلک صرف اپنی مما کے ہیں۔" اس نے اسعان کو گود سے اتارا' اور خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسعان قدرے مایوس ہو گیا تھا۔

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا جیسے پہلے میں آپ کا ہوتا تھا۔"

"آہ۔۔۔۔۔۔۔!" سلے ہوئے زخم ایک جھٹکے سے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے اس نے۔ کمرے تک جاتے ہوئے اس نے دروازے کا آسرا لیا۔

"اسعان اب آپ جاؤ مما اٹھ گئی ہوں گی۔" وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی بیڈ پر آ گری تھی۔ نیم تاریک کمرے کی خاموشی میں ایک بار پھر اس کی آواز ابھری۔

"چاچی! پہلے میں آپ کا ہوتا تھا؟"

"کس نے بتایا اسے۔ کس نے بہکا دیا معصوم جان کو۔ کون ایسی باتیں اس کے کانوں میں

ڈالتا ہے' اگر کوئی نہیں تو پھر اس نے یہ کیوں پوچھا؟ کیسے پوچھا........ کیوں کر احساس ہوا اس کو کہ پہلے وہ میرا تھا۔"

وہ کانوں پہ تکیہ رکھے الجھتی رہی، ساعتوں پہ دستک دیتے اس سوال سے پیچھا چھڑاتی رہی۔

شام ہوتے ہی سینکڑوں کام اس کے منتظر ہوتے تھے۔ اسے خبر نہ تھی' آج اس نے یہ سارے کام کیسے نمٹائے۔ کیا کرلیا۔ کیا باقی رہ گیا۔ جیسے تیسے وقت کاٹ ہی لیا۔ مگر رات' تنہائی میں محبت کا سامنا کرتے ہی جیسے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے کس انداز سے یہ سوال مجھ سے کیا تھا۔ اور........ اور میرا دل چاہ رہا تھا' میں سب بھول جاؤں۔ ہر راز' ہر وعدہ' ہر مصلحت' بھلا دوں سب کچھ اور اس کو اپنے سینے سے بھینچ کر کہہ ڈالوں۔ "ہاں تم میرے ہو........ تم میرے تھے۔ تم میرے رہو گے۔ تم تو ازل سے میرے ہو۔ میرے روم روم میں بسے ہو' میرے خون کے ساتھ گردش کرتے ہو میرے دل میں دھڑکتے ہو۔" وہ زاروقطار روتی چلی گئی۔ محبت ستے ہوئے چہرے کے ساتھ لب بھینچے بیٹھا رہا۔

"میں اسے نظرانداز بھی کرتی ہوں۔ اس سے آنکھ بھی چراتی ہوں۔ پھر بھی وہ میری طرف کھنچا آتا ہے۔" وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔ پھر ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"شاید اسی لیے محبت! کہ میرے اندر سے اس کے لیے پکار اٹھتی رہتی ہے۔ اسے دیکھے ہوئے زیادہ دیر ہو جائے تو میرے وجود میں بے چینیاں سی بھر جاتی ہیں۔" اس کا چہرہ بے آواز آنسوؤں سے تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اور پتا ہے محبت! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اسے ابھی جنم ہی نہیں دیا۔ وہ ابھی تک میری کوکھ میں سانس لیتا ہے۔ وہ ابھی تک میرے اندر گڑا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں میرے وجود میں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ میں اسے کس طرح اپنے اندر سے نوچ ڈالوں .... محبت ...... میں ایسا نہیں کرسکتی .... مجھ سے یہ کیا ہی نہیں جاتا.........."

درد اس کے ہونٹوں سے پھسل رہا تھا۔ قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ چہرے کے ایک ایک نقش میں بسا ہوا تھا۔ محبت بے اختیار ہی اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا سر تھپکنے لگا تھا۔

"مت رو عفیفہ! تم نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ پلیز اس کی عظمت کو برقرار رکھو۔ ہم نے دوسروں کی بھلائی کے لیے یہ سب کیا۔ خدا تمہیں تمہارے صبر کا انعام ضرور دے گا۔ اسعان کے لیے یوں تمہارا جذباتی ہونا ہمارے لیے بہتر ہے، نہ اسعان کے حق میں۔ ہمارے پاس حمزہ اور اجالا

ہے نا۔ تم ان پر توجہ دو۔ ان کے لیے سوچو۔ انہیں چاہو۔ اب ہمارا اسعان پر کوئی حق نہیں۔ تمہیں یاد ہے نا۔ آخری فیصلہ ہمارا اپنا تھا۔"

وہی مخصوص نرم' شائستہ لہجہ' اپنی تسلی دیتا ہوا۔

اس کی بے تابی پر صبر کی پھوار ڈالتا۔ اس کے کاندھے پہ سر رکھے۔ آنسو بہاتے بہاتے اس کا دل ٹھہر سا گیا تھا۔ بے چینی تھم گئی تھی۔ دل کا سارا غبار اس مہربان شخص کے سامنے نکال کر وہ جیسے ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔

"میں نے آپ کو خوامخواہ پریشان کر دیا۔" وہ اس کا مضبوط ہاتھ تھامے پشیمان سی بیٹھی تھی۔

محبت بے اختیار مسکرا دیا۔

"کوئی نئی بات نہیں' میں عادی ہو چکا ہوں۔" وہ دانستہ شرارتی لہجے میں کہتا سونے کے لیے تکیہ درست کرنے لگا تو وہ اٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے آ گئی۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنے لیے صبر و قرار اور اسعان کے لیے بے انتہا خوشیوں کے سوا اس نے کچھ نہیں مانگا تھا۔

"یہ فیصلہ ہمارا اپنا تھا پروردگار! اور اسی معاملے میں' میں نے صرف تجھے اپنا مددگار بنایا ہے۔"

بہت دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رکھنے کے بعد وہ خود بھی اٹھ گئی تھی۔ صبح محبت کی آنکھ کھلی تو وہ حمزہ اور اجالا کو اسکول کے لیے تیار کروا رہی تھی۔ اس کے کپڑے نکال رکھے تھے نہانے کے بعد اپنی تیاری کرتے ہوئے وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا تھا........ وہ ہر روز کی طرح ہشاش بشاش ہرگز نہیں تھی۔ بے خوابی سے چور گلابی آنکھیں بوجھل پلکیں۔ ستا ہوا چہرہ۔

ٹائی کی گرہ لگاتے لگاتے محبت نے اپنی دراز کھنگالی۔ دو گولیاں نکال کر میز پہ رکھیں جہاں وہ اس کے لیے ناشتہ لگا کر اٹھ رہی تھی۔

"ادھر آؤ........" اس کے واپس پلٹنے سے قبل محبت نے اسے کلائی سے تھام کر اپنے سامنے بٹھا لیا تھا۔

"ناشتہ کرو........" عجب حکمیہ انداز تھا۔

"ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا میں بعد میں کرلوں گی۔ اس نے بڑے سبھاؤ سے انکار کیا' جواب میں محبت نے مکھن اور شہد لگا سلائس اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ قطعی انداز تھا' اب کے انکار کرتی تو اس کی محبتوں کو نظرانداز کرنے کی مجرم ٹھہرتی' وہ خاموشی سے سلائس تھام کر کھانے لگی۔ خود محبت نے صرف دودھ پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"یہ گولیاں کھاؤ اور سو جاؤ آرام سے۔ اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی سب کام وام ہوتے رہیں گے۔ حمزہ اور اجالا کو واپسی پر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہمارے لیے کھانا مت بنانا۔ او کے

........'' وہ ہدایات جاری کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

'' ویسے ایک بات کہوں ....'' وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹا۔

'' آج ہر روز سے زیادہ اچھی لگ رہی ہو'' اس کا اشارہ عفیفہ کے بکھرے بکھرے بالوں کی طرف تھا۔ جسے اس نے صرف صبح انگلیوں سے سمیٹ کر کلپ لگا لیا تھا۔

پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

'' بس کریں محبت! ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں۔'' اس نے گویا یاد دہانی کرائی تھی۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے ....؟ اٹھائیس سال کی عمر میں تم بوڑھی ہو گئی ہو نہ تینتیس برس کی عمر میں میری محبت نے دم توڑا ہے .... شام کو تیار رہنا کہیں باہر چلیں گے۔''

وہ مسکراتے ہوئے عجلت میں کہتا باہر نکل گیا تھا۔

○ ○ ○

وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تو اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ کم عمری کی معصومیت ابھی سنجیدگی میں نہ ڈھلی تھی۔ لا ابالی پن ابھی ذمہ داری میں نہ بدلا تھا اور سوچ کا کچا پن' پختگی میں ڈھلنے کے لیے ابھی کچھ وقت مانگتا تھا۔ ذہن و دل نزاکت سے لبریز تھے۔ پلکوں تلے نوخیز خوابوں کا بسیرا تھا۔ ابھی تو وہ عمر تھی کہ بارش کی کن من بدن میں جلترنگ بجا دیتی تھی۔ بادل' خوشبو' پھول اور ہوائیں مدہوش کر دیتی تھیں۔ اور اسی مدہوشی میں ابٹن' مہندی اور سنگھار کی خوشبو میں رچی بسی وہ پیا کے دیس چلی آئی تو لگا کسی '' حیرت کدے'' میں قدم رکھ آئی ہے۔ زمین' آسمان' فضائیں' سب کا رنگ بدلنے لگا تھا۔

وہ حسین ضرور تھی مگر خود آگاہ ہرگز نہ تھی۔ محبت کی وارفتگیاں اسے بوکھلا کر رکھ دیتیں۔ کمرے کی تنہائی سینک کر گھر کی رونق کا حصہ بنتی تو اور بھی گھبراتی۔

ماشاءاللہ بھرا پرا سسرال تھا۔ دو جیٹھ' جیٹھانیاں' ان کے بہت سے بچے۔ ایک کنواری نند' باقی نندیں بیاہی تھیں مگر اسی شہر میں۔ ہر روز کا آنا جانا تھا۔ ہر وقت کی گہما گہمی' اظہار خیال و رائے کی مکمل آزادی۔ بچوں' بڑوں' سب کی ایک ہی محفل جمتی۔ چھوٹے سے چھوٹا فنکشن بڑے سے بڑے پیمانے پر منعقد ہوتا۔ اس گھر میں ہر عادت' ہر فطرت اور ہر طبیعت کے لوگ موجود تھے۔ اپنے گھر کے لگے بندھے معمول اور پرسکون ماحول سے نکل کر ہمہ وقت کے شور' ہنگامے میں آ کر وہ گھبرا سی گئی تھی۔ ایک ایک فرد کو سمجھنے کی کوشش میں وہ خود ہی الجھنے لگتی تو تنگ آ کر محبت کے سامنے جا بیٹھتی۔

'' کیا کروں' اور کیا نہ کروں ..... ہر بندہ اپنا مزاج رکھتا ہے۔ کس سے ملنا ہے۔ کیسے برتنا ہے؟ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' وہ حیران حیران سی بیٹھی تھی' قدرے پریشان تھی۔ محبت بے اختیار ہنس دیا۔

'' ابھی سب کچھ نیا ہے تمہارے لیے' اسی لیے ایسا محسوس کر رہی ہو۔ رفتہ رفتہ سب سے شناسائی بڑھے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پھر اس شناسائی کو بڑھانے میں اس نے خود بہت کوشش کی تھی۔

سسر کی وفات کے بعد اس کی ساس اس خاندان کی بڑی تھیں۔ انداز شاہانہ' مزاج حاکمانہ' ان کے سامنے وہ صرف '' جی حضوری'' سے کام چلاتی اور داد پاتی تھی۔

بڑی جیٹھانی سرد مزاج رکھتی تھیں' ہنسنا بولنا' دوسروں سے گھلنا ملنا ان کی عادت میں نہ تھا۔ سنجیدہ اپنے آپ میں گم لیے دیے رہنے والی۔ محفل میں بیٹھتیں تو یوں کہ ان کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ عفیفہ ان سے بچ کر ہی رہتی تھی۔ کام کی بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا۔ مبادا انہیں برا نہ لگ جائے۔ ان کی عادت تھی مزاج کے خلاف بات ہو جاتی تو ان کے چہرے کے پتھریلے نقوش مزید تن جاتے۔ سپاٹ آواز میں سرد مہری گھل جاتی۔ مخالف فرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی تھیں۔ اوپر تلے چار بچیاں پیدا کرنے کے بعد اولاد نرینہ کی خواہش ان کی حسرت بن چکی تھی۔ ان کے سخت مزاج کی' چڑ چڑے پن کی ایک بڑی وجہ شاید ان کی یہ محرومی بھی تھی۔

چھوٹی بھابی ان کے بالکل برعکس تھیں۔ فربہی مائل جسم گوری رنگت گھر کے بیشتر معاملات ساس کے بعد ان ہی کے ہاتھ میں تھے۔ وہ خاصی ہنسوڑ قسم کی خاتون تھیں۔ کام میں بے حد پھرتیلی' ایک بچہ چپس کھانے کی فرمائش کرتا تو وہ دھڑا دھڑ چپس تل کر گھر کے سارے بچے نمٹا دیتیں۔ آس پڑوس میں آنا جانا' مہمانوں کی خاطر تواضع' نندوں کی آؤ بھگت' شادی بیاہ پر لینا دینا سب ان کے ہاتھ میں تھا۔ عفیفہ ان کاموں میں ان کی صرف مدد کرواتی تھی۔ بلکہ ان کی وجہ سے وہ بہت ساری ذمہ داریوں سے بچی ہوئی تھی۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا یا پھر صبح کے وقت محبت کے لیے ناشتہ بنا دیتی۔ حمزہ اور اجالا کے بعد البتہ زندگی کافی حد تک مصروف ہو گئی تھی۔

انہی دنوں چھوٹی بھابی کا تینوں بچوں سمیت ویزا کنفرم ہو گیا۔ جیٹھ صاحب پہلے ہی جا چکے تھے لہٰذا چھوٹی بھابی نے ہنستے ہنستے رخت سفر باندھا اور تینوں بچوں سمیت یہ جا' وہ جا۔ ساری ذمہ داری اس کے سر ..... وہ ہکا بکا رہ گئی۔ یہ کیا ہو گیا۔

بڑی بھابی کا وہی چلن تھا۔ کوئی مہمان آتا تو ان کی پوری کوشش ہوتی چائے پانی کے بغیر ہی کام چل جائے۔ جب کہ اس گھر کی مہمان نوازی زمانے بھر میں مشہور تھی۔ اور پھر دانستہ و نادانستہ شعوری و لاشعوری طور پر وہ سارے فرائض ایک ایک کر کے نبھاتی چلی گئی۔ چھوٹی نند بھی بیاہ کر اپنے

سسرال چلی گئی تھی۔ گویا ایک اور خاندان ان کے ساتھ جڑ گیا۔ اور پھر ان ہی دنوں جب بڑی بھابی
چھ بیٹیوں کے بعد ایک مردہ بیٹے کو جنم دے کر بہت اداس اور مغموم رہا کرتی تھیں، وہ تیسری بار امید
سے ہوئی۔

○ ○ ○

دوپٹہ ایک طرف رکھے، ہیڈ فون کانوں سے لگائے..... پرشور..... تیز گانا سنتے ہوئے وہ
بڑے مگن سے انداز میں برتن دھو رہی تھی۔ ہاتھوں کی حرکت میوزک سے ہم آہنگ.... سر تال پہ
جھوم رہا تھا.... ڈھیروں برتن منٹوں میں دھل گئے..... اب بڑی بڑی دیگچیوں کو مانجھنے کی باری تھی۔
یہ کام بھی جھومتے جھامتے ہو ہی رہا تھا۔ جب ساس صاحبہ نے کچن کے دروازے پر آ کر اسے
گھورا.... غالباً کچھ کہا بھی.... مگر وہاں کسے سنائی دے رہا تھا؟ پلٹ کر انہیں دیکھنے کی بھی زحمت
نہ کی.... کہ ان کی آمد سے باخبر کب تھی۔ ذرا دیر بعد بڑی بھابی پاس آ کھڑی ہوئیں۔ اس نے
یونہی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھیں..... یا شاید اسی سے مخاطب تھیں.... اس نے ایک
جھٹکے سے ہیڈ فون کھینچا۔

"مجھ سے کچھ کہا....؟" وہ پوچھ رہی تھی، مگر بڑی بھابی بات ختم کر کے دودھ گرم کرنے لگی
تھیں۔

وہ دوبارہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ اسی لمحے اجالا کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی اور
روئے چلے جا رہی تھی.... نجانے کب سے۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

"ہونہہ.... دو بچے پیدا کر چکیں، تیسرے کی تیاری میں مگن.... اور بچپنے کا یہ عالم ہے
کہ...."

وہ ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گئی۔ جلے کٹے لہجے میں یہ واضح بڑبڑاہٹ.... صرف اور
صرف اس کے لیے تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک نظر انہیں دیکھا اور من من بھاری قدم
گھسیٹتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اجالا کو گود میں لیتے ہوئے اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو محسوس کیا تو
بے اختیار ہی سر جھٹک کر مسکرا دی۔

"اور آپی کہا کرتی تھیں..... عفیفہ ہر کام اتنے مزے سے کرتی ہے کہ بڑے سے بڑا کام بھی
اس کی چٹکیوں کی زد پر ہوتا ہے....." اور وہ ہنس کر کہتی۔

"یہ سب میرے واک مین کا کمال ہے۔"

"لیکن عفیفہ بی بی! اب تم پہلے والی عفیفہ نہیں رہی ہو..... دو بچے پیدا کر چکی ہو اور تیسرے کی
تیاری میں مگن ہو.... چھوڑو یہ بچپنا.... اپنی حیثیت پہچانو..... شادی شدہ عورت کو یہ روپ زیب

نہیں دیتے۔"

اجالا کو تھپکتے تھپکتے وہ خود کو سمجھانے بیٹھ گئی تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ معمولی نوعیت
کے واقعات کو بھی سنگین بنا دیا کرتا تھا۔

اور یونہی روز و شب کے سرد و گرم کو سہتے ہوئے اس نے ایک کھلتی ہوئی صبح کے نیلگوں اجالے
میں اسعان کو جنم دیا تھا.... ماں باپ دونوں کا حسن چرایا تھا اس نے..... حمزہ اور اجالا بھی
خوبصورتی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر اسعان اپنی مثال آپ تھا۔

جس روز وہ ہاسپٹل سے گھر آئی، حمزہ اور اجالا گھر پہ نہیں تھے۔

"دونوں نانا، نانی کے گھر جانے کی ضد کر رہے تھے۔ سو میں انہیں پرسوں شام وہاں چھوڑ آیا
تھا۔"

شاپرز میں سے اس کا اور اسعان کا ضروری سامان نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے محب
نے قدرے سنجیدگی سے اسے بتایا تھا اور معلوم نہیں کیوں اسے لگا جیسے محب، اسعان کی پیدائش پر اتنا
خوش نہیں جتنا حمزہ اور اجالا کی پیدائش پر ہوا تھا..... بلکہ وہ تو شاید پوری طرح اس کی طرف متوجہ
بھی نہیں تھا۔

نہ اس کے لیے پہلے کی طرح فکر مند..... نہ دیکھ بھال کا وہ انداز.....

اس نے کریدنے کے لیے کئی ایک باتیں پوچھ ڈالیں، مگر جواب "ہاں" یا "ناں" کے بعد مختصراً
ہی وصول ہوا تھا۔

"کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" وہ اس کے چہرے پہ پھیلی گمبھیر سنجیدگی سے خائف ہو کر سوچنے لگی۔

"ہو سکتا ہے کوئی کاروباری مسئلہ ہو..... ورنہ ایک بیٹے کی پیدائش پر اس کے باپ سے بڑھ
کر اور کون خوش ہو سکتا ہے۔" اس رات وہ محب کے بدلے ہوئے انداز کو سوچتے سوچتے ہی سو گئی
تھی۔

اگلی صبح محب آفس نہیں گیا تھا، بلکہ یونہی اس کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ قدرے بے چین....
قدرے بے قرار.... کچھ کہنے یا نہ کہنے کے الجھاؤ میں پھنسا ہوا.... کئی بار بے تابی سے اسے پکارا
مگر پھر ٹال گیا۔

بہت واضح طرز عمل کے حامل انسان کا یہ غیر واضح رویہ..... وہ ذرا سا چونک گئی۔

"کوئی بات ہوئی تھی، کوئی بہت بڑی بات..... ورنہ یہ چھوٹی موٹی، غیر معمولی باتیں، محب
جیسے بندے کو کبھی اتنا متاثر نہ کرتی تھیں۔"

اس نے حمزہ اور اجالا کو واپس لانے کے لیے کہا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبتے ابھرتے محب

نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لے آؤں گا کل۔"

شام تک وہ منتظر ہی رہی' محب خود سے کوئی بات چھیڑے..... وہ پریشانی' وہ مسئلہ جو پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے دل و دماغ کو جکڑے ہوئے تھا۔ وہ خود اس کے سامنے کھول کر رکھ دے مگر انتظار انتظار ہی رہا تھا۔ شام کو وہ یونہی کسی کام سے باہر نکلی تو گھر میں سناٹا طاری تھا۔ ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا سب لوگ بڑی اماں کے کمرے میں جمع ہیں۔ ساس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے دھڑک اندر چلی گئی تو یہاں بیٹھے تمام افراد کو گویا یکلخت ہی سانپ سونگھ گیا۔ آناً فاناً ایسی خاموشی چھائی کہ وہ خود سے شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

"شاید میں غلط وقت پہ آ گئی ہوں۔" اس کو مروتاً کہنا پڑا مگر جواباً کسی نے بھی اس کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ بڑے بھیا اور بڑی اماں کے درمیان سر جھکا کر بیٹھے محب نے سر اٹھا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا ضرور مگر سر ہلانے کی زحمت نہ کی۔ بڑی بھابی نے اسے دیکھا اور پھر نظریں چرا کر اپنے ناخن دیکھنے لگیں۔ توہین کے شدید احساس سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ وہ ان ہی قدموں واپس لوٹ آئی تھی۔

○ ○ ○

رات گئے محب کمرے میں آیا اور ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتا بیڈ پر آ لیٹا۔ عفیفہ نے یوں ہی لیٹے لیٹے آنکھوں پہ رکھا بازو ہٹاتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسعان کے ننھے ہاتھوں میں انگلی تھمائے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا محب!" وہ بے اختیار کہہ گئی تو محب کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"اگر آپ پریشان ہیں تو کس وجہ سے؟ اور اگر مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ کیوں نہیں دیتے۔ یوں اکیلے جلنے کڑھنے کی ریت پہلے تو ہم دونوں میں موجود نہ تھی۔"

"ہو سکتا ہے' میں وہ بات تم سے شیئر کروں تو تم مجھ سے زیادہ پریشان ہو جاؤ۔" محب اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ قدرے پریشان ہوتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایسی کیا بات ہو گئی' آپ بتا کیوں نہیں دیتے۔" اس کی بے تابی پر وہ ذرا سا مسکرایا۔ عفیفہ کو یہ مسکراہٹ جبری مسکراہٹ لگ رہی تھی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ' اگر میں تم سے اپنے لیے کوئی بہت بڑی قربانی مانگوں تو.....؟"

عفیفہ کچھ دیر تو سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے۔

"بتاؤ نا عفیفہ! اگر تمہیں میرے لیے کوئی قربانی دینا پڑے تو.....؟"

عفیفہ نے دیکھا۔ محب کی نم آلود آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"فار گاڈ سیک محب! یوں پہیلیاں مت بجھوائیں' میری حالت ایسی نہیں کہ مجھے مبہم اور ادھوری باتوں سے آزمایا جائے۔ آپ بتا کیوں نہیں دیتے' آخر کیا چاہتے ہیں مجھ سے' کون سی قربانی درکار ہے۔" اس کا دل بہت نازک تھا اور محب جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔

"عفیفہ! اگر ہم اسعان' بڑے بھیا کو دے دیں تو.....؟" حد درجہ اطمینان و سکون سے اسعان کی پیشانی چوم کر سیدھا ہوتے ہوئے محب نے کہا تو وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

'یہ کیا کہا ہے محب نے۔' اسے اپنی سماعتوں پہ شبہ ہوا تو غائب دماغی سے دوبارہ پوچھنے لگی۔

"کیا کہا ہے آپ نے؟ ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے۔" اس نے بے ساختہ ہی محب کا بازو جھنجھوڑ ڈالا۔

"مجھے لگتا ہے انہیں اسعان کی ضرورت ہم دونوں سے زیادہ ہے۔" وہ اسعان کے گورے گلابی گال اپنی انگلی کی پشت سے سہلا رہا تھا۔

"نہیں محب! نہیں' یہ ظلم ہوگا۔ یہ میرا بچہ ہے اور مجھ سے زیادہ کسی کو اس کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔" وہ کمزور سی آواز میں کہتے ہوئے رو دی تھی۔ کیسی بات کہی تھی محب نے' گویا کلیجے پہ ہاتھ ڈالا ہو۔

"تم نے نو ماہ اسے اپنے جسم کا حصہ بنائے رکھا ہے۔ جانتی ہو نا' یہ مرحلہ کتنا طویل ہوتا ہے اور تخلیق کا مرحلہ اس سے بھی بڑھ کر اذیت ناک۔ بڑی بھابی نے ایک مرتبہ نہیں' سات مرتبہ یہ مرحلہ طے کیا ہے۔ کیوں؟ صرف ایک بیٹے کے لیے نا' مگر اللہ نے یہ نعمت دے کر چھین لی ان سے۔"

"اور انہوں نے سوچا' وہ مجھے دی گئی نعمت کو مجھ سے چھین لیں۔"

"نہیں' انہوں نے مجھ سے یہ نہیں کہا۔ میں خود یہ چاہتا ہوں۔" عفیفہ جانتی تھی' وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر کہہ نہ پائی۔ بس اسعان کو بازوؤں میں بھینچے بے آواز روتی رہی۔

"تمہیں بہت دکھ ہو رہا ہے' ہے نا عفیفہ! باوجود اس کے کہ بڑے بھیا کو دینے کے بعد بھی یہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ باوجود اس کے کہ ہمارے پاس حمزہ موجود ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حمزہ ہمارے پاس موجود ہے۔ کیا حمزہ، اسعان کی جگہ لے سکتا ہے یا اسعان کے بعد آنے والا بچہ اس کا نعم البدل ہو سکتا ہے؟" بھرائی آواز میں اس نے ٹوک دیا تھا۔

"تم صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو۔"

"میں کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔" وہ خفگی سے کہتی دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی مگر محبت نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

"عفیفہ! اس سے کیا فرق پڑے گا۔ پہلے بھی تو حمزہ' تائی کی گود سنبھالے رکھتا ہے' مہک تمہارا دامن نہیں چھوڑتی' کوئی بندہ باہر سے آئے تو اسے پتہ تک نہیں چلتا' کون سا بچہ تمہارا ہے' کون سا بھابی کا۔ اسعان بھی یوں ہی ہمارے تمہارے بیچ حمزہ' اجالا اور دوسرے بچوں کی طرح پل جائے گا۔ تم ماں' بیٹے کے بیچ سات سمندر حائل ہوں گے نہ صدیوں کی دوری۔ مان جاؤ عافی! ہمارا یہ فیصلہ ان کی زندگیوں میں کیسی روشنی بھر دے گا۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو' اسعان باپ کا بازو بنے گا۔ ماں کے سینے میں ٹھنڈک ڈالے گا' بہنوں کی چھایا ہوگا' اتنی ڈھیر ساری دعاؤں میں پلے گا ہمارا اسعان۔ یہ سودا مہنگا تو نہیں۔"

دھیرے دھیرے کہتا ہوا محبت اسے خود سے بہت دور' کوئی اجنبی شخص معلوم ہوا تھا۔ اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ اسعان کو لیے کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھی۔ محبت چند لمحے اس کی طرف سے کسی ردعمل کا منتظر رہا اور پھر لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ جلد یا بدیر وہ سو ہی گیا تھا مگر اس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔

"کتنا آسان سمجھ لیا سب لوگوں نے یہ کام' لمحوں میں میری روح کھینچ ڈالی۔ ارے کوئی ہے تم میں سے جو اپنے جسم کے حصے بخرے کرے' یہاں وہاں ڈال کر جی سکے۔ یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے' کیسے جیوں گی اس کے بغیر۔ بھلے دو چار اور بھی آجائیں مگر اسعان تو اسعان ہی ہے نا' اس کی جگہ کون لے گا۔"

وہ چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ دل اندر سے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ جانتی تھی فیصلہ بالا ہی بالا ہو چکا ہے اور وہ اتنی کمزور دبو قسم کی۔ بڑوں کے فیصلے اسے تنکے کی طرح بہالے جائیں گے اسے تو احتجاج کرنا بھی نہ آتا تھا۔ ہمیشہ' ہر لحہ' ہر مقام محبت کی آڑ لی تھی مگر آج..... آج تو محبت بھی ان ہی کی زبان بول رہا تھا اور وہ جو اس کی ساس کم عمر لڑکیوں کو بیاہنے کے ہزار فائدے گنوایا کرتی تھیں تو سب سے بڑا فائدہ آج اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

کم عمر لڑکیاں نادان ہوتی ہیں' نا سمجھ' نا قابل فہم۔ ذرا دبا کر رکھو تو پلٹ کر جواب دینے کے قابل نہیں رہتیں۔ شاطرانہ چالوں کا توڑ نہیں کر سکتیں۔ جو چاہو کہہ سن لو۔ اندر ہی اندر جل کڑھ لیں گی' کمرے کی تنہائی سے لپٹ کر رو لیں گی' ڈائری کے اوراق پر شکوے' شکایات درج کر لیں گی اور بس..... اس سے زیادہ کی نہ ہمت اور توفیق ہوگی نہ اجازت۔

اور چھوٹی بھابی کے بھی دو بیٹے تھے' کسی نے ان سے یہ قربانی کیوں نہ طلب کی۔" اس نے شدید خواہش کی تھی' کاش وہ تیس پینتیس سال کی گھاگ' شاطر' منہ پھٹ عورت ہوتی۔ پیٹھ ٹھونک کر میدان میں اترتی اور اپنا مقدمہ لڑ کر فاتح کہلاتی۔

مگر مقدمہ لڑنے کی نوبت تو وہاں آتی ہے جہاں بہت سے مخالفین جمع ہوں۔ یہاں تو سب کے سب اس کے ہمدرد تھے۔ اس سے قربانی طلب کر کے اسے نیکوکاروں کی اعلا مسند پر بٹھانا چاہتے تھے اور سب سے بڑھ کر محبت..... جس نے اپنی عمر پر کیے گئے بڑے بھیا کے تمام احسانات اس کے سامنے لمبی فہرستوں کی صورت میں پیش کر دیے تھے۔ اسے نجانے کیوں رہ رہ کر یاد آنے لگا تھا۔

"بڑے بھیا نے مجھے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔"

"بڑے بھیا نے اپنی اولاد سے بڑھ کر میری فکر کی۔"

"نامساعد حالات میں بھی میری تعلیم کو اولین ترجیح دی۔"

اپنی زندگی پر بڑے بھیا کے سارے حقوق انہیں ازبر تھے۔

"یہ احسانوں کا بدلہ نہیں' ہماری طرف سے محبت کا اظہار ہوگا۔ تم ایک ماں کے لیے اپنی ممتا قربان کرو گی' اللہ کے ہاں تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہوگا۔ وہ تمہیں اس سے بڑھ کر نوازے گا۔"

"بڑی بھابی کا شکست خوردہ انداز' بڑے بھیا کی ملتجی نگاہیں' بچیوں کے چہرے پر جلتی بجھتی آس۔ اور اسے لگا۔

"یہ بہت سے دل ٹوٹ گئے' تو شاید میں کبھی خوش نہیں رہ پاؤں گی' یہ نہ ہو اس خودغرضی کے عوض اور بہت کچھ چھن جائے۔" اس نے اپنے سینے پر بہت بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔ اور ہمیشہ کے لیے رکھا تھا۔

"یا اللہ! اس معاملے میں' میں نے صرف تجھے اپنا مددگار بنایا ہے۔ کوئی انسانی تسلی میرے غم کا مداوا نہیں۔ تو ہے جو مجھے صبر دے سکتا ہے' میرے دل کو کشادہ کر دے پروردگار! میرے دل کو اپنے بندوں کے لیے کشادہ کر دے۔"

ان دنوں وہ دعائیں بہت زیادہ مانگنے لگی تھی اور جس روز وہ اسعان کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور اس کا جھولا' اس کے کھلونے' اس کے کپڑے بڑی بھابھی کے کمرے میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس روز محبت نے اس کی گود سے اسعان کو لیتے ہوئے کہا تھا۔

"عفیفہ! آخری فیصلہ ہمارا اپنا تھا' تم نے یہ قربانی صرف میرے لیے دی ہے' یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا' ہم نے احسان نہیں کیا' کسی کو زیر بار نہیں کیا اور نہ ہی ان سے کسی صلے کی خواہش رکھیں گے۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا کہ اس لمحے وہ کچھ بول نہ پائی تھی بلکہ اگلے کئی روز تک وہ کچھ بول نہ پائی تھی۔ ہاں جس روز حمزہ اور اجالا واپس آئے' اجالا کمرے میں آتے ہی چلائی تھی۔

''ماما! آپ نے دیکھا.... تائی کے پاس کتنا پیارا بے بی آیا ہے' مہک کہتی ہے' وہ اس کا بھائی ہے۔ ماما! وہ کتنا خوبصورت ہے۔''

''ہاں' وہ بہت خوبصورت ہے۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار ہی نکلا تھا۔

○ ○ ○

اور پھر ویسا کچھ بھی نہیں ہوا جیسا محبّ نے سوچا اور اس نے چاہا تھا۔ اسعان کو گود میں لیتے ہی بڑی بھابی نے یوں آنکھیں پھیریں' گویا کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اجنبیت کی ایسی دیوار کھڑی کی انہوں نے کہ اسعان کو دیکھنے کی خواہش میں ان کے کمرے تک جانے کے لیے اسے سینکڑوں بار سوچنا پڑتا اور کبھی وہ ہمت کر کے ان کے پاس چلی بھی جاتی تو ان کے ایک ہی اشارے پر کوئی نہ کوئی بچی اسعان کو لے کر ادھر اُدھر کھسک جاتی یا پھر وہ خود ہی اسے نہلانے دھلانے کو غسل خانے میں گھس جاتیں۔ وہ حیران حیران سی انہیں دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھار ان کی سرد مہری دیکھ کر اس کا دل چاہتا ایک بار کہہ ڈالے۔

''کیسی عورت ہو تم! تمہارے لیے میں نے اپنے دل میں کبھی نہ بھرنے والا گھاؤ لگا لیا اور تم مجھے اتنا سا حق دینے کو بھی تیار نہیں کہ میں اپنے بچے کو گود میں بھر لوں اور ایک محبت بھرا بوسہ اپنی ممتا کے نام پر اس کے ماتھے پر ثبت کر سکوں۔'' مگر دوسری ہزار باتوں کی طرح لاپروا و بے نیاز ظاہر کرتے ہوئے یونہی کچھ دیر کے لیے اسعان کو ہنستے کھیلتے' کلکاریاں مارتے دیکھتی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے خود پر جبر کر کے خود کو حمزہ اور اجالا تک محدود کر لیا۔ بچوں کی تربیت کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ ایک مخصوص حد تک اس نے اور محبّ نے اپنے بچوں کو بھرپور آزادی دی تھی' ان کی خواہشات کا احترام کیا تھا' ان کی صلاحیتوں کو نکھارا تھا۔ جس روز اجالا نے کمرے کی شفاف دیوار پر پہلی مرتبہ ایک ٹیڑھی میڑھی تصویر بنائی۔ اس روز محبّ نے اس کے سامنے رنگوں اور کاغذات کا ڈھیر لگا دیا۔ وہ تو ہاتھ میں قلم بھی اس انداز سے پکڑتی گویا کسی مصور نے برش تھام رکھا ہو۔ ابتدائی کلاسوں میں ہی اس کی ڈرائنگ دیکھ کر ٹیچرز دنگ رہ گئی تھیں۔ اوپر سے کوئل جیسی آواز میں کوکتی اور یوں مسلسل کوکتی کہ اجنبی سے اجنبی فرد بھی دو گھڑی اس کی باتیں سننے کے لیے ضرور ٹھہر جاتا۔ ٹیچرز اسکول سے پیغام بھجواتیں۔

''ہر روز اس کی نظر ضرور اتارا کریں۔''

حمزہ کی طبیعت میں تجسس بہت تھا۔ کیا ہے' کیوں ہے' کیسے ہے۔ ایک ہزار ایک سوال ہوتے تھے اس کے پاس۔ عفیفہ کے پاس اتنا وقت نہ ہوتا' اگر ہوتا بھی تو وہ جواب دیتے دیتے چڑنے لگتی۔ تب محبّ اس کی جگہ سنبھال لیتا۔ دونوں باپ بیٹا مل کر نیشنل جیوگرافک چینل کھنگال دیتے۔ رات گئے تک اسکول کی ہر روز کی روداد سنائی جاتی۔ پڑھائی سے متعلق صلاح' کھیل سے متعلق مشورے' دوستوں کی باتیں اس کی گہری بھوری آنکھوں میں چمک گہری ہوتی جاتی اور گفتگو کا دورانیہ بڑھتا جاتا۔ حمزہ قدرے لاپروا مگر بے حد ذہین اور حاضر جواب بچہ تھا۔

دیکھنے' سننے والے ان دونوں کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

''تم تو بہت لاپروا اور دبّو سی ہوتی تھیں۔ اتنی ذمہ دار' اتنی فرض شناس کیسے ہو گئیں؟''

''یہ سب محبّ کا کمال ہے۔ اگر محبّ کا ساتھ نہ ملتا تو شاید میں کچھ بھی نہیں ہوتی۔ سچ..... انہوں نے مجھ پر بڑی محنت کی ہے۔'' اپنی دوستوں کی بے تحاشا حیرت کے جواب میں وہ برملا کہا کرتی تھی۔

○ ○ ○

محبّ بچوں کے ساتھ رات گئے واپس آیا تھا۔ تب تک وہ بھوک کی شدت سے بے حال ہو کر کھانا کھا چکی تھی۔ ان لوگوں کے لیے چپاتیاں ڈالنے کو اٹھی تو محبّ نے روک دیا۔

''نہیں بھئی! ہم لوگ برگر کھا آئے ہیں اور آپ کے لیے آئس کریم لائے ہیں۔'' وہ آئس کریم کا پیک اسے تھما کر خود کپڑے بدلنے چلا گیا۔

عفیفہ نے بچوں کے ساتھ ساتھ دادی کا حصہ بھی نکال کر انہیں دادی کے کمرے میں بھجوایا اپنے لیے آئس کریم نکالتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رک سی گئی۔ ڈریسنگ روم سے باہر آتے محبّ نے قمیص کے کالر جھٹک کر سیدھے کرتے ہوئے اسے دیکھا پھر بے اختیار ہنس دیا۔

''آئس کریم کا چمچ بھر کر سوچنے کا نیا رواج نکلا ہے کیا؟''

''ارے نہیں' میں تو بس.....'' اس نے سر جھٹک کر اس کی بات کی تردید کی پھر ذرا ٹھہر کر پوچھنے لگی۔

''اسعان کے لئے بھی آئس کریم بھجوا دوں۔''

اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے محبّ نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر بھابی کے پورشن کی طرف جھانکا' لاؤنج پوری طرح روشن تھا اور متحرک سائے کھڑکی کے شیشوں پر ناچ رہے تھے۔

''بھجوا دو' ابھی تو غالباً سب لوگ جاگ رہے ہیں۔''

''ان لوگوں کی رات' بارہ ایک بجے کے بعد شروع ہوتی ہے۔'' اس نے اطلاع دیتے ہوئے

حمزہ کو پکارا اور پیالہ بھجوا دیا۔ ایک چھوٹا سا لان ہی عبور کرنا تھا اس نے اور بس۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ پلٹی تو محب اپنے سامنے کئی قسم کی فائلیں بکھیرے بیٹھا تھا' وہ چڑ سی گئی۔

"کیا ہے بھئی! سارا دن بچوں کے ساتھ سر کھپایا ہے اور اب فائلیں لے کر بیٹھے ہیں' تھکتے نہیں ہیں آپ۔"

"تھک جاتا ہوں اگر تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے نہ پیوں تو۔" سنہرے فریم کا نفیس چشمہ لگاتے ہوئے اس نے شرارت سے کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

"چائے تو میں بنا دیتی ہوں محب! لیکن وقت بھی تو دیکھیں' رات دیر سے سوئیں گے تو صبح اٹھنے میں بھی آپ کو ہی دقت ہوگی۔"

"اچھی بیویوں کے پاس شوہروں کو جگانے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ تم بھی کوئی "خوبصورت" سا طریقہ آزما لینا۔ یقین مانو مجھے اٹھنے میں ذرا دقت نہیں ہوگی۔" وہ سب فائلیں چھوڑ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ یکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دس سال ہوگئے ہیں ہماری شادی کو۔" سارا زور "دس سال" پر دیا تھا اس نے۔

"لیکن تم ابھی بھی اوّل روز کی طرح شرماتی ہو۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' میں چائے ہی بنا لاتی ہوں۔" وہ مسکراہٹ دباتی فوراً کمرے سے نکل آئی تھی۔

اگلی صبح "جگانے" کا طریقہ واقعی بہت "خوبصورت" تھا مگر عفیفہ کا نہیں' محب کا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو محب شرارتی ہنسی لبوں پہ سجائے عجلت میں کہہ رہا تھا۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں' گیٹ بند کر لو۔"

"ارے..... ارے۔" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ وال کلاک کی طرف دیکھا' اور پھر گھبرا کر بستر سے نکل آئی۔

"اتنا وقت ہوگیا..... بچے..... ناشتہ..... ان کا لنچ۔" وہ چپل گھسیٹتی ان کے پیچھے لپکی۔ محب بچوں کو گاڑی میں بٹھا رہا تھا۔

"ماما! ناشتہ کر لیا ہے' لنچ بھی لے جا رہے ہیں۔" حمزہ نے آواز لگا کر اسے تسلی دی۔

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ اجالا بائے بائے کرتے ہوئے چیخ چیخ کر نہ جانے کیا کہہ رہی تھی' وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ بس الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلایا اور پھر گیٹ بند کر کے سیدھی کچن میں آ گئی۔

"خدا معلوم..... کیا کھا پی کر گئے ہیں۔" وہ قدرے پریشان ہوئی۔ شوہر اور بچوں کے

کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط رہتی تھی۔

کچن میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ٹوسٹ' جیم' شہد' مکھن اور دودھ کے خالی گلاس۔ سینڈوچ میکر کا سوئچ ابھی بورڈ میں لگا ہوا تھا۔ سینڈوچز کے لیے آمیزہ وہ رات کو تیار کر کے فریج میں رکھا کرتی تھی۔

"گویا سب کام معمول کے مطابق ہوگئے اور میں پڑی سوتی رہی۔" اسے شدت سے اپنے نکمے پن کا احساس ہوا۔

"محب نجانے رات کس وقت سوئے ہوں گے' صبح بھی مجھ سے پہلے اٹھ گئے۔ پتا نہیں کیسے سب کام نمٹایا۔ یا اللہ! کس نیکی کا اعجاز ہے یہ شخص۔ ایسا پیارا' ایسا محبت بھرا دل۔ تو نے میری اوقات سے بڑھ کر مجھے نوازا ہے پروردگار۔" اس کا دل تشکر کے جذبات سے بوجھل ہونے لگا۔

نجانے کتنی دیر وہیں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اپنا اور بڑی اماں کا ناشتہ بنانے لگی۔ وہ قدرے دیر سے ہی اٹھتی تھیں' اسی لیے وہ اطمینان سے لگی رہی۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بڑی بھابی رات والا خالی پیالہ دینے آئی تھیں۔

"اسعان کا گلا پہلے ہی خراب تھا۔ رات' آئس کریم کھا کر تو بالکل ہی بند ہوگیا ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص ترش لہجے میں آتے ہی اطلاع دی۔

"اچھا..... مجھے تو خبر ہی نہ تھی بھابی! لیکن اگر گلا خراب تھا تو آپ اسے آئس کریم نہ کھلاتیں' وہ تو حمزہ اور اجالا کھا رہے تھے' تو میں نے سوچا۔"

"یہی تو کہنے آئی ہوں۔ وقت بے وقت ایسی چیزیں مت بھجوایا کرو' بچہ ہے' دیکھ کر مچل جاتا ہے اور یوں بھی میں نے کوئی کمی تو نہیں رکھی۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں بھابی! مجھے معلوم ہے آپ اس کا بہت خیال رکھتی ہیں اور پھر اب تو وہ آپ ہی کا ہے جس حال میں بھی رکھیں' ہمیں اس سے کیا غرض۔ میں نے تو بس یونہی۔"

وہ مدھم آواز میں صفائی پیش کرنے لگی مگر بڑی بھابی ہمیشہ کی طرح جلدی میں تھیں۔ وہ صرف سنانے آئی تھیں' سننے نہیں۔ خون کی گردش رگوں میں تیز ہوگئی تھی۔ وہ اور زور زور سے انڈے پھینٹنے لگی۔



چھوٹی نند' گلشن کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ وہ محب کے ساتھ گفٹ لانے کا پروگرام بنا رہی تھی' جب خیال آیا۔ بچوں کے سردیوں کے کپڑے خریدنے ہیں' بدلتے موسم کی اور بے شمار چیزیں۔ سوئٹر' ٹوپیاں' موزے' اپنے لیے شال اور بڑی اماں کے دو چار گرم سوٹ۔ محب جو اس کے ساتھ

جانے کے لیے تیار کھڑا تھا' اتنا لمبا چوڑا پروگرام سن کر وہیں بیڈ پر ڈھے گیا۔

"نہیں یار! اتنی لمبی خریداری کا بالکل موڈ نہیں۔ تم بچوں کے ساتھ ہو آؤ۔" گاڑی کی چابی اس کی طرف اچھال کر وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی محب! آپ میرے ساتھ جا رہے تھے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ جواباً اس نے تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کی منتظر رہی پھر پرس اٹھا کر باہر نکل آئی۔

"جا رہی ہوں میں' دیر ہو گئی تو پھر مت کہیے گا۔" باآواز بلند کہتی وہ بھابی کے پورشن کی طرف آ گئی۔ یہاں بچیاں خوب رونق لگائے رکھتی تھیں' لہٰذا فارغ وقت میں حمزہ اور اجالا ادھر بھاگے آتے تھے۔ اب بھی انہیں بلانے کے لیے آئی تھی۔ صباحت نے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں دیکھی تو فوراً پوچھ بیٹھی۔

"چاچی! کہیں جا رہی ہیں کیا؟"

"ہاں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں' چلو گی؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ابھی آ رہی ہوں۔" وہ چٹکی بجاتی اندر کی طرف بھاگی۔ صباحت' بھابی کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ حال ہی میں میڈیکل میں ایڈمیشن لیا تھا۔ کافی پراعتماد مگر اکھڑ مزاج کی تھی۔ چھوٹی بہنوں پر اچھا خاصا رعب تھا' اس کی وجہ سے عفیفہ کو خاصا اطمینان ہو گیا کہ واپسی پر دیر بھی ہو جاتی تو بہر حال وہ تنہا تو نہ ہوتی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی کچھ دیر انتظار کرتی رہی۔ صباحت آئی تو اسعان بھی ساتھ ہی تھا۔ پچھلی سیٹ پر حمزہ اور اجالا کے ساتھ بیٹھا وہ کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔

بازار میں مختلف چیزوں کی خریداری کرتے ہوئے حمزہ اور اجالا نے اچھا خاصا شور مچایا ہوا تھا۔

"یہ چیز پسند نہیں' فلاں اچھی ہے' یہ کیوں لے رہی ہیں؟" ہر چیز پر بڑھ چڑھ کر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے صباحت کو اچھا خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ عفیفہ عادی تھی اس چیز کی' سو تھوڑا ان کی پسند کا لیا' تھوڑا اپنی مرضی کا۔ اسعان اس دوران چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ بے شمار خوبصورت چیزوں پر سے پھسلتی ہوئی اس کی خاموش نگاہیں صباحت کے چہرے پر جا کر ایک لمحے کے لیے ٹھہرتیں اور پھر پلٹ کر شیشے سے باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگتیں۔

حمزہ اور اجالا کے لیے چیزیں خریدتے ہوئے اس کا بارہا دل چاہا' اسعان کے لیے بھی یہ سب خریدے۔ بہت دیر تک خود پر جبر کیے رہنے کے بعد اس نے صباحت کو صرف اور صرف اپنے کپڑوں لتّوں میں الجھے دیکھا تو پھر رہ نہ سکی۔ بچوں کی ریڈی میڈ ملبوسات کی دکان پر حمزہ اور اجالا کے لیے سوٹ لیتے ہوئے اس نے دو سوٹ صباحت سے اسعان کے لیے پسند کروائے تھے۔ خود اسعان کی ساری توجہ کھلونوں کی طرف تھی۔ ایک بڑا سا بھالو اسے دلوا کر وہ کپڑوں کی دکان میں

تھمیں تو عفیفہ نے ایک سوٹ بھابی کی چھوٹی بیٹی مہک کے لیے بھی خرید لیا تا کہ اسعان کے لیے خریدی گئی چیزوں کو بھابی آسانی سے ہضم کر سکیں۔

اس کی شاپنگ مکمل ہو چکی تھی۔ صباحت ابھی تک کپڑوں کے ڈیزائن اور رنگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کون سا لوں' کون سا نہ لوں۔ کبھی ایک سوٹ پر ہاتھ دھرتی' کبھی دوسرا تھان نکلوا لیتی۔ حمزہ اور اجالا بھی بیزار ہو چکے تھے۔

"آپی! یہ لے لیں۔" وہ بڑے صبر سے بیٹھی صباحت کو اس کی "چوائس" خریدنے کا موقع دے رہی تھی۔ جب اچانک ہی اسعان کے گلابی ہاتھوں کی نرم پوروں نے ایک کپڑے کو چھوا۔

"آپی! یہ اچھا ہے' یہ والا لیں۔" وہ اصرار کر رہا تھا۔ صباحت اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پسند کا کپڑا کٹوانے لگی تھی' جبکہ عفیفہ کی نگاہیں اس کپڑے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ گہرے سبز رنگ کا سوٹ تھا جس کے صرف دوپٹے پر انتہائی خوبصورت اورنج کلر کا بارڈر بنا ہوا تھا۔

"یہ سوٹ کتنے کا ہے۔" اس نے بے اختیار ہی اس کپڑے پر ہاتھ رکھا۔ اسعان نے اپنی آنکھوں میں بے تحاشا حیرت سموتے ہوئے عفیفہ کی جانب دیکھا اور اسے اپنی طرف متوجہ پا کر جھینپتے ہوئے بے اختیار ہی صباحت کی اوٹ میں ہو گیا۔

ان کی واپسی اس وقت ہوئی تھی جب دکانوں کے سامنے لگے نیون سائن جگمگانے لگے تھے۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں مناسب رفتار سے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی' نہ جانے محب کا موڈ اس وقت کیسا ہو گا۔

شام کی چائے نہ ملے تو وہ اکثر بدمزاجی کا مظاہرہ کرنے لگتا تھا' بقول محب کے۔

"شام کی چائے میرا شوق نہیں' میری ضرورت ہے۔"

گھر میں داخل ہوئی تو ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔ صباحت اور اسعان اپنی اپنی شاپنگ سنبھالے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔

"لگتا ہے موصوف' آوارہ گردی کے لیے نکل گئے ہیں۔" گاڑی لاک کرتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر سارے گھر کی ٹیوب لائٹس آن کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ رات کے وقت گھر میں پھیلے اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی اسے۔ لہٰذا اکثر ہی غیر ضروری لائٹس جلانے پر محب سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔

لاؤنج میں ٹی وی لگا کر' بچوں کو بٹھا کر شاپرز سنبھالتی وہ بیڈ روم میں آئی تو روشنی کرتے ہی بیڈ پر آڑے ترچھے لیٹے محب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یوں بے وقت تو وہ کبھی نہ سویا تھا۔ وہ بے اختیار پکارتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے پریشانی کے عالم میں اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ خمار آلود آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں بھئی! آئی ایم رائٹ۔" سستی سے کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔

"ارے تو پھر اٹھیے نا' یوں کیوں لیٹے ہوئے ہیں اب تک۔ میرا تو دل دہلا کر رکھ دیا آپ نے۔" اس نے شاپرز صوفے پہ ڈھیر کیے اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ بازار سے لایا ہوا پزا اوون میں گرم کرنے کو رکھا اور چائے بنانے لگی۔

ٹی وی کی بلند آواز اور حمزہ' اجالا کی کھلکھلاہٹوں نے سوئے سوئے ماحول میں جان ڈال دی تھی۔ بڑی اماں کل سے اپنے بھائی کے ہاں گئی تھیں' اس لیے فی الحال رات کے کھانے کی پروا کیے بغیر اس نے صرف چائے ہی تیار کی تھی۔

حمزہ اور اجالا کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ شور یہاں تک آ رہا تھا۔

"حمزہ!" محب کی آواز بیڈ روم سے سفر کرتی لاؤنج تک پہنچی تھی۔ اگلے پل ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ وہ زیر لب مسکراتی لاؤنج میں پہنچی تو دونوں اپنی اپنی جگہ پر دبکے ہوئے تھے۔ گفتگو ساری کی ساری سرگوشیوں اور اشاروں میں ہو رہی تھی۔ تب ہی محب چلا آیا تھا۔ بے وقت سونے سے طبیعت میں بے زاری سی در آئی تھی۔

"کب آئے تم لوگ؟" ڈھیلے سے انداز میں پوچھتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھا تو جھٹ سے اجالا اس کی گود میں سوار ہو گئی۔ اس کی بولتی شروع ہو جائے تو پھر بند ہونی ناممکن۔ چڑیا کی چوں چوں' کوئل کی کوکو..... بلبل کی چہکاریں..... سب اس کے سامنے مات..... باپ کے قہقہے گونجنے لگے تھے۔ بیزاری' سستی سب غائب۔ چائے' پزا اڑا کر وہ لوگ اپنی مستیوں میں لگ گئے' رات کے کھانے کے لیے محب نے منع کر دیا۔

"چلو چھٹی ہوئی۔" وہ ہاتھ جھاڑتی ان سب کو ان کے حال پر چھوڑ کر بیڈ روم میں آ گئی۔ کچھ دیر یونہی آرام کیا' محب نہانے کے لیے گیا تو وہ بچوں کو ان کے کمرے میں لے آئی۔ ان کا ہوم ورک چیک کیا' بیگ تیار کروائے' سلایا۔ دوبارہ بیڈ روم میں آئی تو محب فون پر اماں کی خیریت معلوم کر رہا تھا۔ کافی طویل گفتگو تھی۔ یوں جیسے برسوں سے بچھڑے ہوں۔ وہ بچوں کے کپڑے پریس کر چکی' تب اس نے ریسیور رکھ دیا۔ نہا دھو کر خاصا فریش لگ رہا تھا۔

"بھوک لگ گئی ہے۔"

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں بنایا۔" اس نے چہرے پہ بہت سی تھکن طاری کی۔

"نہیں بنایا تو اب بنا لیتے ہیں۔" وہ کچن میں آیا تو اسے مجبوراً پیچھے آنا پڑا۔

"آٹا گوندھ رکھا ہے' چپاتی ڈال دوں۔"

"اونہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بچے یونہی سو گئے کیا؟" اسے فوراً ہی یاد آ گیا۔

"حمزہ نے پھل کھا لیے تھے' اجالا نے دودھ بھی مشکل سے پیا ہے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے بھنا ہوا قیمہ اور توس نکال کر اس کے سامنے رکھے اور خود چائے کا پانی رکھنے لگی۔

رات گئے ڈھیر ساری کیچپ کے ساتھ سینڈوچ کھاتے اور گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ اسے اپنی ساری شاپنگ دکھانے لگی تھی۔

"یہ کس کا ہے؟" محب نے سبز سوٹ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"میرا۔" اس نے بڑے ناز سے بتایا۔

"اور یہ کس کے لیے۔" اسی کے ساتھ کا دوسرا سوٹ نکال کر پوچھا۔

"یہ بھی میرا۔"

"ہوں..... اور یہ.....؟" وہ استفہامیہ نگاہوں سے اسی کے ساتھ کا تیسرا سوٹ ہاتھ میں لیے پوچھ رہا تھا۔

"یہ بھی میرا۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اعتراف یوں کیا' گویا کسی جرم کا اقرار کر رہی ہو۔

"ایک ہی جیسے تین سوٹ' کیا ہو گیا ہے بھئی!" وہ حیران تھا۔

عفیفہ نے فوراً سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں نجانے کیوں نمی سی اتر آئی تھی۔

"یہ سوٹ اسعان نے پسند کیا تھا۔ صباحت سے لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا دل لینے کا نہیں مانا اور میرا دل چھوڑنے پر راضی نہ ہوا..... ایک سوٹ پر دل نہیں ٹھہرا..... تین لے لیے..... پھر دوسرا..... پھر تیسرا..... اس دوران شاید پھر بھی اسعان کسی کپڑے پر اپنا ہاتھ رکھ دے....." وہ ملائمت سے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا اسعان کے لمس کو محسوس کر رہی تھی۔

محب کی نگاہیں اس پر سے ہٹ کر سامنے دیوار پر جا ٹکی تھیں اور کبھی کبھار یونہی نجانے کیوں وہ کسی ہلکے سے پچھتاوے کا شکار ہونے لگتا تھا۔

خاندان کا ہر فنکشن بے حد ہنگامہ لیے ہوئے ہوتا تھا پھر یہ تو گلشن کے اکلوتے بیٹے کی خوشی کا معاملہ تھا۔ ہر کوئی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ منجھلی نند ربیعہ کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ بڑی ڈاکٹر تھی' اس سے چھوٹی اپنے ڈیزائن کردہ ملبوسات سیل کرتی تھی' گھر کے ہی ایک حصے میں بوتیک اور بیوٹی پارلر کا کام چلا رہی تھی۔ باپ سر پہ نہیں تھا مگر ان پر عزم لڑکیوں نے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی باپ کی

کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ آرائشی ذوق تو ان میں کمال کا تھا۔ پانچوں نے مل کر چند گھنٹوں میں ایسا گھر سجایا کہ ہر کوئی مدح سرائی کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

وہ اور بڑی بھابی گاڑیوں میں آگے پیچھے ہی گھر سے نکلے تھے۔ بڑی بھابی کی گاڑی میں گنجائش کم تھی' لہٰذا کچھ افراد ان کی گاڑی میں سوار ہوئے' یوں ٹھنس ٹھنسا کر وہ لوگ گلشن کے گھر پہنچے تو رونق اپنے عروج پر تھی۔ عادل اور بختیار مائیک تھامے اپنی گلوکاری کا شوق آزما رہے تھے۔ لڑکیاں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے برے برے منہ بنا رہی تھیں۔ وہ لوگ بھی جاتے ہی اس خوشگوار ماحول کا حصہ بن گئے۔

لطیفے' چٹکلے' ہنسی' قہقہے..... اوٹ پٹانگ اشعار..... اچھے خاصے جوکر موجود تھے جو ہر چہرے پر جھلملا کر اسے حسین تر بنا رہے تھے۔ حمزہ اپنے کزنز کے ساتھ مصروف تھا' اجالا پھوپھیوں کی پیاری تھی۔ کبھی ایک کی گود میں سوار' کبھی دوسری کی۔

ربیعہ کی دونوں بیٹیاں عفیفہ سے کچھ ہی چھوٹی تھیں' ڈاکٹر لیلیٰ تو تقریباً ہم عمر تھی۔ ان دونوں سے عفیفہ کی خوب دوستی تھی' بلکہ زونیرہ اکثر کہا کرتی تھی۔

''آپ کو تو مامی کہتے ہوئے شرم آتی ہے' حمزہ اور اجالا آپ کی گود میں نہ ہوں تو میں آپ سے کچھ بڑی ہی لگتی ہوں۔''

اس کی ایسی بے تکی باتوں پر مسکراتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھائی تو اسعان کو اپنی طرف متوجہ پا کر قدرے چونک سی گئی۔ وہ کچھ دور حمزہ وغیرہ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا' مگر ان کے کھیل یا ان کی باتوں میں ہرگز شریک نہیں تھا۔ اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی مگر باقی تقریب میں اسے اپنے آس پاس ہی محسوس کرتی رہی۔ تب وہاں سے اٹھنے سے کچھ دیر قبل اس نے اشارتاً اسے اپنی طرف بلایا۔

''چاچی! یہ وہی سوٹ ہے نا۔'' ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد وہ فوراً ہی اصل بات کی طرف پلٹ آیا۔

''ہاں..... وہی جو آپ نے پسند کیا تھا۔'' اس کے جواب دینے پر وہ کچھ نہیں بولا۔ بس سر جھکا کر مسکرانے لگا تھا۔

''میں نے آپ کے لیے بھی کچھ کپڑے لیے تھے' آپ نے وہ پہن کر دکھائے ہی نہیں۔'' اس نے یونہی اسے چھیڑا۔

''مما کہہ رہی تھیں.....'' جوگرز کے تسمے کھولتے ہوئے وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوا۔

''ان کے کلرز اچھے نہیں ہیں' انہوں نے مجھے یہ والا سوٹ لے کر دیا ہے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر

بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھا لگ رہا ہے' بالکل شہزادے لگ رہے ہو اس بلیو کلر میں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا' پھر جھک کر اس کے کھلے تسمے ڈھنگ سے باندھے۔

''چلو بھاگ جاؤ اب..... حمزہ بلا رہا ہے.....'' اس نے اسعان کی پیٹھ تھپکی اور خود ایک چیئر سنبھال لی۔ معلوم نہیں کیوں سارے ماحول پہ ہلکا سا غبار چھا گیا تھا۔ سپید سی دھند میں لپٹی روشنیاں اور چہرے' اس نے سر جھکا کر آنکھیں زور سے مسل ڈالیں۔

مہنگائی کے اس دور میں سات بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کچھ ایسا آسان کام نہ تھا۔ بڑے بھیا فکر معاش میں پچھلے برس سعودیہ جا بیٹھے تھے پھر بھی حمزہ اور اجالا' اسعان سے کہیں بہتر ماحول میں ہی پرورش پا رہے تھے۔

اگر میں نے اسعان کے لیے کچھ کیا تھا تو اسے ماں کی حیثیت سے نہ سہی' چاچی کے رشتے سے تو تسلیم کیا جا سکتا تھا نا۔ ویسے ہی جیسے مہک اس کا دیا ہوا سوٹ اب اکثر گھر میں پہنے پھرتی تھی۔

رات رفتہ رفتہ بھیگ رہی تھی۔ نم آلود سرد ہوا نے اس کے بدن کو چھوا تو وہ بے اختیار کپکپا سی گئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو احساس ہوا وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہے۔ دل میں انگڑائیاں لیتی اداس کیفیت سے پیچھا چھڑاتی وہ باقی سب لوگوں کے درمیان جا بیٹھی تھی۔

آٹھ بجے کیک کٹا' بارہ بجے تک خوش گپیوں میں مصروف رہنے کے بعد وہ لوگ اٹھ گئے تھے۔ بچے رات گئے تک ایسی دعوتیں اڑانے کے عادی تھے' لہٰذا ابھی تک شرارتوں میں مصروف' چیخ وپکار میں محو تھے بڑی بھابی نے حسب عادت گم صم ہو کر یہ وقت گزارا تھا۔ بارہ بجتے ہی ان کے اشارے پر سب بچیاں بھاگ کر گاڑی میں جا بیٹھیں۔

الیشبہ اور اریبہ ان لوگوں کے ساتھ تھیں۔ محبّ نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی جب لیلیٰ اور زونیرہ' ماموں کو آوازیں لگاتی اندھا دھند بھاگی چلی آئیں۔ لیلیٰ تو آتے ہی الیشبہ اور اریبہ کی گود میں سوار ہو گئی۔ زونیرہ بے قرار ہو کر چلا رہی تھی۔

''ڈگی میں جگہ ملے گی کہ چھت پہ چڑھ جاؤں۔''

معلوم ہوا ربیعہ باجی کا گلشن کے ہاں ٹھہرنے کا پروگرام بن گیا۔ وہاں ان دونوں کا ہم عمر کون تھا' لہٰذا فوراً ہی عفیفہ کے ساتھ جانے کا ارادہ کر ڈالا۔

عفیفہ نے حمزہ اور اجالا کے ساتھ اسے بھی اگلی سیٹ میں ہی پھنسا لیا۔ راستے بھر ان دونوں کی آہ و بکا نے مسکراہٹ ہونٹوں سے جدا نہ ہونے دی۔ گھر میں اترے تو اجالا تقریباً سو رہی تھی۔ اسے

محبت کے سپرد کر کے وہ الیشبہ اور اریبہ کو ان کے پورشن میں پہنچا کر آئی۔ دروازے وغیرہ لاک کیے۔ کمرے میں آئی تو حمزہ ابھی تک ان دونوں کے ساتھ مسخریوں میں لگا ہوا تھا۔ اسے زبردستی بڑ روم میں محبت کے پاس پہنچایا۔

''اسے سنبھالیں آپ! ہم لوگ دوسرے کمرے میں سوئیں گے۔'' اس نے کہا تھا مگر لیلیٰ اور زونیرہ کی موجودگی میں ایسے پروگرام کب پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے تھے۔ کیبل پر مختلف چینل بدلتے' کپڑوں کی ڈیزائننگ پر تبصرہ' خاندانی معاملات پر اظہار رائے کرتے ان کو خبر نہ ہوئی' کب رات بیت گئی۔ عفیفہ کے ڈرانے' دھمکانے اور پھر منت سماجت کے بعد وہ لوگ اس وقت سونے کے لیے لیٹی تھیں جب محبت فجر کی نماز کے لیے اٹھا تھا۔ اگلے دن چھٹی تھی' لہٰذا سب ہی دن چڑھے تک سوئے رہے۔ سوائے لیلیٰ کے جس نے آٹھ بجتے ہی شور مچا مچا کر ماموں کو ساتھ لیا اور ہاسپٹل ڈیوٹی دینے جا پہنچی تھی۔



صبح کا وقت تھا' خاصا عجلت بھرا۔ محبت کے سامنے آملیٹ کی پلیٹ رکھ کر وہ اجالا کے لیے انڈا پھینٹنے لگی۔ ساتھ ساتھ حمزہ کو ڈانٹ رہی تھی جو ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنا ہاتھ بھی خراب کر رہا تھا۔ محبت ناشتے کے ساتھ اخبار بھی ہضم کر رہا تھا۔

زیادہ تر اہم خبریں وہ اسی وقت محبت کی زبانی سنا کرتی تھی۔ بچوں کے لنچ کے لئے عموماً وہ سینڈوچ یا فرنچ فرائز بنایا کرتی تھی مگر کل محبت کا موڈ کسی بات پر خراب تھا' سو نہ قیمہ آیا' نہ سبزی وغیرہ۔ چکن موجود تھا' اس پر حمزہ اور اجالا کی فرمائش۔ اسی وقت مسالہ لگا کر رکھ دیا اور اب بہت مزے کی خوشبو سارے کچن میں پھیل رہی تھی۔

''چاچی!'' مخصوص انداز' مانوس آواز' وہ فوراً پلٹی۔

''ارے....! خوشگوار حیرت میں گھر کر اس نے کھٹ سے چولہے کی ناب گھما کر چولہا بند کر دیا۔

اسکول کے مکمل یونیفارم میں وہ نکھرا ستھرا سا کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''اسعان! تم اسکول جا رہے ہو؟''

''جی' آج پہلا دن ہے۔''

''واؤ' بوائے! یو آر لکنگ ویری اسمارٹ۔'' محبت نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''اسعان! تم نے میرے اسکول میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟'' حمزہ کو افسوس ہوا تھا' اسے

بالکل مختلف یونیفارم میں دیکھ کر۔

''مما کہتی ہیں' مہک والا اسکول زیادہ بہتر ہے۔''

''مما بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ جانو! آج پہلا دن ہے اسکول میں' خوب انجوائے کرنا۔''

اس نے حمزہ اور اجالا کے لنچ باکسز تیار کر کے انہیں تھمائے تو اسعان سے بھی اس کا لنچ باکس لے لیا۔ سنکے ہوئے توس اور فرائی انڈے کو ایک طرف کر کے جگہ بناتے ہوئے اس نے تلا ہوا چکن پیس باکس میں بھرا اور واپس اس کے بیگ میں رکھ دیا۔

''ارے عفیفہ! کیمرے میں کچھ تصویریں ہیں نا؟'' محبت کو ایک دم یاد آیا۔ وہ بھاگ کر کیمرہ لے آئی۔ صباحت' اسعان کو لینے کے لیے آئی تھی۔ اس کی وین آ گئی تھی۔ سب لوگ بھاگم بھاگ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اسعان کو صوفے کے درمیان بٹھایا' اس کے دائیں طرف اجالا اور محبت تھے' بائیں طرف حمزہ اور عفیفہ۔ صباحت کی انگلی کی ہلکی سے جنبش نے زندگی کے بے حد قیمتی لمحے کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیا تھا۔

صباحت' اسعان کو لے کر چلی گئی۔ محبت' حمزہ اور اجالا کو لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ سرشار سی ہو کر ناشتہ کرنے لگی۔ ماسی کے آنے میں کچھ وقت تھا' وہ بڑی اماں کے کمرے میں آ گئی۔ انہیں واپس آنا تھا' سو وہ ان کا کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔ اس کی ساس بھی اپنا ہی ایک مزاج رکھتی تھیں۔ ان کے سونے جاگنے' کھانے کے اپنے اوقات تھے۔ بعض دفعہ سارا گھر کھانے سے فارغ ہو چکا ہوتا' تب انہیں بھوک لگتی تھی اور کبھی کھانے کی تیاری سے قبل ہی وہ آوازیں دینے لگتی تھیں۔ اچھی خاصی صحت مند' رعب دار خاتون تھیں۔ ادب سے خصوصی لگاؤ تھا' کلاسیکی شعراء کا کلام پسند کرتی تھیں اور خاصی کتب جمع کر رکھی تھیں۔ چائے کی بے حد شوقین تھیں۔ رات بارہ بجے بھی طلب محسوس ہوتی تو اس کا دروازہ کھٹکھٹانے سے باز نہ آتی تھیں۔ اپنے کمرے تک محدود رہنے کے باوجود ان کی نظر گھر کے تمام معاملات پر رہتی تھی۔ کس طرح....؟ اس کا علم عفیفہ کو آج تک نہ ہو سکا تھا۔

اپنی بیٹیوں سے متعلقہ معاملات میں وہ خاص طور پر حساس تھیں۔ ہر خوشی و غم میں شرکت لازم تھی۔ خود جا سکیں یا نہیں' عفیفہ کو بطور نمائندہ ضرور بھجواتی تھیں بلکہ ان کے جانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ عموماً تو چاروں نندوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے بال بچوں سمیت یہیں موجود ہوتی تھی۔ بڑی بہو کا سرد رویہ انہیں ایسی مہمان داریوں سے دور ہی رکھتا تھا۔ لے دے کر خاطر تواضع کے لیے ایک وہی بچ جاتی تھی۔ نہایت خوش دلی سے یہ تعلق داریاں نبھاتے نبھاتے زندگی میں اور کچھ اس نے سیکھا ہو یا نہیں' سسرال والوں کو خوش رکھنا ضرور سیکھ لیا تھا۔

○ ○ ○

عفیفہ کے بہنوئی کسی کام کے سلسلے میں ان کی کالونی میں آئے تھے۔ جاتے ہوئے اجالا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

"صبح اسکول ٹائم سے پہلے چھوڑ جاؤں گا۔" وہ بڑے آرام سے کہہ گئے تھے اور ان کے ہاں یہ معمول چلتا ہی رہتا تھا۔ نھیال' ددھیال سے لے کر میکے اور سسرال کے تمام رشتے اسی ایک شہر میں موجود تھے۔ گھڑی گھڑی کا آنا جانا تھا۔ کوئی اس فیملی سے آ رہا ہے تو کوئی جا رہا ہے پھر اتنے قریبی رشتوں کی موجودگی میں خاندان سے باہر دوستیاں گانٹھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ محلے داروں سے تعلقات بس علیک سلیک کی حد تک قائم تھے اور اس سے زیادہ کی ان لوگوں کو نہ خواہش محسوس ہوتی تھی' نہ ضرورت۔

حمزہ' اسکول سے آنے کے بعد سو رہا تھا' محبّ اماں کے کمرے میں تھا۔ اس نے کچھ وقت کے لیے خود کو آزاد محسوس کیا تو پچھلے برآمدے میں چلی آئی۔ فرصت کی یہ گھڑیاں بس کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی تھیں۔ جب وہ ہر ذمہ داری سے الگ ہو کر صرف خود سے ملتی تھی' اپنی باتیں کرتی تھی' اپنے لیے سوچتی تھی' ورنہ تو کبھی وہ گھبرا کر محبّ سے الجھ پڑتی تھی۔

"یہ کیسی زندگی ہے' مجھے لگتا ہے میرے پاؤں میں پہیے لگ گئے ہیں اور میں بس بھاگی پھر رہی ہوں' ادھر سے اُدھر' یہاں سے وہاں۔"

"ٹھہرے پانی سے بدبو آنے لگتی ہے۔ خدا کا شکر کرو' زندگی کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے قابل ہو' گرم دم جستجو' ہر دم رواں ہے زندگی اور کیا چاہیے۔" وہ بڑے آرام سے سمجھانے لگتا۔

"ہاں' وہ سب ٹھیک ہے لیکن یہ تنہائی' اس کا اپنا ایک نشہ ہے۔" زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لے کر خوشبودار ہوا کو اپنے اندر اتارا۔ شام ڈھل رہی تھی' سامنے بھابی کے پورشن سے بچیوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے دائیں بائیں جھولتے ہوئے ہولے ہولے گنگنانے لگی۔ تب ہی اسعان نے لاؤنج کا دروازہ کھولا اور درمیانی لان عبور کرتے ہوئے اس کی طرف بھاگ آیا۔

وہ اسے آتا دیکھ کر ایکدم خاموش ہو گئی۔ چھوٹی بھابی کے جانے کے بعد بڑی بھابی اس پورشن میں شفٹ ہوئی تھیں۔ اسے یاد تھا' اسعان کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر وہ دن میں کئی بار یہ لان عبور کرتی تھی' کبھی سب کے سامنے' کبھی چوری چھپے۔

اور جب سے اسعان بڑا ہوا تھا' اس کی یہ مشکل بھی آسان ہو گئی تھی۔ کبھی کسی کام کے لیے اور کبھی یونہی گھڑی بھر کے لیے اسعان ادھر کا چکر لگا ہی لیا کرتا تھا۔

اب بھی وہ ہاتھوں میں کوئی سفید سی چیز دبوچے بھاگ کر اس کے نزدیک آ گیا تھا۔

پرجوش انداز' شدت جذبات سے تمتماتا ہوا چہرہ' بھنچے ہوئے ہونٹ..... آنکھوں کی بے تحاشا چمک' اندرونی خوشی کا پتا دے رہی تھی۔

"چاچی! یہ دیکھیں۔" اس نے آتے ہی دونوں ہاتھ اس کے سامنے کیے۔ بے حد خوبصورت سفید رنگ کی کبوتری اس نے اپنی انگلیوں میں تقریباً جکڑی ہوئی تھی۔

"ارے.... رے.... آرام سے.... اتنی سختی سے پکڑنے پر تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔" اس نے فوراً وہ کبوتری اس کے ہاتھوں سے نکال لی۔

"کہاں سے ملی؟" وہ پرشوق نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"آم کے درخت کے پاس گری ہوئی تھی۔ صباحت باجی کہہ رہی تھیں' بھوکی پیاسی ہے۔ ہم نے دانہ کھلایا..... پانی پلایا..... اُڑنے کو تیار تھی' باجی نے پر کاٹ دیے۔ اب یہ میری ہو گئی ہے' اسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔" وہ بڑے تفاخر سے بتا رہا تھا۔

"کہاں رکھو گے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"بلی کھا گئی تو....؟"

"بلی کبوتر کھا لیتی ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"بڑے شوق سے۔" اس کے جواب پر اسعان کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں تشویش' چہرے پر اضطراب۔

"اسٹور میں ایک پرانا پنجرہ پڑا ہے' میں آپ کو وہ نکال کر دوں گی۔" اس نے فوراً اس کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

"اگر بلی پنجرہ بھی کھا گئی تو....؟" اس کے سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"او پیارے لڑکے! بلی لوہا نہیں کھا سکتی۔ اچھا یہ بتاؤ.... اس کا نام کیا رکھو گے؟" اس نے شرمندہ ہوتے دیکھ کر اس نے فوراً بات بدل ڈالی۔

"جگنو۔"

اس نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا۔ گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو بڑی آپا اس سے ملنے آئی تھیں۔ انہوں نے حسب عادت اسے "جگنو" کہہ کر پکارا تھا کہ میکے میں اسے اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ سسرال میں البتہ محبّ نے اس کا یہ نک نیم مشہور نہیں ہونے دیا تھا۔

اسعان بھی اس وقت یہاں موجود تھا' بعد میں حیران ہو کر پوچھتا رہا۔

''آنٹی نے آپ کو ''جگنو'' کیوں کہا؟''

''میرے ابا کہتے تھے۔ میری بیٹی کی آنکھیں جگنو کی طرح چمکتی ہیں..... تب سے اماں مجھے ''جگنو'' کہہ کر پکارنے لگیں۔ آپ کے چاچو کو یہ نام پسند نہیں' اس لیے یہاں وہ کسی کو میرا نک نیم نہیں لینے دیتے۔''

اور اس بات پر وہ قدرے حیران بھی ہوا تھا۔

''نہیں'' ''جگنو'' تو اچھا نام ہے۔''

اور آج وہ کہہ رہا تھا۔

''میں اس کا نام ''جگنو'' رکھوں گا۔''

یہ بات سن کر وہ چونکی تھی اور اس سے بڑھ کر بڑی بھابی..... جو اماں سے ملنے کے لیے آئی تھیں اور ان دونوں کو سر جوڑے دیکھ کر چند قدم پیچھے ہی رک گئی تھیں۔

''تم اس کا نام ''جگنو'' رکھو گے۔'' اس کے محسوسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

اور ابھی وہ کوئی جواب بھی نہ دے پایا تھا جب کسی نے ایکدم اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔

عفیفہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ بڑی بھابی کی سرد' کاٹ دار نظر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف اٹھی تھی۔

''میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور آپ.....'' الفاظ معمولی تھے مگر لہجہ اور گرفت۔

اسعان کے سہمے ہوئے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے تو اس نے لب بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''یا اللہ! یہ عورت.....'' اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

''کیسا خوف بھرا ہے اس کے دل میں..... کیسا ڈر ہے..... جو یہ اسعان کو ایک پل کے لیے میری محبت کے سائے میں پناہ نہیں لینے دیتی۔''

وہ تخت سے نیچے اتر آئی۔ راہداری کا دروازہ ایک چر چراہٹ کے ساتھ کھولا اور اپنے عقب میں ایک دھماکے سے بند ہونے کے لیے اسے یونہی چھوڑ کر آگے بڑھ آئی۔

''وہ جانتی ہیں' ممتا میں بہت کشش ہوتی ہے۔

اسعان کے چھن جانے کا وہم ان کے کٹھور دل کو نرم نہیں ہونے دیتا۔''

اس نے پلکیں جھپک کر اپنے سارے آنسو اندر اتار لیے۔ سفید کبوتری ابھی تک اس

کے ہاتھوں پر پھڑ پھڑا کر آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اسٹور میں جا کر بہت سا سامان ادھر ادھر ہٹا کر پنجرہ ڈھونڈا۔ چھوٹی بھابی کے عادل کو کسی زمانے میں طوطا پالنے کا شوق ہوتا تھا' بعد میں طوطا مر گیا اور پنجرہ خالی ہو کر اسٹور میں جا پہنچا۔

پنجرے کو دھو کر صاف ستھرا کر کے دانہ پانی ڈال کر اس نے کبوتری کو اندر چھوڑ دیا۔ ایک ڈیڑھ دن انتظار کیا' اسعان نہیں آیا تو حمزہ کے ہاتھ پنجرہ ادھر بھجوا دیا۔

حمزہ بضد تھا' کبوتر رکھنے کے لیے مگر اس نے ڈانٹ دیا۔

''یہ اسعان کا ہے' تم اور لے لینا۔''

کچھ دیر بعد حمزہ چھلانگیں لگاتا بھاگا آیا تھا' پنجرہ ہاتھ میں تھا۔

عفیفہ کو اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''تائی نے کہا ہے' کبوتر پالے گا تو پڑھے گا کیسے۔ سارا وقت اسی کی طرف دھیان لگا رہے گا' انہوں نے پنجرا واپس کر دیا ہے۔''

گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا تھا' وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

مسرت بھری دو آنکھیں اس کے سامنے چکرانے لگیں۔

''یہ آپ اچھا نہیں کر رہیں بھابی! یہ ظلم ہے اس معصوم پر۔'' وہ سر جھکائے بے آواز آنسو بہانے لگی تھی۔

اگلے دو روز تک اسعان نہیں آیا تھا' تیسرے روز اس نے لان عبور کرتے دیکھا تو بیڈ روم کی کھڑکی میں رکھے پنجرے کو بھاگ کر باتھ روم میں چھپا آئی۔

''خوامخواہ اس کا دل برا ہو گا۔'' وہ جانتی تھی' بڑی بھابی اب بھی اسے یہ پرندہ رکھنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ اسعان برآمدے میں بیٹھ کر ہوم ورک کرتے حمزہ اور اجالا سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی۔ ادھر ادھر کے چھوٹے چھوٹے کام نمٹاتی رہی' کچھ دیر بعد اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔

اسعان جا چکا تھا۔

وہ ایکدم طویل سانس لے کر رہ گئی۔ وہ سامنے آتی تو اسعان لازماً کبوتری کے متعلق سوال کرتا۔ وہ شاید جھوٹ نہ بول پاتی۔ وہ کبوتری کو یہاں دیکھتا تو لے جانا چاہتا۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔

اسعان لان کے وسط میں کھڑا چہرہ اوپر اٹھائے' اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ننھا سا وجود ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں رنگا ہوا تھا۔

○ ○ ○

امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اور محبّ ہر روز انہیں دیکھنے چلے جاتے۔ اس روز وہ کچھ زیادہ ہی نڈھال لگ رہی تھیں۔ وہ واپس تو آ گئی مگر ان کا نقاہت زدہ چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ شام تک اس نے دو تین طرح کے سالن تیار کر کے فریج میں رکھ دیے۔ محبّ اور اماں کے تمام کپڑے استری کر کے رکھے۔ کچھ اور ضروری کام نمٹائے، رات تک وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی، محبّ نے اگر کوئی تھوڑا بہت اعتراض کرنا بھی تھا تو اس کی تیاری دیکھ کر چپ ہو رہا۔ حمزہ اور اجالا اسے بس چھوڑنے جا رہے تھے۔ امی کے ہاں جانے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ عموماً بس آنا جانا ہی ہوتا تھا۔ سو اب اس کا ارادہ جان کر بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ ساتھ بھابیوں کے چہرے بھی کھل گئے تھے۔

"امی بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں، جگنو آئی ہے تو ہم سب خوب انجوائے کریں گے۔" اس کی بہن الینہ بہت پرجوش ہو رہی تھی، وہ مسکرا کر رہ گئی۔

"میں یہاں صرف امی کی دیکھ بھال کرنے آئی ہوں۔"

"ارے واہ..... یہاں دیکھ بھال کرنے والوں کی کمی ہے کیا۔"

"نہیں بھئی! لیکن دل کی تسلی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔" اس نے کہا تھا اور اسی تسلی کی خاطر وہ اگلے دو دن تک امی کے پیچھے پیچھے گھومتی رہی تھی۔ وقت پر کھلانا، پلانا، سلانا، احتیاط، پرہیز..... اسے اس حد تک پروا کرتے دیکھ کر امی ہنسنے لگتیں۔

"دو بچے پال کر تم اتنی ٹرینڈ ہو گئی ہو کہ مجھے بھی بچہ بنا ڈالا ہے۔"

وہ جی بھر کے سب کی خدمت کا لطف اٹھا رہی تھی کہ تیسرے ہی دن محبّ اجالا اور حمزہ سمیت آن پہنچا۔

"نہ بھئی! اب ہمارا گزارہ نہیں ہوتا، تم ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلو۔ امی کی خدمت سے دل نہیں بھرا تو ہم انہیں ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ اماں کا دل بھی لگا رہے گا۔" محبّ نے آتے ہی مدعا بیان کیا۔

"ہم سے نہیں کھائی جاتیں ماسی کی کچی پکی روٹیاں اور بڑی اماں کی جھڑکیاں۔" اجالا ناک چڑھائے بیزاری سے کہہ رہی تھی۔

"مما! دل نہیں لگتا.... اسکول سے واپس آؤ تو خالی گھر اچھا نہیں لگتا۔" حمزہ اس کے کاندھے سے لگا اداس آواز میں کہہ رہا تھا۔

بچوں کے اترے اترے چہرے، محبّ کی شکایت کرتی نگاہیں، انکار کا تو کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ امی بھی پہلے سے بہتر تھیں۔

"آپ لوگ چائے پئیں، میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" وہ بھابی کو چائے رکھتے دیکھ کر الینہ کے کمرے میں آ گئی۔ جب تک وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر، کپڑے بدل کر آئی، بھابی، محبّ کو کھانے کے لیے روک چکی تھیں۔

"لیکن اماں وہاں انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے گویا محبّ کو یاد دہانی کرائی۔

"بڑی بھابی کو فون کر دیا تھا، وہ دیکھ لیں گی۔" محبّ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔

چکن، بریانی اور مزیدار کباب، ڈنر میں لینے کے بعد چائے کا ایک دور اور چلا تھا، اور جس وقت وہ گھر جانے کے لیے نکلے، گیارہ بج چکے تھے۔ رات قدرے خنک تھی۔ کھڑکی سے آتی سرد ہوا کو اپنے گالوں پر محسوس کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اونگھتی ہوئی اجالا کا سر بھائی کی گود میں جا پڑا تھا اور خود حمزہ خمار آلود پلکیں جھپکتے ہوئے اسٹریٹ لائٹس کی زرد روشنی میں ڈوبے مناظر کو دیکھنے میں محو تھا۔

"تم خفا تو نہیں ہو؟" بالکل اچانک ہی محبّ نے پوچھ ڈالا۔

"کیوں بھلا؟" وہ رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ سجائے وہ خاصا مطمئن اور شاداب لگ رہا تھا۔

"یوں اچانک تمہیں لے آنے پر، تم کچھ دن اور رہنا چاہتی تھیں شاید۔" موڑ کاٹتے ہوئے محبّ نے ذرا کی ذرا اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں، میں رہنا چاہتی تھی مگر میں آپ سے خفا بھی نہیں ہوں بلکہ مجھے اچھا لگا۔ آپ لوگوں نے میری ضرورت محسوس کی اور مجھے لینے چلے آئے۔"

"تمہاری ضرورت نہیں ہو گی! ہماری چاہت ہو۔ جب ہی تو ہم دو ہی دن میں اداس ہو گئے تھے ہے ناں ماسٹر؟" محبّ نے بیک مرر میں حمزہ کو دیکھتے ہوئے تائید حاصل کرنا چاہی مگر نیند میں کھوئے حمزہ کا سر سیٹ کی پشت سے جا لگا تھا۔

"یہ صاحب تو گئے کام سے؟" وہ دھیرے سے ہنسا پھر گھر پہنچنے تک وہ دونوں اپنی باتوں میں مصروف رہے تھے۔

"آج یہ لوگ اتنی جلدی سو گئے کیا؟" اس نے حیرت سے بھابی کے پورشن کی طرف دیکھا، جہاں خلاف معمول خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ محبّ تبصرہ کیے بغیر حمزہ کو اٹھا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

سونے سے قبل وہ منہ ہاتھ دھو کر بیڈ پر آئی تو محبّ پوری آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"نیند نہیں آ رہی کیا؟"

"نہیں، میں تو بس سونے ہی والا تھا۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور پھر قدرے توقف سے بولا۔

"تمہیں معلوم ہے، بھابی اسلام آباد شفٹ ہو رہی ہیں۔"

رات کے اس پہر وہ ایک خاموش ندی کی مانند پرسکون تھی۔ محبّ نے بڑا سا پتھر اچھال کر سارا سکون درہم برہم کر دیا...... سینکڑوں دائروں میں بکھرتے ہوئے وہ بمشکل خود میں بولنے کی سکت پیدا کر سکی تھی۔

"کب؟"

"معلوم نہیں لیکن بیشتر سامان انہوں نے کل بھجوا دیا ہے وہاں۔" محبّ کے جواب پر اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔

(تو بات یہاں تک آ پہنچی..... کب سے فیصلہ کیے بیٹھی تھیں وہ۔)

"آپ نے پوچھا نہیں، کیوں جا رہی ہیں وہ۔"

"الیشبہ اگلے سال "قائداعظم یونیورسٹی" جوائن کرے گی۔ صباحت کے لیے ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد سے یہاں آنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے انہوں نے وہاں شفٹ ہونے کا سوچا ہے۔"

"آپ کو منع کرنا چاہیے تھا، جوان بچیوں کا ساتھ ہے، اس طرح...." آواز حلق میں دم توڑ گئی تھی۔

"ان کا بھائی تبادلے کے بعد وہاں سیٹل ہو چکا ہے۔ شاید وہ اس کے پاس زیادہ محفوظ تصور کریں گی۔" اس کی مسکراہٹ کا کھوکھلا پن اندر کی شکست و ریخت کو واضح کر رہا تھا۔ پلکوں کے زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

عفیفہ کا دل ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگا تھا۔ ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ گویا انہیں روکنے کے لیے وہ اپنی سی ہر کوشش کر چکا تھا۔ وہ آہستگی سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"بتی بجھا دو۔" اپنے عقب میں محبّ کی آواز سن کر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر بتی بجھا دی تھی۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں اس نے چت لیٹے محبّ پر ایک نظر ڈالی۔

'اور راستے بھر تمہارا غیر معمولی خوشگوار رویہ دراصل اندرونی اضطراب کو چھپانے کی ایک کوشش تھا'، اس نے بوجھل ہوتا سر تکیے پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اندر، دل میں، دماغ میں کوئی شور نہیں تھا۔ جذبات میں کوئی طوفان نہیں اٹھا تھا۔ بس ایک گہرا سکوت تھا، ایک ساکت چپ، ایک جامد سناٹا۔ محبّ کی بے چین سانسوں کی سرسراہٹ کمرے کی تاریکی میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔

عفیفہ نے اپنی مفلوج ہوتی زبان کو بمشکل حرکت دی۔

"اور اسعان!"

وہ دونوں اس پل ایک ہی لمحے کے اسیر تھے۔

"ان کا بچہ ہے، ان کے ساتھ ہی جائے گا۔" محبّ کا ٹوٹا ہوا لہجہ سن کر اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے کمبل کھینچ کر اپنے جسم پر ڈال لیا۔

"سردی لگ رہی ہے، شاید کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔" الجھتی سانسوں کے درمیان اس نے بمشکل کہا۔

"ساری کھڑکیاں بند ہیں۔" غافل ہونے سے قبل محبّ کی بہت ہی مدہم ہوتی آواز میں اس نے آخری جملہ یہ ہی سنا تھا۔



"آپ آفس نہیں جا رہے؟" محبّ کو عام گھریلو حلیے میں ڈائننگ ٹیبل پر آتے دیکھ کر وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آج چھٹی کر لوں گا۔" وہ اس کے زرد چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر کرسی گھسیٹتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں، اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ آفس چلے جائیے، خوامخواہ کام کا حرج ہو گا پھر اماں ہیں نا میرے پاس، ماسی بھی آ جائے گی۔"

"رات تو تم نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا تھا۔ بی پی اتنا لو کہ میں تو فاتحہ پڑھنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔" اسے بہلانے کے لیے وہ قدرے ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑ رہا تھا۔

"وہ رات کی بات تھی، اب میں ٹھیک ہوں۔ آپ ناشتہ کر کے آ جائیں، میں کپڑے نکال رہی ہوں۔" وہ جان بوجھ کر خود کو مصروف رکھنا چاہ رہی تھی۔

"بچوں کو اسکول چھوڑ کر میں کچھ دیر کے لیے ہی آفس جاؤں گا، جلدی آ جاؤں گا، تب تک تم آرام کرو۔"

محبّ کہتا رہا، وہ چپ چاپ اثبات میں سر ہلاتی رہی اور جب وہ لوگ گھر سے نکل گئے، تب سر جھکائے اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلتے ہوئے کتنی ہی دیر سوچتی رہ گئی۔

"ابھی میں جاؤں گی بھابی کے پاس، کیا کہوں گی؟ کچھ الوداعی کلمات، کچھ دعائیہ حرف۔ اظہار مسرت یا غمگین انداز۔

یا پھر سب میں سے کچھ بھی نہیں

اور

صرف ایک التجا۔

ان کے دروازے کی چوکھٹ پر گاڑ آؤں..... کہ ''مت جاؤ' ٹھہر جاؤ' رک جاؤ کہ تمہارے پاس میری ایک بہت قیمتی چیز ہے' تم جاؤ گی تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گی' میں اس کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟

تمہارے پاس وہ پیاری صورت ہے جو نہ دیکھ پاؤں گی تو میری آنکھ کی بینائی جاتی رہے گی۔

وہ نوخیز آواز مجھ سے مت چھینو جو رات کے بے آباد لمحوں میں میری سماعتوں کو آباد رکھتی ہے۔

تمہارے پاس میرے جگر کا ٹکڑا ہے' میری آنکھوں کا نور ہے۔ میری عمر کا وہ حصہ ہے' جسے مصلحت اور قربانی کی لمبی زبان نے نگل لیا۔

تم یہ سب مجھے لوٹا نہیں سکتیں' میں مانگتی بھی نہیں۔

مگر قرب کا وہ احساس جو میری ڈھارس بندھاتا رہتا ہے' اسے مجھ سے مت چھینو۔''

''باجی!'' کسی نے پکارا تھا۔

وہ بری طرح چونکی۔ شہناز سامنے کھڑی تھی' کام کرنے والی ماسی کی بیٹی۔

''وہ بڑی اماں آپ سے چائے بنانے کا کہہ رہی ہیں۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' تم خود ہی بنا دو۔''

وہ اٹھ کر پچھلے برآمدے سے باہر نکل آئی۔ لان عبور کرتے ہوئے اس کا رخ بھابی کے پورشن کی طرف تھا۔

''کچھ کہنا سننا نہیں' بس اسعان کو ایک نظر دیکھ کر واپس آ جانا ہے۔'' وہ خود کو تاکید کرتی چلی جا رہی تھی۔ لوہے کے ڈیزائن والا جالی کا بڑا سا دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی' خالی' ویران لاؤنج' اس نے آگے بڑھ کر راہداری کا دروازہ کھولنا چاہا جو کسی رکاوٹ کے باعث نہ کھل سکا تھا۔ اس نے الجھ کر ذرا سا سر جھکایا اور اگلے ہی پل سُن ہو کر رہ گئی۔ گھر کے اندر جانے کا ایک ہی تو راستہ تھا اور یہاں ایک موٹا سا تالا جھول رہا تھا۔

''بھابی' صباحت' اسعان۔'' دیوانگی کے عالم میں دروازہ پیٹتے ہوئے وہ چلائی۔ یوں جیسے محض اسے دھوکا دینے کے لیے باہر تالا لگایا گیا ہو اور باقی سب لوگ اندر ہی ہوں۔ خالی لاؤنج میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔

وہ سب لوگ جا چکے تھے' گھر خالی تھا۔ چند قدم الٹے پاؤں چل کر پلٹی اور پوری قوت سے

دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''وہ لوگ چلے گئے؟ مگر نہیں' اس طرح کیسے جا سکتے ہیں وہ۔'' بے یقینی میں گھرے اس نے بھابی اور صباحت کو کئی آوازیں دے ڈالیں۔

''کیا ہوا باجی!'' برآمدے کا دروازہ کھول کر شہناز باہر نکلی۔

بے جان جسم کو گھسیٹتے ہوئے وہ بمشکل لان کے وسط میں پہنچی تھی کہ پیروں نے اس کا بوجھ مزید سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر وہیں گھٹنوں کے بل گھاس پر گر گئی تھی۔ شہناز بھاگی چلی آئی تھی اس کی طرف۔

''وہ چلی گئی' بغیر بتائے چلی گئی۔'' اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''آئے ہائے باجی! اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے آپ کو۔'' شہناز گھبرا گئی تھی۔

''وہ عورت' وہ مجھے سمجھ ہی نہیں پائی۔ میں اتنی کم ظرف نہیں تھی کہ دی ہوئی چیز چھین لیتی۔''

''باجی! آپ اٹھیں' میں آپ کو.....''

''بے بنیاد ڈر' خوف' وہم' خدشوں سمیت وہ چلی گئی اسعان کو لے کر۔ ارے ایک بار مجھے اس سے ملنے تو دیتی۔ اس کے بال' اس کی آنکھیں' اس کے ننھے ہاتھ' میں ایک بار اسے چھو تو لیتی۔''

شہناز اسے بازوؤں سے تھامے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ بھربھری ریت ہو گئی تھی' جو اس کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔

''میں ایک بار اسے دیکھ لیتی' میری بے رنگ دید میں اس کا چہرہ رنگ بھر دیتا مگر اسے یہ منظور نہ تھا۔''

شہناز' محب کو فون کرنے کے لیے اندر کو بھاگی۔

''اس نے میری گود خالی کی تھی اور اب میری آنکھیں بھی نوچ کر لے گئی ہے۔'' وہ بری طرح چلائی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

○ ○ ○

اسعان چلا گیا اور اس کے تصور کے پردے پر اس کی شبیہ لہراتی رہ گئی۔ بہت سے دن خود سے لڑتے جھگڑتے' خود کو سمجھاتے گزر گئے۔ چپ کا دائرہ وسیع ہو کر سمٹتا چلا گیا۔ یونہی بے وجہ برآمدوں کمروں میں ٹہلتے ٹہلتے وہ تھک جاتی تو پچھلے برآمدے میں جا ٹھہرتی۔ نظریں بھابی کے پورشن پر جا ٹھہرتیں۔

قدموں کی مانوس آہٹ سنائی دیتی۔

''چاچی!'' معصوم پکار پر وہ چونک چونک جاتی۔ اور جب درختوں کی شاخوں میں دبکی چڑیوں

کو' شور مچاتے کوؤں کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتی تو ''جگنو'' کو پنجرے سے نکال کر ہاتھوں میں لے لیتی۔

بڑی اماں اس کی پریشان حالی کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتیں۔

''اسعان تو برسوں پہلے ہی فریحہ کا ہو چکا تھا' اب کس بات کا سوگ منایا جا رہا ہے۔'' محبت اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا۔

''میری وجہ سے تم نے بہت کچھ کھو دیا۔'' وہ اس کا جھکا ہوا سر دیکھتی تو ایک بار پھر ہار جاتی۔

'اگر میری مرضی نہ ہوتی' تو کون میرا بچہ مجھ سے چھین سکتا تھا۔ اس فیصلے سے مجھے جتنی بھی تکلیف ہوئی' جو بھی اذیت اٹھانی پڑی اس کے ذمے دار صرف آپ بہرحال نہیں ہیں' یہ فیصلہ ہم دونوں کا تھا.... اور شاید ہم دونوں کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

وہ اس مہربان شخص کو کبھی پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''میں نے بھابی کو فون کیا تھا' ان کے یوں چلے جانے پر ناراض بھی ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ اسعان سے ملتے ہوئے تم جذباتی ہونے لگتی ہو۔ اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسعان اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ لے کر جائے۔'' محبت کی وضاحت پر وہ زبردستی مسکرا دی تھی۔

''ان کی احتیاط اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ شاید' شاید کبھی میں بھی اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھ لوں۔'' اس نے آنکھوں میں ٹھہری نمی کو چپکے سے اپنی پوروں پر اتار لیا۔

(گویا یہ کام ابھی سیکھنا باقی ہے)

محبت لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔

اور پھر اس نے گویا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اسعان کی جدائی سے' اس کی یادوں سے۔ ''وہ مجھے یاد آتا رہے گا اور میں اسے یاد کرتی رہوں گی۔ اس کی یاد کی میٹھی پھوار نہ برسے تو میرا دل شاید بے حس ہو جائے۔ سنگلاخ چٹانوں جیسا' جن پر دھواں دھار بارش بھی سبزہ نہیں اگا سکتی۔'' وہ ان دنوں بہت مطمئن اور پرسکون رہا کرتی تھی۔

''اف اتنے طویل سجدے' اتنی لمبی لمبی دعائیں' مما! آپ کیا مانگتی رہتی ہیں اللہ سے؟'' کبھی کبھار حمزہ پوچھتا۔

''اپنے بچوں کی سلامتی.....'' ''جگنو'' کو دانہ ڈالتے ہوئے اس کے پاس بس ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

اور پھر ایک روز اس نے دعوتی فون سنا تھا۔

صباحت انتہائی پرجوش ہو کر بتا رہی تھی۔

''ہم سب لوگ سعودیہ جا رہے ہیں۔ جانے سے پہلے پورے خاندان کی دعوت کا پروگرام رکھا ہے' آپ لوگ ضرور.....'' اس نے قریب بیٹھے محبت کو ریسیور تھما دیا تھا۔

محبت نے متغیر چہرے کے ساتھ فون سنتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔ اس کے اطمینان میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا بلکہ انتہائی پرسکون انداز میں وہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے چینل بدل رہی تھی۔ وہ ریسیور رکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''حمزہ اور آپ کے کپڑے تیار کر دیتی ہوں..... اماں بھی یقیناً جائیں گی۔ اجالا میرے پاس رک جائے گی۔ کس دن جائیں گے آپ؟'' وہ اس کے چہرے پہ نگاہ جمائے پوچھ رہی تھی۔

''جمعہ کو.....'' محبت کسی مجرمانہ احساس میں گھر کر فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اور جس روز وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھ کر مسلسل اس پورشن کے جالی دار لوہے کے دروازے کو تکتی رہی۔ جس کے دوسری طرف موجود لاؤنج میں اسعان نے اودھم مچا رکھا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ لاؤنج کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر آیا تھا۔

Maggie, Maggie, let me say

وہ اونچی آواز میں نظم گاتا درختوں کی شاخوں پہ جھول رہا تھا۔

I want to fly away

Above this blue sky

And let me say you "bye"

شاخوں میں دبکی چڑیاں شور مچاتی' اس کے سر پہ منڈلانے لگیں۔ ان کے گھونسلوں تک رسائی نہ ہونے پر وہ چھلانگ لگا کر بھاگا تو اس بوسیدہ جھولے سے جا ٹکرایا۔ جو حمزہ اور اجالا کو اپنی گود میں لے کر آسمانوں کی سیر کرایا کرتا تھا۔ اسعان نے بے تکلفی سے جھولے پہ سوار ہو کر ایک لمبی اڑان بھری اور فضا میں بکھری نارنجی' گلابی رنگوں کو چھوتے ہوئے ایک شرارت بھری آواز لگائی۔

''چاچی!'' زمین اور آسمان کی وسعتوں سے بس ایک ہی پکار ابھری تھی۔

وہ گھبرا کر سیدھی ہوئی تو ''جگنو'' اس کے ہاتھوں سے نکل کر پر پھیلائے دھوپ میں جا بیٹھی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بے رنگ منظر ساکت تھا۔ کوئی ہلچل نہ تھی۔ جھولا خاموش اور درخت چڑیوں کی رونق سے آباد تھے۔

''اسعان کا یہ روپ' یہ رنگ تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' شام کے اداس لمحوں میں آسمان کے سینے پہ ڈولتے پرندے گنتا ہوا بچہ اسے بے طرح یاد آیا۔ بہت سی چیزیں پس منظر سے پیش منظر کی طرف آتی چلی گئیں۔

"اسعان! جھولے پر نہیں بیٹھنا۔"

"اسعان! سڑک پار نہیں جانا۔"

"اسعان! درخت پر مت چڑھو۔"

"یہ نہ کرو..... وہ نہیں کرنا..... ایسا نہیں ہوگا۔"

بہت سی آوازیں آپس میں گڈ مڈ ہونے لگیں۔ دل کی طرف کوئی کھلنے والی آخری کھڑکی بھی بند ہوگئی تھی۔

اور اس شام کے بیت جانے کے بہت دنوں بعد وارڈ روب سے محبّ کی شرٹ نکالتے ہوئے جیسے کوئی گمشدہ بھولی بسری بات اس کے ہاتھ آگئی تھی۔

"اسعان اندر سے بالکل حمزہ کی طرح تھا۔ میں جانتی ہوں....." اس نے پلٹ کر محبّ کی حیران ہوتی آنکھوں میں جھانک کر اسے یقین دلایا۔ جو عرصے بعد اس کے لبوں سے اسعان کا نام سن کر چونک سا گیا تھا۔

"شرارتی' نٹ کھٹ' بلا تکان بولنے اور نچلا نہ بیٹھنے والا.... لیکن ....." وہ پرسوچ انداز میں لمحہ بھر کے لیے رکی۔

"میں نے کبھی اسے شرارت کرتے نہیں دیکھا تھا۔"



فضا کبوتروں کے بھاری پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے بھری گئی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا' سفید' سیاہ اور چمکیلے پروں والے کبوتر ہوا میں قلا بازیاں کھا رہے تھے۔

نجانے کتنے سالوں بعد اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سفری بیگ اپنے قدموں میں گراتے ہوئے وہ برآمدے کی پہلی سیڑھی پر بیٹھ کر انگلیوں پہ گننے لگا' لیکن تھکن اس کی رگوں میں کینچوے کی طرح خون کے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔

سارا حساب کتاب غلط ہوگیا تھا۔ اس نے انگلیاں اپنے بالوں میں پھنساتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ نروس ہو رہا ہے۔

اس گھر کے مکینوں سے ملنے کی اسے بہت چاہ تھی۔

لیکن جب وہ لکڑی کے ریڈ آکسائیڈ گیٹ کو دھکیل کر اندر آرہا تھا تو ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ شدید ہچکچاہٹ لپٹی جا رہی تھی۔ چال کی تیزی اور تندی کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب وہ اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کچھ دیر سے سوچ رہا تھا۔

"پتا نہیں سب لوگ مجھ سے کیسے ملیں گے؟" اور معلوم نہیں' یہ لوگ مجھے پہچان بھی سکیں گے کہ نہیں؟"

وہ سر اٹھا کر سامنے لان میں لگے درختوں کو دیکھنے لگا۔ گھر کا نقشہ پہلے سے بدل چکا تھا۔

"لیکن موسم وہی ہے۔"

اسے سب یاد تھا' یہ ہی بدلتا ہوا' اداسی میں گھرا موسم تھا جب وہ اس گھر کو چھوڑ کر گیا تھا۔ خاموشی اس گھر کے برآمدوں' راہداریوں اور نیم تاریک کمروں میں چکراتی پھرا کرتی تھی۔ اور سناٹا ہر پل چڑیوں کی چہکار سے گونجا کرتا تھا۔

لکڑی کا نیم وا گیٹ کسی نے زور سے دھکیلا تھا۔ وہ چونک گیا۔

حمزہ بائیک لیے اندر داخل ہو رہا تھا۔ شرٹ کے بازو کہنیوں تک موڑے ہوئے' گریبان کے دو بٹن کھلے' قدرے بے ترتیب بال' جھنجھلایا ہوا چہرہ' غالباً بائیک خراب تھی۔ ماتھے پہ چمکتے پسینے کے ننھے قطرے بتا رہے تھے کہ وہ کافی دور سے یہ مشقت جھیلتا ہوا آرہا تھا۔ بائیک کھڑی کر کے گرد آلود جوگرز کو دھپ دھپ زمین پہ مار کر گرد جھاڑتے ہوئے اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو ایک پل کی حیرانی کے بعد اس کی آنکھیں پہچان کے ہزار رنگوں سے جھلملا اٹھی تھیں۔

"اوئے اسعان! یہ تم ہو.....؟" ایک ہی جست میں اس تک پہنچ کر وہ اس کے گلے لگ گیا تھا "کب آئے؟ اور یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ بیگ بھی یہیں پڑا ہے۔"

وہی پرجوش انداز' اوپر تلے کے سوالات' اسعان گڑبڑا سا گیا۔

"اوہ اچھا.... ابھی آئے ہو گے نا؟ آجاؤ..... مما سے نہیں ملے اب تک؟" وہ خود ہی جواب دیتا اس کا بیگ ہاتھ میں لیے آگے بڑھ گیا تھا۔

جس کمرے میں وہ لوگ داخل ہوئے' ایک بیڈ روم تھا' بے حد پرسکون اور ٹھنڈک بخش۔ "یہاں بیٹھو..... میں مما کو بلا کر لاتا ہوں۔" حمزہ ٹیوب لائٹ کا بٹن دبا کر باہر نکل گیا۔ روشنی کے ایک جھماکے کے بعد کمرے کا منظر واضح ہوگیا تھا۔ دروازے کے قریب رکھے موڑھے پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اتارتے ہوئے ارد گرد نظر دوڑائی۔

بیڈ پر سبز اور ہلکے آسمانی رنگ کی چادر بچھی تھی۔ اور سائیڈ ٹیبل پر لیمپ کے ساتھ ایک فریم شدہ تصویر..... وہ اٹھ کر تصویر ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگا۔ چاچو' اجالا' حمزہ' چاچی اور ان سب کے درمیان میں بیٹھا وہ خود' فل یونیفارم پہنے گود میں بیگ رکھے' یہ اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔

دروازے کے باہر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ وہ تصویر واپس رکھ کر ایک کرسی پہ جا بیٹھا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ عجیب بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے اس

نے اپنی سرد پوروں کو اپنی ہتھیلیوں میں گاڑ دیا۔

"کیسے ملوں گا میں ان سے؟"

تیزی سے گردش کرتے خون کے ساتھ وہ ایک مانوس سی مہک کو محسوس کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہلکا سا مسلتے ہوئے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی' وہ جواب دیے بغیر قدم اٹھاتی اس کے سامنے آرکیں۔ اور پھر بازو اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ ایک لمحے کے لیے اسعان کو لگا' اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پہ جمع ہو گیا ہے' آنکھیں اندرونی کرب سے دہکنے لگی تھیں۔

"کیسے ہو تم؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

اسعان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے پایا۔ تب انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا اور پھر پلٹ کر بیڈ پہ جا بیٹھیں۔

"بس....؟" وہ حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

اور اس کا خیال تھا کہ وہ سامنے آئے گا تو شاید وہ کچھ دیر کے لیے پتھر ہو جائیں گی.....یا پھر تڑپ اٹھیں گی۔ بے قرار ہو کر اسے بازوؤں میں بھینچ لیں گی اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہیں گی۔

"تم آج سے پہلے کیوں نہیں آ گئے اسعان! میں تمہارے لیے بہت ترسی ہوں' بہت بلکی ہوں۔"

لیکن اس کے سامنے ایک سمندر تھا' وسیع اور گہرا' مگر اس کی موجوں میں اضطراب نہیں تھا۔ پرسکون لہریں ریت کنارے کو ذرا سا چھو کر پلٹ گئی تھیں۔

تشنگی کا صحرا اسے اپنی طرف گھسیٹنے لگا تو وہ گہرے گہرے سانس لیتا واپس کرسی پہ جا بیٹھا تھا۔ لیکن اندر کوئی تھا' کوئی ننھا سا وجود' جو سامنے بیٹھی بیڈ کی چادر پر پڑی نادیدہ گرد کو جھاڑتی ہوئی عورت کی طرف ہمک رہا تھا' جو اس کی گود میں سر رکھ کر بہت سا رونا چاہتا تھا۔ بہت سارے گلے شکوے شکایات' ناراضی جو وہ اس کے حوالے کر دینے کی خواہش لے کر یہاں آیا تھا۔ اب اپنی آہوں اور سسکیوں میں چھپائے ناراض نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"گھر میں سب خیریت سے تھے نا.....؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی....." وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو رہا تھا۔

وہ نجانے کس سوچ میں ڈوب گئیں' تب اس نے جھجکتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور بغور انہیں دیکھنے لگا۔

وہ آج بھی بالکل ویسی ہی تھیں۔ گزرے ماہ و سال نے ان پر کچھ خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ بس

بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے۔ اور آنکھوں کے گرد حلقے بن گئے تھے' جو بہت زیادہ گہرے نہ ہونے کے باوجود ان کی سفید رنگت پر نمایاں ہو رہے تھے۔

"اسلام آباد آنے کے بعد ہم نے پورے خاندان کی دعوت کی تھی' مگر آپ لوگ آئے ہی نہیں۔" انہیں خاموش دیکھ کر اس نے یونہی ایک بات چھیڑی۔

"ہاں..... حمزہ اور اجالا کے امتحانات ہو رہے تھے ان دنوں' محب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ جواباً کہہ رہی تھیں تب ہی دروازہ کھول کر حمزہ داخل ہوا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے تھامے ہوئے تھا۔

"میں نے سوچا' بچہ تھکا ہوا آیا ہے' کیا تکلیف دوں۔ چائے یہیں پر لے آیا ہوں۔"

چکن رول' پزا' فروٹ کیک اور مختلف اقسام کے بسکٹس سے بھری ٹرے اس کے سامنے رکھ کر وہ خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

بھوک ہونے کے باوجود کوئی چیز حلق سے نیچے نہ اتر رہی تھی۔ ایک چکن رول کھا کر اس نے گرم گرم چائے کا کپ اپنے اندر انڈیل لیا تھا۔ جب کہ حمزہ چائے کے ساتھ بھی لنچ جیسا سلوک کر رہا تھا۔

"تم اب کچھ دیر آرام کر لو اسعان' باقی باتیں شام میں ہوں گی۔" وہ چائے کے برتن سمیٹ کر باہر نکل گئیں۔ حمزہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔

"پاپا کے ایک دوست آپریشن کے لیے لاہور جا رہے تھے۔ اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ پھر ان کی تسلی کے لیے پاپا ان کے ساتھ چلے گئے۔ یہاں ہوتے تو تمہیں دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوتے۔" ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد حمزہ جمائیاں لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تب تھکن سے نڈھال ہوتے ہوئے اس نے شاور لے کر کپڑے بدلے اور پھر بیڈ پہ لیٹا تو شام تک سوتا ہی رہا تھا۔

○ ○ ○

"تمہیں یوں اچانک سامنے پا کر گویا میری سانس ہی رک گئی تھی۔ کمرے کے در و دیوار یوں گھومے کہ مجھے کچھ سجھائی ہی نہ دیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی دبیز چادر تن گئی تھی' مگر یہ تم تھے جو روشنی بن کر سامنے کھڑے تھے۔ میں تمہاری طرف بڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے دل' دماغ اور میری آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہے۔ تمہارا چہرہ تھام کر میں نے تمہاری موجودگی کو تسلیم کرنا چاہا تو میری آنکھ بھر آئی۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا تھا۔ اور یہ دھڑکنے میں سستی دکھانے لگا تھا۔ تم نہیں جانتے' کسی اچانک صورتحال کو برداشت کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہت

زیادہ خوشی' بہت زیادہ غم سہنے کے لیے مجھے پہلے سے تیار ہونا پڑتا ہے اور تم نے تو یوں اچانک آ کر گویا میری جان ہی نکال لی تھی۔' زبان تلے گولی رکھ کر وہ راکنگ چیئر جھلانے لگی تھی۔

'حالانکہ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ تم تو ہر روز میرے پاس آتے رہے ہو۔ کبھی بند آنکھوں کے پیچھے' کبھی کھلی آنکھوں کے سامنے۔ مگر میرے لیے تو آج تک تم وہی حیران حیران آنکھوں والے ننھے منے اسعان تھے۔ وہ ساری تصاویر جو آج تک وقتاً فوقتاً بڑے بھیا ہمیں بھجواتے رہے' جامد تھیں گونگی تھیں' تم ان میں مجھے مسکراتے ہوئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان تصویروں میں کوئی مجھے "چاچی" کہہ کر نہیں پکارتا تھا۔ سو میں انہیں ایک نظر دیکھ کر البم میں لگا دیا کرتی تھی۔ اور پھر پچھلے برآمدے میں بیٹھ کر تمہیں دیکھا کرتی تھی لان میں بھاگتے' کھڑکی سے پکارتے' ادھڑی ہوئی اون کو الجھاتے' اور پھر پریشان ہوتے۔'

"مما.....!" اجالا نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"اسعان بھائی کو جگا دوں؟ اب تو کافی دیر ہوگئی ہے۔" وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ خود ہی اٹھنے والا ہوگا اب تو..... تم ذرا آؤ میرے ساتھ کچن میں۔" وہ فوراً ہی اٹھ گئی۔

"کھانا کھائے بغیر سو گیا تھا۔ تم کباب تل کر رائتہ بنا لو۔ میں بریانی دم دے دیتی ہوں۔ باقی اہتمام رات کے کھانے پر کرلیں گے۔"

اس نے اجالا کو ہدایت دی تھی مگر اسعان جاگا ہی اس وقت تھا جب رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے اجالا نے اسے کمرے سے باہر آتے دیکھا تو ایک دم چیخ کر اس کے کندھے سے جا لگی۔

"اتنی دیر تک سوئے ہیں' کب سے انتظار کر رہی تھی۔ موقع بھی ڈھونڈ رہی تھی کہ چپکے سے اندر جا کر آپ کو جگا دوں مگر ہماری مما بھی ایک طرح سے جلاد ہیں پوری..... مجال ہے جو میری نگرانی سے باز آئی ہوں۔ الٹا کچن میں ہزاروں کام ڈھونڈ لیے میرے لیے۔"

وہ آج بھی ویسے ہی نان اسٹاپ بولتی تھی۔ اسعان اس سے ایک ڈیڑھ برس چھوٹا ہی تھا مگر ایک تو برسوں کی دوری' اس پر اسعان کے چہرے پہ گڑی سنجیدگی' وہ خود ہی آپ جناب پر آ گئی تھی۔

عفیفہ چکن اور ٹرائفل بنانے کے بعد چپاتیاں ڈال کر آئی تو وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اجالا اور حمزہ کی زبان رکنے میں نہ آ رہی تھی۔ اسعان صرف انہیں سن رہا تھا۔ وہ اجالا کو کھانا لگانے کا کہہ کر وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ اجالا منت سماجت کر کے حمزہ کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ ایک دوسرے کے بغیر یوں بھی ان کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ اسعان کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو بڑی سنجیدگی سے ٹی وی پر نظریں

جمائے بیٹھا تھا۔ دیر تک سوئے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں گلابی رنگ گھلا ہوا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پہ سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں' کھوئی کھوئی سی اداس آنکھیں جو دیکھنے والوں کو بھی اداس کرتی تھیں۔ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتی ابھرتی۔

"اسعان!" وہ بے اختیار ہی اسے پکار بیٹھی۔

وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہاری آنکھیں بالکل اجالا جیسی ہیں۔"

"جی..... خاندان کے اکثر لوگوں نے مجھ سے یہ ہی کہا ہے۔" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

"یہاں کیا مصروفیت ہوتی ہے تمہاری؟"

"کچھ خاص نہیں۔ ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا ہوں۔ بابا اپنا بزنس یہاں سیٹ کرلیں گے تو پھر ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تب ہی اجالا انہیں ڈائننگ روم میں پکارنے لگی تھی۔

اور کھانے کی میز پر حمزہ اور اجالا کے درمیان بیٹھا اسعان' عفیفہ کو عجیب سی بے چینی سے دوچار کر رہا تھا۔ حمزہ اور اجالا کے ہر قہقہے پر وہ اپنا چمچہ چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتی۔ ایک پل کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگتی تو اگلے پل وہ پھر سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اور یوں مسکرانے پر بھی اس کی آنکھیں قطعاً اس کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔

'کیا کچھ کھو دیا ہے تم نے' ہماری قربانیوں کی آڑ میں۔ دکھ تو سارے میں نے جھیلے ہیں۔ ان کا عکس تمہاری آنکھوں کو کیوں اداس بنا رہا ہے؟' وہ پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنے آنسو بھی پی رہی تھی۔

وہ انتہائی شوخ رنگ کے کھلے ہوئے' شاداب پھولوں کے بیچ ایک مرجھایا ہوا پھول تھا۔ جس کا ہر رنگ پھیکا تھا۔ زرد دھوپ کی بارش میں پروان چڑھا کملایا ہوا پھول۔

ہر پکار پر چونکنا اس کا معمول تھا' ہر سوال کے جواب میں وہ گھڑی بھر کے لیے چپ ہو جاتا' یوں جیسے ہر بات کا جواب سوچ کر دے رہا ہو۔ اگر سن رہا ہے تو نظر مخاطب کے چہرے پر نہیں' سامنے میز پر جمی ہوئی' کہنا ہو تو ایک خفا سی نگاہ اگلے بندے پر ڈال کر گویا فرض پورا کرتا تھا۔ آواز نرم مگر اتنی مدھم ہوتی کہ وہ بمشکل اس کی بات سمجھ پاتے تھے۔

کم بولنا' کم ہنسنا۔

"ویسے مما! اسعان بھائی ہمارے ساتھ رہتے تو کتنا....." اجالا چہکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اس کے ہاتھوں سے پانی چھلک گیا تھا۔ ٹھیک ہے' بڑے ہونے پر یہ بات خود بخود کسی نہ کسی

طرح ان سب کے علم میں آ گئی تھی، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اس بات کو یوں اسعان کی موجودگی میں ڈسکس کیا جاتا۔

"صباحت کی بات چل رہی ہے کہیں؟" اس نے ایک تنبیہی نظر اجالا پر ڈالتے ہوئے بات بدلی۔

"الیشبہ اور اریبہ کی شادی پر بہت سے لوگوں نے پوچھا تھا۔ لیکن وہ خود ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔" وہ یوں بولا تھا گویا اجالا کی بات سنی ہی نہ ہو۔

کھانے کے بعد وہ تینوں اس کے بیڈروم میں آ گئے تھے۔ رات گئے تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ وقفے وقفے سے اسعان سے کچھ نہ کچھ پوچھ کر اس کی پسند ناپسند کا اندازہ لگا رہی تھی۔ اجالا حسب عادت میری فرینڈز، میری پینٹنگز میں الجھی ہوئی تھی۔ حمزہ کے پاس ہزاروں موضوعات تھے۔ ایک وہی تھا جس کی چپ اس کے سینے میں نیزے کی انی کی طرح گڑی جا رہی تھی۔

"بس مما! بہت باتیں ہو گئیں۔ اب آپ سو جائیں ورنہ پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔" حمزہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی..... اور آج تو پاپا بھی نہیں ہیں یہاں۔ آپ کا خیال رکھنے کے لیے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم لوگ تو ہیں نا....." اجالا کی بات پر وہ بے اختیار ہی بولا تو عفیفہ کی نگاہ اس کے صبیح چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔

"ارے جناب! ہم تینوں مل کر بھی پاپا جیسے تیماردار ثابت نہیں ہو سکتے۔" حمزہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

○ ○ ○

صبح کے ملگجے اجالے میں اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، اور پھر دھیرے سے مسکرا دی۔ آج پچھلے لان میں اسعان موجود نہیں تھا۔ بلکہ آج وہ اس کے ساتھ والے بیڈروم میں تھا، محو خواب، وہ ابھی ابھی اسے دیکھ کر، اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سنوار کر، اس کی پیشانی کو اپنے لبوں سے چھو کر آ رہی تھی۔ اس کے پورے وجود میں ایک ٹھنڈک سی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر کبوتروں کی غٹر غوں نے اچھا خاصا شور مچایا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی اور ان سب کو آزاد کر کے بڑے سے پنجرے کے اندر رکھی کٹوری میں صاف پانی بھرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر باجرے کا تھال لے کر بیٹھ گئی۔ مٹھی بھر باجرہ اچھالنے پر درجنوں کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پہ اتر کر دانہ چگنے لگے تھے۔ اور تب بہت خاموشی سے وہ اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔

"کل میں نے ان کبوتروں کو اڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ سب کبوتر آپ کے ہیں۔" وہ دلچسپی سے انہیں دانہ چگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"میرے.....؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ کبوتر میرے تو نہیں اسعان، یہ سب تمہارے ہیں۔ تمہیں یاد ہے ناں! تم مجھے "جگنو" دے کر گئے تھے۔" وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔

وہ کندھے اچکا کر، ناسمجھی کے عالم میں ان کبوتروں کو دیکھ کر اپنی یاد کھنگالتا رہا، پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ طویل سانس لے کر سیدھی ہوئی۔ پھر ذرا سا ہنس دی۔

"ہاں! تم اس وقت کافی چھوٹے تھے..... تمہاری کبوتری میرے پاس رہ گئی تھی۔ میں برسوں اس کی حفاظت کرتی رہی۔ پھر ایک برسات میں وہ مر گئی۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ بہت سے کبوتر مجھے دے گئی تھی۔ تب سے ان کی دیکھ بھال کر رہی ہوں، یوں لگتا ہے جیسے میں ان سے اور یہ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ صبح کے وقت جب میں اکیلی گھر پہ رہ جاتی ہوں تب یہ میری تنہائی بانٹ لیتے ہیں۔ جب تک بڑی اماں یہاں تھیں۔ دوسراہٹ کا احساس رہتا تھا۔ لیکن حج کرنے کے بعد چھوٹی بھابی کے ہاں ان کا دل لگ گیا ہے۔ اب اکیلے میں جو بھی کہنا ہو، ان ہی سے کہہ سن لیتی ہیں۔"

"تو آپ یوں محبت کرتی رہی ہیں مجھ سے۔" اس کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"مما آئیں گی کسی روز، کچھ سامان یہاں چھوڑ گئی تھیں، وہ لینے۔" باتوں باتوں میں اسعان نے کہا۔

"نہیں، وہ تو سب کچھ لے گئی تھیں اپنے ساتھ۔" کبوتروں کی طرف مزید دانہ اچھالتے ہوئے اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پر وہ چونکی۔

"ہاں..... سامان..... ہاں! وہ تو ہو گا..... لے جائیں، جوں کا توں رکھا ہے۔" وہ اپنی کہی گئی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آؤ، میں تمہارے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔" وہ اسے لے کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اور پھر سب کے ساتھ مل کر ناشتہ کرنے کے بعد وہ باقی سب رشتے داروں سے ملنے کے لیے حمزہ کے ساتھ نکل گیا ہوا تھا۔ کئی لوگوں نے اس کے یہاں آنے کا سن کر دعوت کر ڈالی تھی۔ اور ٹھیک تیسرے دن وہ ان کے سامنے تیار کھڑا، جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" وہ یوں حیران ہو کر ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی گویا اس کی کہی گئی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"جی..... مما' میری غیر موجودگی کو بہت مس کرتی ہیں۔ اور پھر..... جانا تو ہے ہی۔" اس کی آواز معمول سے بھی دھیمی ہو گئی تھی۔

"ہاں....." وہ جیسے ایکدم سنبھلی تھی۔

"حمزہ' تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آئے گا۔" وہ کہتے ہوئے پلٹی اور بیڈ روم میں جا کر الماری کھولنے لگی اس میں وہ ڈھیر ساری چیزیں تھیں جو اس نے وقتاً فوقتاً اسعان کے لیے خریدی تھیں۔ اور یہ چیزیں وہ اب اسے دینا چاہتی تھی۔ مگر نجانے کیوں وہ ان چیزوں کو الماری سے نکالنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

"عفیفہ' اسعان سے ملتے ہوئے ہمیشہ جذباتی ہو جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کے ذہن پر کوئی برا اثر پڑے۔"

ماضی میں کہا گیا ایک جملہ ساری چیزوں کے سامنے پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

"وہ ایک پر سکون زندگی گزار رہا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکو گی تو درحقیقت اسے ہزار دائروں میں الجھا دو گی۔"

"مما! آ جائیے' اسعان کو دیر ہو رہی ہے۔" حمزہ کی آواز آئی تھی۔ اس نے ٹھک سے الماری کے دونوں پٹ بند کیے اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر آ گئی۔

اسعان اسی کا منتظر تھا۔

اسے آتے دیکھا تو جھک کر اپنا بیگ اٹھا لیا۔

"چلتا ہوں اب۔"

"ہوں.... خدا حافظ.... اپنا خیال رکھنا۔" زبردستی مسکراتے ہوئے اس نے اپنے ٹھٹھرتے ہوئے سینے پہ دونوں بازو باندھ لیے تھے۔ پلکوں کو بار بار جھپک کر آنسو پینے کے باوجود کناروں پہ اٹکے' بے رنگ پانی کے قطرے اسعان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے تھے۔ وہ ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ کر زیر لب "خدا حافظ" کہہ کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ حمزہ گیٹ کے باہر بائیک پہ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گیٹ کی طرف بڑھتا ہوا اسعان کچھ یاد آنے پر ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ پھر بیگ زمین پر رکھ کر پنجوں کے بل بیٹھ کر بیگ کی زپ کھولنے لگا۔ اس میں سے کوئی چیز نکال کر وہ اس کی طرف پلٹ آیا۔

"چاچی!" ان تین دنوں میں اس نے پہلی مرتبہ اسے پکارا تھا۔

"یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔" اس نے پیک کیا ہوا گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ لمحوں کے بعد اپنے منجمد ہاتھوں کو حرکت دے سکی تھی۔ گفٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ قدرے جھکا اور اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس ہو لیا تھا۔ اس کی پتھرائی نگاہیں' اس کا گیٹ سے باہر نکلنے تک تعاقب کرتی رہی تھیں۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک بائیک کی آواز سنائی دینا بند نہ ہو گئی تھی۔

"مما! آپ ٹھیک تو ہیں؟" اجالا اس کی پیلی ہوتی رنگت سے پریشان ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"مجھے میرے کمرے میں لے چلو....." وہ اجالا کا سہارا لیتی اپنے بیڈ پر آ لیٹی تھی۔

"اسے کھول کر مجھے دکھاؤ...." خود میں ہمت نہ پا کر اس نے وہ گفٹ اجالا کی طرف بڑھایا۔

"واؤ....." پیکنگ کھولتے ہی بے اختیار وہ چیخی اور پھر گفٹ اس کے سامنے کر دیا۔

تنکوں سے بنا ہوا ایک مصنوعی گھونسلہ تھا' جس پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ اس گھونسلے کے بیچ ایک چڑیا اپنے تین بچوں سمیت بیٹھی تھی۔ اجالا نے وہ بٹن بھی ڈھونڈ نکالا تھا جسے دبانے پر وہ تینوں بچے چونچیں کھولے' چوں چوں کرتے اپنی ماں کی طرف گردنیں اٹھا کر ہمکنے لگتے تھے۔

"بھابی کہتی تھیں' عفیفہ' اسعان سے ملتے ہوئے جذباتی ہو جاتی ہے۔" اور میں کہتی تھی۔

"شاید میں کبھی اپنے جذبات پہ قابو پانا سیکھ لوں۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے میں ایسا کبھی بھی نہیں کر پاؤں گی۔" رات گئے اس تحفے پہ نظریں جمائے وہ محبت سے کہہ رہی تھی۔

فون پر دوسری طرف موجود محبؔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش اور نقاہت محسوس کرتے ہوئے پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

"اسعان آیا تھا؟"

"ہاں...."

o o o

"نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ وجیہ کی امی کا فون آیا تھا۔ ان تین چار دنوں میں کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ ان کی طرف جانا ہے' واپسی پر صباحت کو بھی لیتے ہوئے آنا ہے۔ اس کی گاڑی سروس کے لیے گئی ہے۔"

وہ شام چار بجے گھر پہنچا تھا۔ اور اب ٹھیک سات بجے مما اسے اٹھانے کے لیے آ چکی تھیں۔ وہ چند لمحے یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

"تم نے عفیفہ کو بتایا تھا' اپنی شادی کے متعلق؟"

"نہیں.....اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"کوئی بات نہیں' میں خود جاؤں گی انہیں کارڈ دینے کے لیے۔" وہ تفاخر بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اسعان خاموشی سے ان کی بات سن کر نہانے گھس گیا تھا' دس گھنٹے کے سفر کی گرد جھاڑ کر وہ باہر نکلا تو مما پرس اٹھائے کھڑی تھیں۔

وجیہ کے گھر والوں نے حسب معمول پرجوش انداز میں ان کا استقبال کیا تھا۔ اس کی ایک ہی سالی تھی۔ وہ بھی نٹ کھٹ اور شریر۔ سارا وقت اس کے سر پہ سوار رہتی۔ وہ اپنی ہونے والی سسرال میں آنے سے ہمیشہ ہی گھبرایا کرتا تھا۔ اس کے اپنے گھر کے مقابلے میں اس گھر کا ماحول بے حد خوشگوار اور کشادہ تھا۔ ہر فرد باتونی' خوش مزاج اور ہنس مکھ' وہ جتنی دیر یہاں بیٹھتا' ہر فرد پوچھتا۔ اور بار بار پوچھتا۔

"اسعان بہت چپ چپ ہے۔"

"کوئی بات کرو نا؟"

"اسعان' اتنا کم کیوں بولتا ہے؟"

ایک ہی بات مختلف انداز سے اس طرح دہرائی جاتی تھی۔ کہ بعض اوقات وہ زچ ہو جاتا۔ کبھی چڑنے لگتا۔ اور کبھی اسے بے اختیار ہی ہنسی آ جاتی۔ لیکن پھر بھی وہ دل میں دعا کرتا تھا۔

"یا اللہ! وجیہ ایسی نہ ہو۔"

لیکن وجیہ بالکل ویسی ہی تھی۔ بلکہ ان سب سے دو ہاتھ آگے.....اس کا اندازہ اسے شادی کی پہلی رات ہی ہو گیا تھا۔ جب اس کا گھونگھٹ الٹے بغیر اس نے منہ دکھائی کا تحفہ اس کے سامنے رکھا۔ تو اس کی زوردار ہنسی کی آواز پورے کمرے میں پھیلتی چلی گئی تھی۔

وہ جھنجھلا سا گیا تھا۔

"سارا وقت تو دوپٹہ سر پر ٹکائے مزے سے مووی بنواتی رہی ہو۔ اب گھونگھٹ کس خوشی میں نکال لیا ہے۔"

اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے وجیہ کی غلطی پکڑنی چاہی۔ مگر وہ اس کی طرح جلے بھنے بغیر مدھر ہنسی کا رس اس کے کانوں میں ٹپکاتی رہی تھی۔

اگلی صبح ولیمہ تھا۔

عفیفہ نے وجیہ کو ایک بھاری سونے کا سیٹ اور جڑاؤ کنگن دیے تھے۔ محب نے گاڑی کے ساتھ پچاس ہزار روپے کا چیک اسعان کو سلامی میں دیا تو اتنے مہنگے تحفوں پر بڑی بھابی کا منہ بن گیا تھا۔

بڑے بھیا نے کچھ کہنا چاہا تو محب نے انہیں خاموش کروا دیا تھا۔

"ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دیں بھیا۔ بھلے وہ آپ کا ہی ہے۔ مگر اس کا ہم پر بھی کچھ حق بنتا ہے۔ ہمیں اپنی خوشی پوری کرنے دیں۔"

ولیمے سے اگلے روز سب مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ اور اسعان اپنی نئی نویلی دلہن کو لینے سسرال پہنچا تھا۔



وجیہ بالکل اپنے نام کی طرح وجیہ تھی۔ خوبصورتی اور خوب سیرتی دونوں میں بے مثال۔ ہمہ وقت ہنسنے اور ہنسانے والی' گھومنے پھرنے کی شوقین' دھاڑتے رنگوں کے لباس پہنتی تھی۔ خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ برتن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو گھنٹوں سوچ سوچ کر ہنستی رہتی تھی۔

چار بہنوں کی شادی کے بعد گھر میں اسعان کے علاوہ صباحت' مہک اور مما ہی ہوتے تھے۔ اولین دنوں میں گھر کے بجھے بجھے سنجیدہ ماحول میں جب اس کے بلند آہنگ قہقہے گونجتے تو گھر کے سب افراد کی حیرت بھری نگاہیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی وجیہ پر جم جاتیں۔

"صبح ہم لوگ سیر سے واپس آ رہے تھے نا' تو ایک موٹر سائیکل تیزی سے ہمارے پاس سے گزری۔ اتنی تیزی سے کہ اس پر سوار آدمی کے ہاتھ سے دہی کی تھیلی چھوٹ کر ہمارے پاس گر گئی اور وہ خود....."

بتاتے ہوئے اس کی ہنسی ایک بار پھر اسٹارٹ ہو جاتی۔

کبھی کچن سے قہقہے لگاتی آواز باہر آتی۔

"ہنڈیا بناتے ہوئے امی کا فون سننے گئی تھی۔ مہک نے چمچ ہلاتے ہوئے نمک بھی ڈال دیا۔ مجھے خبر ہی نہ تھی۔ میں نے ایک اور چمچ بھر کے ڈال دیا۔"

کبھی کرنٹ افیئر جیسے سنجیدہ پروگرام کو سنتے ہوئے اس پہ ہنسی کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے' کمپیئر تو لڑکی ہے۔" مہک نے ایک دم سر اٹھا کر کہا۔ حقیقت میں صباحت اس وقت تک چینل بدل چکی تھی۔

اور مہک کی اسی ایک بات پر وہ اتنا ہنسی تھی اتنا ہنسی تھی کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ ایسی حالت میں اس پر نہ مما کی سرد نگاہوں کا اثر ہوتا تھا نہ صباحت کے ماتھے پر نمودار ہوتی تیوریوں کا۔

اسعان کی بات البتہ مختلف تھی۔ اس کے لاشعور میں کھل کر ہنسنے اور خوشیوں کے بے ساختہ اظہار کی کوئی خواہش موجود تھی۔ جب ہی تو وجیہ کے یوں ہنسنے پر وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا تھا۔

○ ○ ○

''کیا ہے اسعان! اتنے سنجیدہ رہتے ہیں آپ، کبھی تو مجھے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ یہ نہ ہو بات ناگوار گزرے تو آپ جھانپڑ دے ماریں یا پھر سر ہی پھوڑ دیں۔ کرسٹل کے اس گلدان سے جو ہر وقت آپ کے سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوتا ہے۔'' اسعان نے سامنے رکھی فائلوں سے سر اٹھا کر حیران سی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ فوراً بات بدل گئی۔

''چلیں سنجیدہ ہونا تو کوئی بات نہیں۔ مگر بندے کو سننے کو ہی ترس جائیں۔'' وہ اکثر ہی ایسی شکایتیں کرتی نظر آتی تھی۔ مگر آج انداز میں خفگی بھی تھی۔

''شادی شدہ جوڑوں کے پاس سینکڑوں باتیں ہوتی ہیں۔ اپنی کہتے ہیں' دوسروں کی سنتے ہیں۔ مگر یہاں تو شادی کے چھ ماہ بعد تک میں مسلسل کہتی جا رہی ہوں۔ آپ کو سننے کی خواہش تو اب حسرت بن کر رہ گئی ہے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں جنگلی عادات کا مالک نہیں ہوں۔ تم بلا خوف وخطر مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ کم گوئی کی عادت سے جان چھڑانا میرے لیے ممکن نہیں۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں نا۔ تو میری اس خامی سے تمہیں سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ فائلیں سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

'لو جی..... بات ختم' قصہ تمام..... کس پتھر کے صنم سے ناتا جوڑا ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! سمجھوتہ تو ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ سر پھوڑتے رہیں گے۔' راضی برضا سمجھوتے وہ ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ بظاہر بہت سخت کٹھور اور لیے دیے رہنے والے اسعان کی حد درجہ نرم مزاجی اسے عجیب کوفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس روز وہ چائے کا خالی کپ اٹھانے اسٹڈی روم میں آئی تو احساس ہوا کہ موصوف جوں کے توں مگن ہیں اور چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

''افوہ! اب ایسی مصروفیت بھی کس کام کی کہ بندہ کھانے پینے کا شوق بھی نہ رکھے۔'' وہ چائے سے بھرا کپ اٹھا کر پلٹی۔

''وجیہ!'' عقب سے پکارا تو وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

''ادھر آؤ.....'' وہ اس کے قریب آئی تو اسعان نے تیزی سے چلتا ہوا قلم روک کر اس کے ہاتھ سے دوبارہ کپ لیا۔ اور ٹھنڈی ٹھار چائے ایک ہی سانس میں پی کر کپ واپس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اسعان! یہ کیا کیا ہے آپ نے؟'' وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ دوبارہ قلم ہاتھ میں لے کر مگن انداز میں فائل کھولنے لگا' مگر اس نے

ایک جھٹکے سے قلم اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ اسعان نے سر اٹھا کر دیکھا' وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہوئی جا رہی تھی۔

''آپ نے ٹھنڈی چائے کیوں پی ہے؟''

'اگر پی لی ہے تو اس میں اتنا خفا ہونے والی کون سی بات ہے؟'' وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

''خفا ہونے والی بات ہے اسعان! میں اگر گھر کے ہر فرد کے لیے دن میں کئی مرتبہ کھانا گرم کر سکتی ہوں' وقت بے وقت چائے' شربت بنا کر پیش کر سکتی ہوں تو آپ کے لیے ایک کپ چائے گرم نہیں کر سکتی تھی؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ بس مجھے عادت نہیں' دوسروں کو تکلیف دینے کی۔'' وہ بڑے آرام سے کہہ رہا تھا مگر وجیہ جھلس کر رہ گئی۔

''عادت نہیں ہے تو عادت بنا لیجیے۔ ایک کپ چائے گرم کرنے یا دوبارہ بنانے میں کوئی گھنٹوں نہیں لگ جاتے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ زندگی کے ہر معاملے میں آپ نے اپنی ذات کو سب سے آخری مقام دے رکھا ہے۔ آپ کو ''میں'' یا ''مجھے'' کی عادت ہی نہیں رہی اور یہ بات مجھے ہرگز پسند نہیں ہے۔'' وہ خفا ہو کر باہر نکل گئی تھی۔ اسعان سر جھٹک کر دوبارہ سے فائلوں میں مصروف ہو گیا۔ مگر بات یہیں پہ ختم نہیں ہوئی تھی۔ چھوٹی موٹی تلخیاں ہر روز کا معمول بن گئی تھیں۔ وجیہ اس کی شخصیت کی گتھیوں میں گویا الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک ایسے ماحول کی پروردہ تھی جہاں سب کی خوشیاں' سب کے غم سانجھے تھے۔ یہاں ہر فرد اپنی تنہائی میں بس آپ ہی گھلتا تھا۔ باقی سب پہ تو اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ ایک اسعان تھا جس کی پریشانی پر وہ پروانوں کی طرح اس کے گرد چکرانے لگتی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''کسی سے کوئی جھگڑا؟ مما یا صباحت باجی سے ناراضی؟''

''میری کوئی بات بری لگی؟''

''خفا ہیں....؟ آخر پریشانی کیا ہے؟''

سینکڑوں سوالات' بے وجہ کی فکریں۔ اسعان اس رویے کا عادی کہاں تھا؟ ایک روز جھنجلا کر چلا اٹھا۔

''کیوں خوامخواہ سر پر سوار ہو۔ تم میری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

وہ ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گئی۔ اور اگلے ہی پل دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے

عقب میں دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تھا۔ ناراضی کا واضح اظہار' اسعان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس پروجیکٹ کا پیپر ورک مکمل کرنے لگا' جس پر سعودیہ سے واپسی پر وہ بابا کے ساتھ مل کر کام شروع کرنا چاہ رہا تھا' رات گئے تک کام کرنے کے بعد وہ بیڈروم میں داخل ہوا تو وجیہہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی رخ بدل لیا۔ آنکھیں بے تحاشا رونے کی وجہ سے سرخ ہوئی تھیں۔

"آئی ایم سوری وجیہ!" بیڈ پہ لیٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہم لوگ ان رویوں کے عادی نہیں ہیں۔ جو تم ہمارے ساتھ برت رہی ہو۔ کبھی میری پریشانی تمہیں تنگ کرنے لگے تو بس اتنا کیا کرو کہ اس لمحے مجھے اکیلا چھوڑ دیا کرو۔"

"کیسے چھوڑ دیا کروں اکیلا؟" وہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

"نہیں کر سکتی میں ایسا' آپ ان رویوں کے عادی نہیں ہیں تو مجھے بھی اس ماحول کی عادت نہیں' اگر کچھ سمجھوتے میں کر رہی ہوں تو کسی مقام پر آپ بھی مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرے ماں باپ نے مجھے غموں کو بانٹ لینے کی تربیت دی ہے۔ دوسروں کے دکھوں کا مداوا کرنا سکھایا ہے۔ وہاں تو ایک فرد کی مسکراہٹ پھیکی پڑنے پر گھر بھر اداس ہو جایا کرتا تھا۔ ایک آنکھ کا آنسو ساری آنکھیں نم کر دیتا تھا۔ میرے ماں باپ نے تو مجھ سے کہا تھا تمہارے گھر کا ہر مسئلہ تمہارا اپنا مسئلہ ہوگا۔ خواہ وہ کسی بھی فرد کے ساتھ پیش آئے۔ اور آپ کہتے ہیں' آپ ان رویوں کے عادی نہیں۔" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔

"مجھ سے پوچھیے..... میں اس گھٹے ہوئے ماحول میں کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ ہر کوئی الگ تھلگ اپنی زندگی جی رہا ہے' کسی کو کسی کی محبتوں سے کوئی غرض نہیں۔ ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس مٹ چکا ہے۔ وہ پریشان ہے' اسے مت چھیڑو' وہ خفا ہے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دو' اسے یہ کھانا ناپسند ہے۔ بھوک لگے گی تو خود ہی کھا لے گا۔ یہ سب ہوتا ہے' اس گھر میں۔" وہ اب کھل کر رو رہی تھی۔

"یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ خفا ہونے والے کو منایا جا سکتا ہے۔ دکھی کو ہنسانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ پریشانی کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ناپسندیدہ چیز کا متبادل کوئی پسندیدہ چیز بھی ہو سکتی ہے' لیکن....." وہ گھٹنوں میں منہ دے کر سسکنے لگی تھی۔

"تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ میں نے تو ایک عمر گزاری ہے اسی ماحول میں۔' وہ اس کی سسکیوں کو سنتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



"وہ بہت عجیب شخص ہے ماریہ! میں کوشش کے باوجود ابھی تک اسے سمجھ نہیں پائی ہوں۔ خفگی'

ناراضی' جھنجھلاہٹ' بیزاری' خوشی' مسرت' طمانیت' کچھ بھی تو اس کے چہرے سے عیاں نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں اس کے جذبات سرد پڑ گئے ہیں یا پھر وہ انہیں چھپانے میں اتنی مہارت رکھتا ہے کہ اگلا بندہ اس کی اندرونی کیفیت تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ میرے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتتا ہے۔ لیکن یہ سب کرنے میں کوئی محبت' کوئی خلوص چاہت بھی نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے وہ میرے ساتھ بھی کسی آفس فائل جیسا سلوک کر رہا ہے۔ بلکہ صرف میرے ساتھ ہی کیوں' وہ تو اپنے ساتھ بھی ایسا سلوک روا رکھتا ہے کہ میرا خون کھولنے لگتا ہے بسا اوقات۔

چائے ٹھنڈی ہے تو گرم کرنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ کھانے میں نمک زیادہ ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔

وہ دن بھر کا تھکا ہوا واپس آئے اور مما ان ہی قدموں' کسی کام سے واپس لوٹا دیں تو اس کے منہ سے اپنے لیے ایک لفظ تک نہیں نکلے گا۔ بہت ہوا کبھی' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ چڑ جائے تو ایک دم چلا اٹھتا ہے۔ یہ سب ایک نارمل انسان کی عادات تو نہیں ہیں نا....؟" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں اپنی الجھن اپنی بہن سے کہہ رہی تھی۔

"تم بڑے بھائی سے کیوں نہیں کہتی ہو یہ سب..... ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔" ماریہ نے مشورہ دیا۔ بڑے بھائی سائیکاٹرسٹ تھے۔

"ہوں..... کوئی نہ کوئی گرہ ہے تو ضرور..... خیر تھوڑی بہت نفسیات تو میں نے بھی پڑھ رکھی ہے۔ ذرا اسے آزما لوں' خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پھر بھائی سے مشورہ لوں گی۔"

اور ان ہی دنوں جب وہ اس کی ذات کے بارے میں بہت متجسس ہو رہی تھی' اسے معلوم ہوا وہ مما اور بابا کا حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ یہ بات اسے ایک ڈائری سے معلوم ہوئی تھی' جسے کبھی لڑکپن میں اسعان نے اپنی تنہائی کا ساتھی بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس ڈائری کے بیشتر صفحات خالی تھے۔



وجیہ کمرے سے باہر نکلی تو دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ قدرے چونک سا گیا تھا۔ اپنے کام میں منہمک وہ بہت دیر سے اسے اس کمرے میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اور وہ منتظر تھا کہ ابھی وہ اس سے کوئی بات کرے گی مگر وجیہ خلاف توقع اس سے مخاطب ہوئے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔ یہ بات حیران کن اسی لیے تھی کہ خلاف معمول تھی۔ کچھ ماہ قبل وہ بہت دنوں بعد اسے اپنے اصل رنگوں میں نظر آئی تھی۔ گلابوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں تھماتے اور بے تحاشا ہنستے ہوئے اس نے اسعان کو خوشخبری سنائی تھی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اور وہ اس کے شرم

سے گلنار ہوتے چہرے کو دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا تھا۔ وہ اسے ایک انوکھی خوشی دیتے جا رہی تھی۔ اس لمحے وجیہ اسعان کو اس دنیا کی سب سے حسین عورت دکھائی دی۔

"لیکن اب کیا پوچھا کہ وہ چند دنوں سے بہت مضمحل، بہت اداس دکھائی دینے لگی تھی۔ نہ پہلے کی طرح اس کے قہقہے گھر میں گونجتے تھے۔ نہ وہ ہنستی کھلکھلاتی اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔

اسعان نے کھڑکی کا پردہ سرکا دیا۔

وہ ٹیرس کی گرل پہ جھکی ہوئی بوگن ویلیا کے کاسنی پھول نوچ نوچ کر مسل رہی تھی۔ نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔ یوں جیسے کوئی بہت گہری سوچ اسے لے ڈوبی ہو۔

وہ اپنے حلیے سے بھی قدرے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے ہمیشہ نک سک سے تیار ملتی تھی۔ سوٹ کے ہم رنگ چپلیں۔ چوڑیاں، جیولری۔

اور اب دوپٹہ بھی سوٹ سے میچ نہیں کر رہا تھا۔

"کیا چیز پریشان کر رہی ہے اسے۔" اس نے بے اختیار ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر اسے پکارا۔

"یہاں آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

کھڑکی بند کرتے ہوئے وہ حیران ہو کر ذرا سا مسکرایا۔ وہ اس کی پریشانی شیئر کرنا چاہ رہا تھا۔

'مجھے لگتا ہے، تم مجھے اپنے رنگ میں رنگ ہی لوگی'

وجیہ ستا چہرہ لیے کمرے میں آ گئی تھی۔

"بیٹھو....." بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی کرسی کا رخ موڑ کر اس کی طرف سیدھا کیا۔

"تم آج کل کچھ پریشان ہو.....؟" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے براہ راست پوچھا۔

"نہیں....." اس نے بڑے اعتماد سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہا۔ "بانٹ" لینے کا ہنر بھی پوری طرح نہیں آیا تھا اسے۔

"اگر کوئی مسئلہ ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس ایک معاملے میں آپ کی اجازت درکار ہے۔" وہ کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"کس معاملے میں.....؟"

"آپ صبوحی کو جانتے ہیں نا..... میرے چچا کی بیٹی۔"

"وہی جو والدین کی وفات کے بعد تم لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔" اسعان اسے اچھی طرح

جانتا تھا۔ مگر اس کا یہاں ذکر..... وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"اس کی شادی کو چھ برس ہو گئے ہیں۔ اور..... ابھی تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"

وہ سر جھکائے بتا رہی تھی۔

"پھر.....؟"

"پھر یہ کہ....." وہ ہلکا سا کھنکھاری، چند لمحے کی خاموشی اسعان کو وحشت میں مبتلا کر گئی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی۔ کہ اگر ہم، میرا مطلب ہے اگر آپ راضی ہوں تو ہم اپنا بچہ۔"

بات کرتے کرتے اس نے نگاہ اٹھائی تو مزید کچھ نہ بول سکی تھی۔ لب بھینچے، سرخ انگارہ ہوتی آنکھوں سے وہ وجیہ کو اس طرح گھور رہا تھا کہ اس نے خاموش ہونے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"کیا اس بچے کا وجود اس قدر ان چاہا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے قبل ہی تم اسے کسی اور کو سونپ دینے کا سوچ رہی ہو۔" اس کا لہجہ آگ برسا رہا تھا۔

'ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن مجھ..... سے ان کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اس محرومی نے انہیں کس طرح اکیلا کر دیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ نفسیاتی مریضہ ہی نہ بن جائیں۔'

"انہیں نفسیاتی مریضہ بننے سے بچانے کے لیے تم اپنے بچے کو نفسیاتی مریض بنانا پسند کرو گی؟ بولو.....؟ کیا تم چاہو گی کہ ایک اور اسعان" غصے سے چلاتے ہوئے وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ پھر جیسے بہت ضبط کرنے کے بعد وہ بولا تھا۔

"ان کی محرومی دور کرنے کا یہ ہی ایک طریقہ نہیں ہے۔ یتیم خانے بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں بچوں سے۔ اپنی محرومی کے ساتھ ساتھ ان کی محرومی کا ازالہ کر کے وہ اپنی عاقبت بھی سنوار سکتی ہیں۔ تمہیں اس کے لیے میرا بچہ قربان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بے لچک انداز میں کہہ کر اس نے کرسی کا رخ میز کی طرف کیا اور دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ گفتگو کو اس موڑ پہ چھوڑنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس لیے ہمت کر کے دوبارہ بول اٹھی تھی۔

"اس میں قربانی کی کیا بات ہے، اسعان، آخر آپ بھی تو......"

"ہاں..... میں بھی..... اسی لیے کہہ رہا ہوں میں نہیں چاہتا۔ میرا بچہ ویسی زندگی جیے، جیسی میں جیا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں کرب کا سایہ سا لہرا گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کی زندگی کو..... اچھی بھلی کامیاب....." وہ اس کی دکھتی رگ کی طرف دانستہ ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

"اسٹاپ اٹ وجیہ!" وہ ایکدم گرج اٹھا تھا۔

"مجھے ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں ایسا ہرگز' ہرگز نہیں ہو گا۔" غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وجیہ کو قدرے خوشی کا احساس ہوا تھا اسے اس حالت میں دیکھ کر۔

"دیکھو وجیہ!" وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"یہ بچہ اللہ تمہیں اور مجھے دے رہا ہے۔ اس کے حقوق و فرائض کی ادائیگی اس کی پرورش کا ذمہ وہ ہمیں دے رہا ہے۔ تم کیوں اس سے جان چھڑا لینا چاہتی ہو۔" اسے غالباً وجیہ کی سنگ دلی پہ دکھ ہو رہا تھا۔

"میں بھلا کیوں جان چھڑانے لگی استعان! اللہ ہمیں اور دے گا۔ آپ اس انداز سے مت سوچیں۔" وہ دانستہ بات بڑھا رہی تھی۔

"میں اسی انداز میں سوچوں گا وجیہ! میری ایک بات غور سے سن لو۔ اللہ کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر' اس نے صبوحی کو اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا ہے تو ہو سکتا ہے اس سے بھی ان کی آزمائش مقصود ہو۔ تم خود کو نعوذ باللہ اللہ سے زیادہ انصاف پسند سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بچہ اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری میں ہی قبول کروں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

وہ قطعی انداز میں کہتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ وجیہ نے آج کے لیے اتنا ہی کافی سمجھتے ہوئے چپ سادھ لی تھی۔



مثال برگ خزاں زندگی جیا ہوں میں
ہوا ذرا سی چلی اور بکھر گیا ہوں میں
میرے بدن میں یہ بہتا لہو سنہرا ہے
رگوں سے پور تک زردی نہا گیا ہوں میں

وجیہ کہتی ہے۔ دس روٹیوں میں کسی کو دیا تو کیا دیا؟ اگر آپ کے پاس ایک روٹی ہے تو دوسرے کی بھوک کا احساس کرتے ہوئے آپ وہ ایک روٹی بھی اسے دان کر دیں۔"

"اور میں کہتا ہوں' روٹیوں میں اور بچوں میں فرق ہوتا ہے۔ اولاد بانٹنے کی چیز نہیں ہوتی کہ اس کی گود خالی دیکھی تو اس میں ڈال دی' اس کو بلکتے دیکھا تو اس کے حوالے کر دیا۔

سخاوت اور دریا دلی کے تمغے حاصل کرنے کے لیے' اپنے اعمال میں ایک ثواب ایک نیکی لکھوانے کی خاطر ہم اپنے بچوں کو کیوں استعمال کرتے ہیں۔" کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گیا تو اٹھ کر لاؤنج میں چلا آیا۔ گلاس وال سے پرے رات کے اس پہر تاریکی ایک دبیز چادر کی طرح

لان کی گھاس پر بچھی تھی۔ وہ ننگے پیر چلتا ہوا لاؤنج سے باہر آ گیا تھا۔ دروازہ کھلنے پر فضا کی خنکی نے یکلخت ہی اپنے دونوں ہاتھ شرارت سے اس کے چہرے پر رکھ دیے تھے مگر وہ اس پل بہت بے چین تھا۔ نم آلود ٹھنڈک کو محسوس کرنے کے باوجود وہ لان میں چلا آیا تھا۔

پُر خلوص محبتوں کے بیچ احسان' مصلحت' قربانی کی روایت ہمارے معاشرے میں نئی نہیں' گئے وقتوں میں ایک قربانی مجھے جنم دینے والوں نے بھی دی تھی۔ کیوں؟

میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔

مجھے جنم دینے والوں نے اللہ کے فیصلے سے منکر ہو کر مجھے ایسے ماں باپ کے حوالے کیا' جنہیں اللہ بیٹے کی نعمت سے نوازنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ چھ بیٹیوں کے بعد بیٹے کا پیدا ہو کر مر جانا اور کیا معنی رکھتا ہو گا۔ اللہ کے اس فیصلے میں ہزار مصلحتیں ہوں گی' جنہیں اس وقت کسی نے جاننے' سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور جو آج بخوبی میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔

اس گھر کی چھ بیٹیاں تھیں۔ اور چھ کی چھ مضبوط دل و دماغ کی مالک' مضبوط اعصاب بلند حوصلگی' مردانہ جرأت' بے پناہ اعتماد' ٹھوس خیالات' سے مالا مال' اپنی راہ آپ بنانے والی۔ دو ٹوک فیصلہ کرنے والی' میں نے کبھی انہیں عام لڑکیوں کی طرح معمولی باتوں پر روتے بسورتے نہیں دیکھا تھا۔ ہر وہ کام جس کے لیے لڑکیاں باپ' بھائیوں کے سہارے ڈھونڈا کرتی ہیں' انہوں نے بخوبی خود انجام دیے۔ انہیں کسی "بھائی نما" سہارے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اور اگر مجھے کوئی ایسا سہارا بنانے کے لیے لایا بھی گیا تھا تو یہ سب لوگوں کی غلط فہمی تھی۔ اس گھر کی سب سے چھوٹی بھی اس وقت بحیثیت لیکچرار کالج جوائن کر چکی تھی جب میں نے کالج میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔

اور اگر مما' بابا کو اپنے بڑھاپے کے لیے کوئی سہارا درکار تھا تو پھر میں ہی کیوں؟ باجی صباحت کیوں نہیں جو اپنا کلینک کامیابی سے چلاتے ہوئے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو ان کے ساتھ اسی گھر میں رہ سکے۔

یا پھر محب چاچو کیوں نہیں' جو کہتے تھے۔ بڑے بھیا نے مجھے بچوں کی طرح پالا ہے۔ اپنا حق خود ادا کرنے کے بجائے انہوں نے مجھے کیوں اس کام کے لیے منتخب کیا؟

مما' بابا بیٹیوں کی شادی کے بعد چاچو' چاچی کے پاس چلے جاتے تو وہ ان کو اتنا محترم نہ جانتے جتنا آج سمجھتے ہیں..... یہ سب کچھ کسی اور طرح سے بھی ہو سکتا تھا مگر یہ نصیب....' وہ خود سے الجھتے الجھتے تھک سا گیا تھا۔ ٹانگیں چلتے چلتے سن ہونے لگیں۔ تب وہ سنگی بینچ پر آ بیٹھا تھا۔

بینچ سے ٹیک لگا کر وہ آسمان کو دیکھنے لگا۔

آدھا چاند آسمان کے عین وسط میں گڑا ہوا تھا۔

"ہونہہ' ادھورا چاند..... ادھوری روشنی ..... ادھوری زندگی ...." وہ زیر لب بڑبڑایا۔ عقب میں ہلکی سی آہٹ ہوئی اور وجیہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی بالکل چپ چاپ اور خاموش۔

"بیٹھو.....!" اس نے ذرا سا کھسک کر اپنے برابر جگہ بنائی۔

"اسعان! آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا ہے۔" وہ ہلکی سی چاندنی میں اس کا غمگین چہرہ دیکھ رہی تھی۔ "تم نہیں جانتی ہو' ان چوبیس سالوں میں کس کس چیز کے لیے ترسا ہوں۔ ایک وہ عورت تھی۔ جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ وہ محبتوں سے گندھی ہوئی عورت تھی' جسے دیکھ کر سب سے پہلا تصور ماں کا آتا تھا۔ وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی تھی۔ اس کی محبت' اس کے ہاتھ سے بنے ہوئے کھانوں میں ذائقہ بھر دیتی تھی۔ حمزہ کے کرتوں پہ کاڑھے پھولوں سے اس کی ممتا کی خوشبو آتی تھی۔ اجالا اس کی سی گئی فراک پہن کر تتلیوں کی طرح اڑا کرتی تھی۔ اور میں..... میں اس عورت کو دور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔"

اس کی آواز میں بے قراری سی در آئی تھی۔

"میں اس کے سامنے جاتا تو اس کی آنکھیں چمک سے بھر جاتی تھیں۔ میں اسے آزمانے کے لیے ادھڑی ہوئی اون کو الجھا کر رکھ دیتا۔ اس کے کمرے میں جا کر دانستہ کوئی چیز گرا دیتا۔ کبھی کبھار چن کر رکھے گئے چاولوں میں کنکر ڈال دیتا۔ مگر اس کی آنکھوں نے کبھی مجھے سختی سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہوتی تھی۔ الجھی ہوئی اون ٹوٹی ہوئی چیزیں چھوٹے' بڑے کنکر وہ سب سمیٹ کر اپنی ہتھیلیوں میں بند کر لیتی تھی۔"

"دوسری طرف وہ عورت تھی' جسے میری ماں بنا دیا گیا تھا۔ شوہر کی عدم موجودگی میں اپنی چھ بیٹیوں کی حفاظت اور تربیت کے خیال نے اس کے دل میں جو سختی بھر دی تھی میں نے اس میں سے اپنا پورا پورا حصہ وصول کیا تھا' میری چھ باجیوں نے اپنی' اپنی تربیت کے سارے اصول' سارے گر مجھ پر آزمائے تھے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں' کون سی چیز میرے لیے بہتر ہے' کون سا رستہ میرے لیے مناسب ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے والے بہت سے لوگ موجود تھے۔

میری خواہشات' میری اپنی آرزوئیں۔ میرے اپنے خواب۔ سب کے سب یہاں دفن ہیں۔ میرے دل میں۔ مجھے لگتا ہے میں صرف دوسروں کے لیے بنا ہوں اور مجھے صرف دوسروں کے لیے ہی جینا ہے۔ اور تمہیں خبر ہے وجیہ' میں نے سوچا تھا میں اپنے بچوں کو اس بیگانگی بھرے ماحول سے بہت دور رکھوں گا۔

انہیں وہ سب کچھ دوں گا۔ جو مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن تم..... تم پہلے موقع پر ہی۔"

وجیہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بچہ اس گھٹے ہوئے ماحول میں جیے۔ آدھی پونی محبتیں کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ تمہارا خیال ہے' صبوحی اس بچے کو ہم سے زیادہ محبت دے سکتی ہے؟"

"آپ کی لاتعلقی' آپ کی بیگانگی میں تو سہہ سکتی ہوں مگر یہ بچہ برداشت نہیں کر سکے گا۔" اس کے جتانے پر وہ گھڑی بھر کے لیے خاموش رہ گیا تھا۔

"آپ نے ہمیشہ اپنی سگی ماں کو آئیڈیالائز کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی محبت کو دوسروں کا حق جان کر انہیں دیتی تھیں۔ اپنا پیار بے دریغ لٹاتی تھیں۔ اور میں آپ کو بتاؤں اسعان کہ ایک بچہ محبتوں کے اس وسیع خزانے کو سمیٹ کر ہی ایک اچھا' بھرپور اور مکمل انسان بنتا ہے۔ بجھی بجھی محبتیں ذہن و دل کو جکڑ لیتی ہیں۔ پیار بھرے خلوص کا واضح اور بے ساختہ اظہار اس قدرتی بارش کی طرح ہوتا ہے جس کی پھوار میں بھیگنے والا پودا بہت سرسبز شاداب اور کھلتے ہوئے رنگوں کا ہوتا ہے۔"

"میں خود کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں وجیہ تمہارا ساتھ رہا تو انشاء اللہ تم مجھے ایک بدلا ہوا انسان پاؤ گی۔ ہاں! اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ اور تم دیکھ لینا۔ ہمارا بچہ' ہماری محبتوں اور شفقتوں میں اس طرح پروان چڑھے گا کہ اس کا ہر رنگ بہار کے اولین دنوں میں کھلنے والے پھولوں کی طرح گہرا اور شوخ ہوگا۔"

رات کے آخری پہر میں جب خالق کائنات آسمان سے زمین تک نور کی ایک لکیر کھینچ رہا تھا۔ اوس میں بھیگی گھاس پر چلتے ہوئے وہ اپنے آنگن میں کھلنے والے پھولوں کی تروتازہ سی مہک ابھی سے محسوس کر رہے تھے۔

(تمت بالخیر)